مطبوعات مؤتمر المصنفین (۱۱)

روسی الحاد

پس منظر و پیش منظر

سوشلزم کے بدنما آثار، فکری نشوونما، جنگ افغانستان، مسلم اقلیتوں
مذہب، تہذیبی، ثقافتی، معاشرتی، معاشی اور مستقبل کے خطرناک رجحانات کا تحقیقی و تفصیلی جائزہ

از قلم

مولانا الطاف الرحمٰن سنوی

مدرس مدرسہ حسینیہ، نوشہرہ، شمالی وزیرستان

بسرو اہتمام

مولانا سمیع الحق

مدیر الحق

مؤتمر المصنفین

دار العلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک، ضلع پشاور

toobaa-elibrary.blogspot.com

مطبوعات مؤتمر المصنفین (۱۱)

رُوسی اِلحاد

پس منظر و پیش منظر

سوشلزم کے بدو آغاز، فکری نشوونما، جنگِ اقتدار، مظالم، چیرہ دستیاں، مذہب و اخلاق دشمنی، خدا پرستانہ و صنعتی اور مستقبل کے ناپاک عزائم کا تحقیقی و تفصیلی جائزہ

از قلم

مولانا الطاف الرحمٰن بنوی

مدرس مدرسہ حسینیہ، نورک، شمالی وزیرستان

بسعی و اہتمام

مولانا سمیع الحق

مدیر "الحق"

مؤتمر المصنفین

دار العلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک ضلع پشاور

toobaa-elibrary.blogspot.com

toobaa-elibrary.blogspot.com

★ کتاب :- مذہبی الحاد پس منظر و پیش منظر
★ تالیف :- مولانا الطاف الرحمان ہنوی
★ ناشر :- مؤتمر المصنفین
★ سلسلہ نمبر :- ۱۱
★ صفحات :- ۱۹۵
★ مطبع :- عالمین پریس ریچا گن روڈ لاہور
★ قیمت :- ۱۲ روپے

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱	پیش لفظ	۵
۲	عرض مؤلف	۷
	باب اوّل	
۳	سوشلزم کے محرکات و عوامل	۱۳/۱۴
۴	بگڑی ہوئی عیسائیت	۱۵
۵	اہل یورپ کی علمی نارسائیاں	۱۷
۶	سائنسی ترقی اور صنعتی انقلاب	۱۸
۷	سرمایہ داری کے خلاف خاص انتقامی ردعمل	۲۰
۸	سوشلزم ایک یہودی تحریک	۲۲
	باب دوم	
۹	سوشلزم کا فکری سفر	۳۰
۱۰	سینٹ سائمن تک	۳۱
۱۱	اہل کلیسا کی تنگ نظری	۳۲
۱۲	علوم طبیعہ کی ترقی کا منفی اثر	۳۴
۱۳	نجی ملکیت اور مذہب کا طازمہ	۳۸
۱۴	مارکس کا مادی نظریۂ تاریخ	۴۱
	باب سوم	
۱۵	سوشلزم کی عملی سرگرمیاں اور جنگ اقتدار	۴۵/۴۶
۱۶	عالمی ارتباط کی مہم	۴۷

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱۷	مزدوروں کی دوسری بین الاقوامی انجمن	۴۹
۱۸	روسی محنت کشوں کی بیداری	۵۰
۱۹	زار شاہی استبداد کا سامنا	۵۳
	کشور کشائی کا جنون	"
	مذہبی عدم رواداری	۵۷
	جبلّی کا فی فون	۵۸
	روسیت کا ایرتا	۶۰
	معاشی استحصال	۶۱
	صدائے بازگشت	۶۳
۲۰	مارکسزم کی انقلابی جدوجہد	۶۴
	لینن کا کانفرنس	"
	پہلی کانگریس کا انعقاد	۶۵
	اسکارا اور دوسری کانگریس	۶۶
	گروہی کشمکش کا آغاز	۶۷
	۱۹۰۵ء کا انقلاب اور تیسری کانگریس	۶۸
	فلسفۂ نظر کا اختلاف	۶۹
	مسلح بغاوت اور چرچل کا نکتہ چینی	۷۰
	بنا و بگاڑ اور سخت گیری	۷۱
	بالشویکوں کی جداگانہ پارٹی	۷۲

toobaa-elibrary.blogspot.com

	نیا بخش نئے ولولے	۷۳	
	چوتھی ڈیوا اور بالشویکوں کی شمولیت	۷	
	جنگ عظیم اور بالشویکوں کی بین الاقوامیت	۷۴	
	معاشی بحران اور عوام کا غیظ و غضب	۷۵	
	عارضی حکومت اور بالشویکوں کی چھیڑ کا نگرس	۷۷	
	بالشویک ابتلا کے نئے دور میں	۷۹	
	نئی زندگی کا نیا کام	۸۰	
	عارضی حکومت کا خاتمہ اور مسرخ انقلاب	۸۳	
۲۱	پرولتاری آمریت کا قیام	۸۳	
	باب چہارم		
۲۲	سرشلزم کی چیرہ دستیاں	۸۶/۸۷	
۲۳	قول و فعل کا تضاد	۸۸	
۲۴	سامراجی ہتھکنڈے	۹۰	
۲۵	ایدل اورال	۹۲	
۲۶	شمالی قفقاز	۹۷	
۲۷	جزیرہ نمائے قرم (کریمیا)	۱۰۱	
۲۸	آذربائیجان	۱۰۲	
۲۹	قازقستان	۱۰۶	
۳۰	ترکستان	۱۰۷	
	خوقند کی آزاد ریاست کا خاتمہ	۱۱۰	
	نیوادخوارزم کی سرنگونی	۱۱۲	
	بخارا کا سقوط	۱۱۳	
	ترکستان کی نئی تقسیم	۱۲۳	
	باب پنجم		
۳۱	مذہب و اخلاق دشمنی	۱۲۴/۱۲۵	
۳۲	مذہب کی تحقیر	۱۲۶	
۳۳	موقعہ شناسی اور مصلحت بینی	۱۲۹	
۳۴	خدا کا انکار	۱۳۱	
۳۵	اسلام کے خلاف معاندانہ مہم	۱۳۵	
۳۶	قرآن اور پیغمبر اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی	۱۴۲	
۳۷	شعائر اسلام کی بابت دریدہ دہنی	۱۴۴	
۳۸	چادر اور چار دیواری کی جھلک	۱۴۶	
۳۹	مساجد کا انہدام	۱۵۲	
۴۰	شعائر اسلام پر پابندی	۱۵۵	
۴۱	دینی مدارس اور علماء کا حشر	۱۵۷	
۴۲	اخلاق کا انکار و تمسخر	۱۶۲	
	باب ششم		
۴۳	سرشلزم کی مسلم آبشمالی	۱۶۴/۱۶۵	
۴۴	پانچ یورپی نوآبادیاں	۱۶۶	
	کیمونسٹوں کا تسلط — تین مرحلے	۱۶۸	
	سوویٹ عہد کا سیاسی نظام	۱۷۰	
	قوم پرستوں کی تطہیر	۱۷۲	
۴۵	چیکوسلواکیہ کی گوشمالی	۱۷۶	
۴۶	ایران میں اثر و نفوذ	۱۷۸	
۴۷	روس اور افغانستان	۱۸۲	
۴۸	پاکستان سرشلزم کا ریگذر	۱۸۸	

پیش لفظ

سرشلزم اور اشتراکیت جو دراصل اخلاق و شرافت، عدل و انصاف، تہذیب و تمدن، الغرض انسانیت کے ہر جمود و شر کے خلاف "بغاوت" کا دوسرا نام ہے جس نے ظلم و استبداد، استعمار اور سامراجی عزائم کے لئے ایک دلفریب لبادہ، مساوات و حریت کی شکل میں اوڑھ رکھا ہے۔ لیکن مظلوم انسانوں اور آزاد و خودمختار ریاستوں پر آئے دن کیمونسٹوں کی یلغار اور شبخون مارکسزم کی آبادی اور انسانی مجد و شرف سلب کرنے کی ایک مسلسل تاریخ اس کے حقیقی رنگ و روپ کو سامنے لا چکی ہے اور اب حال ہی میں مغبود جو مسلم افغانستان پر اس غاصب اور ظالم نظام کے علمبرداروں کے ہاتھوں جو گذر رہی ہے اس نے تو دنیا کے ہر انصاف پسند اور حساس انسان کو جھنجوڑ کے رکھ دیا ہے۔ اسلام کے زرخیز اور مردم خیز ریاستوں اور مراکز علمیت و شوکت کو ہڑپ کرنے کے بعد یہ حضرت اپنی سرخ اور خون آشام تلوار کے ساتھ افغانستان کی مسلم تاریخ کو مٹانے میں مصروف ہے۔ اور اس کے بعد مسلمانوں کے خون سے خون آلود یہ تلوار تحتی پامیر کی شمرگ تک پہنچ گئی ہے۔ اور برصغیر کے مسلم فاتحین کی گذرگاہ میں خیبر اور بولان خدانہ کرے عہد حاضر کے چنگیزی اور تاتاری دشمنان انسانیت روسیوں کے قدموں سے پامال ہونے والی ہیں ولا فعلہا اللہ۔ ایسے وقت میں جب کہ علم و عمل اور فکر و نظر ہر ممکن صورت میں جہاد اولین فریضہ ہے ہمیں بے حد خوشی ہے کہ دارالعلوم حقانیہ کے ایک ہونہار ذہین و فطین فرزند حضرت مولانا الطاف الرحمٰن صاحب بنوی نے روسی الحاد و استبداد کے محرکات و عزائم اس کی عملی سرگرمیوں اور ہوس اقتدار و استبداد کے ظالمانہ ہتھکنڈوں اور چیرہ دستیوں پھر اس کے مذہب بالخصوص اسلام اور اخلاق سے ظالمانہ اور معاندانہ طرز عمل پر اپنے اس مجموعہ میں سیر حاصل مواد اکٹھا کیا جس سے تمام مسلمانوں کو عموماً اور پاکستان و افغانستان کے شمال مغربی سرحدی علاقوں کے علماء، طلباء اور عوام کو روسی کفر و الحاد سے برسرپیکار مجاہدین کو خصوصاً بے حد فائدہ ہوگا۔ جو کیمونزم کے اس بھیانک سیاہ تصویر سے کماحقہٗ آگاہ نہیں ہو سکے۔ اب ان معلومات کی روشنی میں وہ اور بھی شرح صدر کے ساتھ اور غیرت ایمانی

toobaa-elibrary.blogspot.com

سے سرشار ہو کر کلمۃ اللہ کے اعلاء اور اس کے سرخ کفر کے تعاقب و استیصال میں حصے لیں گے۔ اس ضمن میں ضرورت ہے کہ اس کتاب کے ترجمے اور اس قسم کے دیگر مواد کو پشتو اور فارسی زبانوں میں شائع اور پھیلایا جائے۔

مؤتمر المصنفین کے لئے مسرت کا مقام ہے۔ کہ وہ اس اہم موضوع پر بروقت کتابچہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے جو ایک عرصہ تک یہاں کے چشمہ علم سے فیض یاب ہو چکے ہیں اور جو ایک علمی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ اور جو اپنے طالب علمی کے دور میں بھی اپنے علمی اور ادبی ذوق و شغف اور سلامت فکر سے اساتذہ کی محبت پا چکے ہیں۔ اور آج جب کہ بحمد اللہ عزوجل اس جہاد کے عملی محاذ پر، ان کی عقابی برادری کے عقابی فضلاء صف اول میں قائدانہ کردار اور صلاحیتوں کے ساتھ برسرپیکار ہیں اور سرخ روسی استعمار کے تعاقب و استیصال اور عملی جہاد میں دارالعلوم حقانیہ کے خیور فضلاء کا وہی کردار ہے جو دارالعلوم حقانیہ کے مادر علمی دارالعلوم دیوبند کے عظیم فرزندوں کا مغربی اور پوری استعمار و استبداد کے مقابلہ میں رہا۔ ایسے موقع پر آج ایک عقابی فرزند نے نظری علمی اور فکری محاذ پر بھی ایک اہم ضرورت پوری فرمادی۔ فجزاہ اللہ عنا وعن جمیع المسلمین۔

امید ہے کہ یہ علمی اور تبلیغی کوشش آگے چل کر ان کے مزید علمی و دینی خدمات جلیلہ اور ترقیات کا آغاز ثابت ہوگا۔ خداوند تعالیٰ اس کوشش کو بہترین نتائج کا ذریعہ بنادے۔ اور روسی استعمار و استبداد کے خلاف یہ حقیر سی جدوجہد فاضل مؤلف کتاب، مؤتمر المصنفین، دارالعلوم حقانیہ اور خود اس گنہ گار کے لئے بھی موجب رضائے خداوندی و نجات و سرخروئی ثابت ہو۔ افسوس کہ خواہش کے باوجود مجھے کتاب کی کماحقہ ایڈیٹنگ اور نظر ثانی کا وقت نہ مل سکا تاہم مجھے فاضل مؤلف کے دینی درد اور موجودہ حالات کی فوری ضرورت اور تقاضوں کے پیش نظر یہ یقین ہے کہ موجودہ شکل میں بھی کتاب دینی لحاظ سے کارآمد اور مفید ثابت ہوگی۔ اور حق تعالیٰ الفاظ و معانی کی ظاہری بندشوں اور سیاق و سباق کی رعنائیوں کے لحاظ سے نہیں مقاصد و عزائم اور جذبات و نیات کے معیار سے اسے مقبول و بارآور فرمادیں گے۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

والسلام

سمیع الحق

صدر مؤتمر المصنفین

۱۲ رجب ۱۴۰۲ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض مؤلف

۱۳۸۰ھ مطابق ۱۹۶۵ء میں دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کا طالب علم راقم اس سال دارالعلوم میں شاہ انور الحق کے حسن آغاز کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس کے بعد دو سال تک معراج العلوم بنوں میں رہ کر ۱۳۸۸ھ مطابق ۱۹۶۸ء میں دوبارہ دارالعلوم حقانیہ میں داخلہ لیا۔ الحق اپنے معیاری مضامین اور پوری آب و تاب کے ساتھ شائع ہونا شروع ہو چکا تھا۔ میں اس رسالے میں اشتراکیت سے متعلق مولانا شمس الحق افغانی مدظلہ کی تحریرات کو بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ اشتراکیت کے کمزور پہلوؤں پر ان کے تاثراتی مضامین بلاشبہ بڑے بصیرت افروز ہوا کرتے تھے۔ اور میں ان سے خاصا متاثر ہو جایا کرتا تھا۔ لیکن اشتراکیت کی اصل اہمیت اور اپنے دائرہ اثر میں اس کی دینی اور سیاسی تباہ کاریوں سے تاہنوز بے خبر رہا۔ نیز اس امر پر بار بار حیرت ہوتی تھی کہ کم از کم پاکستان کی حد تک اس غیر متعلق موضوع پر اتنی تحقیقات پر معنی وارد۔ مگر بہت جلد ہی مولانا کی ان کاوشوں کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ جب پاکستان میں اشتراکیت کی بنیاد پر ایک بڑی سیاسی پارٹی کی تشکیل ہوئی۔ اور ملک کے طول و عرض میں انتہائی جاذب اور پرکشش نعروں سے اس کی طرف دعوت دی جانے لگی۔

۱۳۸۹ھ مطابق ۱۹۶۹ء کے دسمبر کے آخری ایام میں بندہ دورۂ تفسیر القرآن کی غرض سے راولپنڈی گیا مولانا غلام اللہ خان مدظلہ نے ابھی تک دورۂ تفسیر شروع نہیں کیا تھا۔ اس لئے تاشروع دورہ ہفتہ عشرہ تک کئی دوسری کتابوں کا مطالعہ کیا۔ انہی دنوں روس کے سرخ اندھیروں سے متعلق کچھ کتابیں مطالعہ کے لئے ہاتھ آگئیں جنہیں بار بار پڑھا اور سوشلزم اور روسی سامراج کے خطرناک کردار اور مرض قدری کا اس قدر احساس ہوا جس نے دل و دماغ کو بری طرح متاثر کیا۔ اس کے بعد سوشلزم کے موضوع پر لکھی ہوئی کچھ اور کتابیں مطالعہ کیں اور اب اشتراکیت کے نرغے میں محصور برادر اسلامی ملک افغانستان کا داخلی حالات لینا شروع کیا تو بہت جلد ہی یہ حقیقت مجھ پر علم الیقین کی حد تک منکشف ہو گئی کہ افغانستان

toobaa-elibrary.blogspot.com

میں کمیونسٹ حکومت قائم ہونے والی ہے اور مشرقی بازو کٹ جانے کے بعد بچا کھچا پاکستان بھی نئے خطرات سے دوچار ہونے والا ہے۔ ایک سچے پاکستانی کی حیثیت سے سلامتی وطن کی مساعی میں اپنا حصہ ادا کرنے کے لئے فکر و عمل کے مختلف نقشے بنانے لگا۔ اور ایک عرصے تک ؎

منصوبے باندھتا ہوں، توڑ تا ہوں، سوچتا ہوں
کبھی ایسا نہ ہو جائے کبھی ایسا نہ ہو جائے

کا مصداق بنا رہا۔ بالآخر "ماضی کا اجمالی خاکہ اور حال کی روشنی میں مستقبل کی بھیانک تصویر" کے عنوان سے برصغیر میں فرانسیسی سیاح واسکوڈے گاما کی آمد کے بعد سے پیش آنے والے وہ تمام اہم حالات و واقعات قلم بند کرنا شروع کئے۔ جن کے نتائج سے مستقبل کے امکانات پر روشنی پڑ سکتی تھی۔ اسی دوران معراج العلوم بلوں میں تدریس کی خدمت تفویض ہوئی۔ چنانچہ تدریسی اشتغال کے بیچ بیچ میں متذکرہ تحریری کام کو بھی آہستہ آہستہ آگے بڑھاتا رہا۔

بہادر شاہ ظفر کی رنگون روانگی اور پورے ہندوستان پر غلامی کے منحوس تاریک سائے چھا جانے تک کے سلسلہ واقعات کو رقم کیا تھا کہ ایک جھٹکا بیماری کا شکار ہوا جس کے آثار ابھی تک محسوس کئے جاتا ہوں۔ یہ کام دھرا کا دھرا رہ گیا۔ تاہم کام کا احساس ختم نہیں ہوا تھا۔

انہی دنوں افغانستان میں سردار محمد داؤد کا انقلاب لایا۔ اس نئے نظام اور ولولے کے ساتھ پاکستان دشمنی کا آغاز کیا۔ اس سے سوئے ہوئے جذبات میں پھر تحریک پیدا ہوئی۔ چنانچہ کئی ہم خیال رفقاء کے ساتھ "تنظیم فدائین اسلام" کے نام سے عملی کام کا آغاز کیا۔ کئی مہینے کی سرتوڑ کوشش کے بعد بمشکل چند ہی اور ساتھیوں کو صوبائی تعصبات کے خلاف اسلامی اخوت کی دعوت و تبلیغ کرنے کے لئے اس کام کی اہمیت کا احساس دلایا۔ اور پھر تنظیم کی طرف سے اشتہار (بعنوان ۱۰) استقلال مشرقی پاکستان کے بعد "۱۰" روسی ڈوگا" اور تنظیم کے باقاعدہ لیٹر ہیڈ طبع کئے۔ لیکن اس پورے سلسلہ کو صیغہ راز میں رکھا تاکہ مجلس عاملہ کی تشکیل اور تنظیم کا مرکزی ڈھانچہ قائم ہونے تک ہر قسم کی مخالفت سے محفوظ رہا جا سکے۔ ابھی تقسیم کار کا یہ مرحلہ طے ہونا باقی تھا کہ پورے ملک میں قادیانیوں کے خلاف ایک وسیع تحریک چلی اور ہر پاکستانی مسلمان کی توجہ اس اہم مسئلے کی طرف منعطف ہو گئی۔ ہم نے بھی تنظیمی کام کو سردست ملتوی کر دیا۔ تاکہ قادیانیوں کے خلاف مقامی جدوجہد میں کسی خلل اندازی کا باعث نہ بنے۔ یہ تحریک تو ایک بہتر اور حوصلہ افزا انجام پر پہنچ کر ختم ہو گئی۔

لیکن اس کے بطن سے سیاسی طور پر فضا ناسازگار ہو گئی۔ کیونکہ جماعتوں کی شدید مخالفت اور حکومت وقت کی طرف سے انتہائی سخت گیری کا قوی اندیشہ پیدا ہوا۔

ادھر اس غیر یقینی حالات میں مخلصین کی تعداد اتنی دکھائی نہیں دے رہی تھی کہ چند ایک کے تعطل کے باوجود عملی محاذ پر مثبت کام کا سلسلہ جاری رہنے کی توقع کی جا سکتی۔ ان مختلف مجبوریوں کے پیش نظر تنظیم منصہ شہود پر نہ آ سکی۔ اس منصوبے سے مستقل جو تحریری کام انجام پایا تھا۔ جمعیۃ علماء اسلام کے ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور میں "غلامی ہند کی دلخراش کہانی" کے عنوان سے آٹھ قسطوں میں شائع ہوا۔

اس کے بعد انتظار تدریس ہی کے سلسلے میں مدرسہ حسینیہ نورک شمالی وزیرستان آیا۔ یہاں معلوم ہوا کہ مولانا جلال الدین (حال بہنائے مغرب اسلامی افغانستان) افغانستان سے ہجرت کر کے میرانشاہ شمالی وزیرستان کے مرکزی مقام میں سکونت پذیر ہیں۔ مولانا موصوف دارالعلوم حقانیہ میں میرے ہم درس رہ چکے تھے۔ اپنی قابلیت اور حسن اخلاق کی بدولت میری عقیدت کے بھی مرکز رہے تھے۔ میں فوراً ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان سے افغانستان کے تازہ حالات معلوم کر کے پہلے سے بھی زیادہ کوفت ہوئی۔ اس کے بعد تو بے شمار ایسے مہاجرین سے ملنے کا اتفاق ہوتا رہتا جن کی دیانت اور ثقاہت پر کسی قسم کا شبہ کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ ان کے چشم دید واقعات سن کر وہ خدشہ بھی جاتا رہا جو اس سے پہلے مختلف مرقعوں پر میرے دل میں آیا کرتا تھا کہ مبادا سوشلزم کی بابت وہ تمام تر تفصیلات جو میں نے کتابوں میں پڑھیں کہیں امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں کے پروپیگنڈے کا اثر اور اس نئے نظام کو بدنام کرنے کی شاطرانہ چال ہو۔ لیکن اب میرے ذہن سے اس قسم کا ہر شک و شبہ زائل ہو گیا۔

کچھ ہی دن گزرے تھے کہ مرغ انقلاب نے سردار داؤد کا تختہ بھی الٹ دیا۔ اور اب افغانستان پوری طرح سے روسی استعمار کے قبضے میں چلا گیا۔ ہمارا خیال تھا۔ کہ دنیا کے انصاف پسند ممالک اس انتہائی ظالمانہ اور سفاکانہ انقلاب کی سختی سے مخالفت کریں گے۔ اور نہ ہو تو اسلامی دنیا تو حرکت میں آ کے بغیر نہ رہ سکے گی۔ لیکن ہر طرف ہُو کا عالم طاری تھا اور کسی طرف سے بھی تائید و تسلیم کے علاوہ کوئی موثر آواز سنائی نہیں دی۔ آخر کئی رفقاء کے ساتھ شمالی وزیرستان کے مشہور عالم دین مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ فاضل دارالعلوم حقانیہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور بعد ادب عرض کی کہ وزیرستان کے لوگوں نے ہر مشکل میں افغانی مسلمانوں کی امداد و اعانت کی ہے۔ شاید اس دھرتی کے مکینوں پر اس سے

toobaa-elibrary.blogspot.com

پہلے ایسی کوئی اور مصیبت آئی ہو۔ جو آج ان کے سروں پر بجلی بن کر گری ہے۔ اس نازک اور سخت وقت میں ان کی حمایت اور امداد کے ایجنٹ نام نہاد حکمرانوں کی مخالفت میں کم از کم جلسہ جلوس تو منعقد کیا جائے تاکہ اسلام کی مدافعت میں لڑنے والے ان نہتے مجاہدین کو اس قدر تو معلوم ہو کہ دنیا میں کوئی ان کے جہاد کو حق بجانب سمجھتا ہے۔ اور عالمی پیمانے پر ان کے حق میں آواز نہ اٹھنے کی وجہ ان کی قربانیوں کی ناقدری نہیں بلکہ صحیح حالات سے ناواقفیت ہے۔ پھر جن جن کو حقیقت حال کا انکشاف ہوتا جائے گا۔ بشرطیکہ انصاف بلا تامل ان کی تائید اور نصرت پر آمادہ ہوگا۔ مناسب ہوگا اگر اس موقعہ پر مولانا کی اس دردمندی کا ذکر نہ کروں جو اس وقت اس نے ظاہر فرمائی۔ وہ ہمارے آنے سے پہلے ہی کافی متفکر اور مغموم تھے اور ہمارے ہی انداز سے سوچ رہے تھے۔ نیز اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کوئی مناسب اور مفید قدم اٹھانے والے تھے۔ انہوں نے چند ہی روز میں وزیرستان کے علماء کی ایک مشاورتی میٹنگ بلانے کا ارادہ ظاہر فرمایا اور پھر واقعتہً یہ میٹنگ بلائی۔ بعدہٗ عام مسلمانوں کو افغانستان کی صحیح صورت حال سے آگاہ کرنے کے لئے کئی عوامی جلسے منعقد کئے۔ اسی ہی سلسلے میں میں ایک دوسرے وزیرستانی پیشوا مولانا محمد گل منیر صاحب مدظلہ سے ملاقات کے لئے گیا۔ موصوف انگریزی اقتدار کے خلاف وزیرستانی مسلمانوں کی عرصہ دراز تک رہنمائی کر چکے ہیں۔ دین دوست اور درویش منش بزرگ ہیں۔ اکثر اوقات خلوت اور گوشہ نشینی میں گزارتے ہیں۔ عصر کے بعد سے مغرب تک افغانستان ہی کے موضوع پر تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔ اگرچہ سیاست سے تعلق ہیں لیکن پاکستان اور افغانستان کے سیاسی حالات اور مسائل سے بے خبر اور لاپرواہ بھی نہیں۔ دونوں مملکتوں کے مسلمانوں کے کسی بھی مشکل پر سخت مضطرب ہو جاتے ہیں۔ افغانستان کے نئے حالات سے کافی پریشان تھے اور وہاں کے مسلمانوں کی حتی الوسع امداد کی فکر کر رہے تھے۔

اس محفل میں احقر نے سوشلزم کے متعلق چند باتیں بیان کیں۔ جس پر انہوں نے بتاکید فرمایا کہ ان باتوں کو عام لوگوں تک پہنچانے کا انتظام ہونا چاہئے۔ میں نے اس عنوان پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا جس پر انہوں نے نہ صرف تصویب بلکہ تحسین فرمائی۔ کتاب کی ضرورت کے احساس کے باوجود تدریسی مصروفیات اور وسائل نہ ہونے کی وجہ سے آغاز کی جرأت نہ کر سکا۔ تا آنکہ شعبان ۱۳۹۸ھ میں مدرسہ کی سالانہ چھٹیاں ہو گئیں اور میں حسب معمول رمضان گزارنے کے لئے لاہور گیا۔ یہاں کے

دوران قیام میں کئی ہم مجلسوں سے افغانستان کے تازہ بہ حالات کا ذکر مذاکرہ ہوتا رہتا تھا۔ اسی ضمن میں اپنے ان کے وزیرستانی قبائل مسلمانوں کی سوشلزم سے ناواقفیت کے پیش نظر کسی ایسی مختصر سی کتاب کی تصنیف کی ضرورت کا بھی اظہار کیا۔ جو سوشلزم کی ابتدائی تاریخ اور دین دشمنی کے بیان پر مشتمل ہو۔ ایک مخلص دوست میاں محمد عثمان صاحب آباد شاہ پوری کی کتاب "روس میں مسلمان قومیں" کا مطالعہ کرائی اور فرمایا کہ اس کا خلاصہ نکال کر آپ مقامی ضرورت پوری کر سکیں گے۔

رمضان المبارک کے بعد واپس مدرسہ آیا اور کام شروع کیا۔ لیکن جلد ہی معلوم ہوا کہ مجوزہ کتاب کی تصنیف کے لئے جو مواد درکار ہے وہ کسی ایک کتاب سے میسر نہیں ہو رہا۔ چنانچہ کام پھر تعویق والتوا کا شکار ہوا۔ اس دوران وزیرستان کے کئی ذمہ دار افراد سے ملاقاتوں کا اتفاق پڑا جس سے یہ بات اور بھی زیادہ شدت سے محسوس ہوئی۔ کہ یہ لوگ افغانی انقلاب کے پس منظر اور پیش منظر کے بارے میں کچھ نہیں جانتے جیسے بے خبر نادار اور مقامی زعماء تک سے سنا کہ افغانستان کے نئے حکمران معاشی ناہمواریوں کو ختم کرنے اور کچھ معاشرتی اصلاحات کی فکر کر رہے ہیں۔ بس یہی کچھ ان لاکھوں افراد کی ہجرت کا واحد سبب ہے جو اپنا گھر بار چھوڑ کر غربت و مسافرت کی زندگی پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ کہنے والے دین و ایمان کو پہنچنے والوں میں سے نہیں۔ مگر کابل پروپیگنڈے کا شکار وہ خوش فہم افراد ہیں جنہوں نے اصل خطرے کا ادراک ابھی تک نہیں کر لیا ہے۔ ادھر یہ محرکات و مہیجات اور دوسری طرف مولانا گل منیر صاحب کے بعد دیگرے پیغامات نے مجبور کر لیا۔ چنانچہ ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۹۷۹ء رمضان المبارک کے مہینے میں لاہور میں دوبارہ کام شروع کیا۔ اور اسی کا ہو رہا۔ کتاب مرتب کرتے وقت آباد شاہ پوری کی "روس میں مسلمان قومیں"، خلیل احمد حامدی کی "سرخ آندھیوں میں"، محمد مظہر الدین صدیقی کی "اشتراکیت اور نظام اسلام" صادق محمد حسن کی "اسلام اور اشتراکیت"، ہیوگ سٹیفن ڈاسن کی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ از جلیس طاہری اور ہمایوں ادیب کی کتاب "نیا سامراج" سامنے تھیں۔ چنانچہ انہی کتابوں کی مدد سے اس مجموعے کا کثر حصہ رمضان ہی میں اور بقیہ حصہ صفر المظفر ۱۴۰۰ھ یعنی دسمبر ۱۹۷۹ء کے آخر تک مکمل ہوا۔ مجھے اعتراف ہے کہ یہ کتاب سوشلزم کے جملہ مفاسد پر حاوی نہیں۔ اس میں زیادہ تر توجہ تو دین و مذہب اور بالخصوص اسلام کے خلاف اس کے جارحانہ رویئے اور مختلف نمود خرد ار سیاسی مظالم کے بیان پر دی گئی۔ لیکن اس کے بعد آغاز اور نشوونما کے مختلف مراحل کی ضروری تفصیلات کے بغیر نہ صرف بات ادھوری بلکہ ناقابل فہم بھی ہوتی اس

toobaa-elibrary.blogspot.com

سلسلے تکمیل اور تفہیم سخن کی خاطر ان کا بھی اضافہ کیا گیا۔ سوشلزم کی معاشی اور معاشرتی خامیوں اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بے شمار دینی مفاسد کا ذکر بہت تطویل کا موجب بن رہا تھا اس لئے اس کو مطلقاً ترک کیا گیا۔ میرے لئے یہ امر مزید افتخار و مباہات کا موجب ہے کہ میری یہ حقیر کاوش میرے اساتذہ بالخصوص میرے مشفق استاذ حضرت مولانا سمیع الحق صاحب استاذ حدیث و تفسیر دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک نے پسند فرمائی اور مسئلہ کی اہمیت و نزاکت کا احساس اور میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے میری تصنیفی زندگی کے اس نقش اول کو میرے مادر علمی دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے وقیع اور موقر تصنیفی ادارہ مؤتمر المصنفین سے شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ جس میں میری عزت افزائی کے علاوہ کتاب کی استنادی حیثیت میں بے حد اضافہ ہوا۔ اور عام مسلمانوں میں اس کی مقبولیت اور قدر و قیمت اور افادیت کے امکانات روشن سے روشن تر ہو گئے۔ وما ذلک علی اللہ العزیز

اللہ تعالیٰ اس حقیر سی کوشش کو اپنی رضا اور غلبۂ اسلام کا ذریعہ بنا دے۔

الطاف الرحمٰن یوسفی

مدرسہ حسینیہ توروکی۔ شمالی وزیرستان

مورخہ ۱۰ صفر المظفر ۱۴۰۲ھ

باب اوّل

سوشلزم کے محرکات و عوامل

toobaa-elibrary.blogspot.com

جب سے دنیا آباد ہوئی ہے۔ انسان اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے اپنی فکری اور عملی قوتوں کو بروئے کار لاتا رہا ہے۔ خدا تعالیٰ کے نائب و جانشین ہونے کی حیثیت سے قدرت نے اس کو جزوی اختیار و تصرف کا حق اور کافی مواقع مہیا پہنچائے۔ جو دراصل اس کے مقصدِ تخلیق ..... ابتلاء و آزمائش اور سعادت و شقاوت کی تقسیم ..... کے لئے لابدی اور ناگزیر تھے۔ کسبِ معاش کی جدوجہد میں ایک طویل عرصے تک یہی اصول کارفرما رہا کہ کامیاب تدبیر اور بار آور محنت و مشقت کا حاصل فرد کی اپنی ملکیت ہے۔ جس کو اپنے حسبِ منشاء صرف کرنے میں وہ ہر طرح سے آزاد و خود مختار رہے۔ ہاں ان انتظامی اور اخلاقی ضابطوں کی پابندی بہرحال عائد رہی، جو افراد کو خود غرضانہ نفسانفسی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے معاشرتی انتشار و انہدام کی سے بچانے میں ممد و معاون ہوں۔ مگر ایک وقت آیا، کہ شخصی ملکیت کے اس فطری اصول کو ناکارہ سمجھا جانے لگا۔ اور مندرجہ ذیل مسیاب و رجوہ کی بنا پر اس کی جگہ ایک انتہائی نامعقول اور غیر فطری انداز فکر و عمل کو اپنانے کی کوشش کی گئی ؛

بگڑی ہوئی عیسائیت

بلاشبہ ہر نبی اپنے زمانے کا نور ہدایت اور اس کی مکمل پیروی ترقی دارین کی ضمانت ہوتی ہے۔ وہ جس نظامِ عمل کی طرف بلاتا ہے۔ ماحول اور حالات کی مناسبت سے وہی کامیابیوں سے ہمکنار ہونے کا واحد ذریعہ ہوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کا رسول زندگی کے بارے میں ناقص اور ادھورے تعلیمات دے کر انسانیت کو حیران و پریشان نہیں کرتا بلکہ تردد کے ہر چوراہے پر راہ راست کی طرف رہنمائی کا وہ مقدس فرض سرانجام دیتا ہے۔ جو ہر لحاظ سے تسلی بخش اور چین قرار کا موجب ہو۔

سیدنا مسیح حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اس کلیئے سے مستثنیٰ نہیں۔ بلاریب ان کی لائی ہوئی شریعت اپنے زمانے کا مکمل دستور العمل اور ضابطہ حیات تھی۔ مگر تقدیر الٰہی کے اس اٹل فیصلے کو لامحالہ کسی نہ کسی صورت میں ظاہر ہونا ہی تھا کہ تمام گزشتہ ادیان سماویہ کی طرح دین عیسائیت بھی ایک موقت اور غیر دائمی دین ہے جس کی تعلیمات نے ایک زمانے تک صحیح رہنمائی کرنے کے بعد غیر مؤثر اور ختم ہونا ہے۔ چنانچہ عالم اسباب میں اس کی صورت یہ ہوئی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوران حیات اکثر کی تعلیمات کو سنا تو گیا لیکن ان کی بقاء و حفاظت کا کوئی خاطر خواہ انتظام و اہتمام نہیں کیا گیا جس کا منطقی طور پر جو کچھ نتیجہ نکل سکتا تھا وہ نکل کر رہا۔ اور وہ یہ کہ دین عیسائیت کی اصل تعلیمات رفتہ رفتہ ناپید و نابود ہو گئیں۔ اور دنیا ایک دفعہ پھر جہالت و ضلالت کی تاریکیوں میں ڈوب گئی۔

حقیقت واقعہ تو یہی تھی لیکن اس کے علی الرغم رفع و صعود حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل بھی بعد بھی

toobaa-elibrary.blogspot.com

نام نہاد عقیدت مندوں نے انجیل کے نام سے اس کی طرف منسوب ارشادات و فرمودات کے جامع ناقص اور غیر مستند مجموعے تیار کرنے شروع کیے جن کی تعداد دو سیوں پیسیوں سے گزر کر سینکڑوں تک پہنچ گئی ان مجموعوں کا بہت کم حصہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصل تعلیمات اور زیادہ تر حصہ ان کے اپنے مرتبین کے غلو و تخمین اور بلیغ آرائیوں کا نتیجہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ باوجود عدیدہ و ضخیم ہونے کے، حیاتِ انسانی کے ادراکی شعبوں میں یا تو سرے سے کچھ کہنے بتلانے سے قاصر اور خاموش رہے اور یا اگر ایک آدھ نے کہیں کچھ لب کشائی کی بھی تو عدد درجہ ناقص اور ناکافی۔ لیکن عیسائی دنیا انہی انسانی دفاتر کو الہامی صحیفے سمجھتی رہی اور ان کو وہی وقعت و اہمیت دیتی رہی جو فی الواقع پیغمبرانہ تعلیمات کو دینی چاہئے تھی۔[1]

---

[1] مسیحیت کی تعریف اس کے دورِ آغاز یعنی پہلی صدی مسیحی کے نصف ہی سے شروع ہوئی تھی وہ ایک مسلمات اور سادہ توحیدی مذہب تھا ایک ایسے شکر کا مذہب میں تبدیل ہو گئی جس کو یونانی اور بود حلکار و خیالات کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔ دیکھئے کیفیت یہ ہے کہ یہ سب کچھ اس کے سب سے بڑے داعی اور پیرو سینٹ پال (۱۰ - ۶۵ء) کے ہاتھوں ہوا۔ یہ پہلے یہودی اور اصل ایک رومی سے دو مختلف ایک شکل سے دوسری شکل اور ایک نظام سے دوسرے نظام کی طرف ایک ایسی جست لگا چکا تھا کہ تردد تھی نہیں ہی پہلی شکل سے مختلف نام اور بعض رسوم کے مشترک باقی رہ گیا۔ ایک مسیحی فاضل DE BUNSEN اس تغیر و انقلاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

جس طریقہ اور نظام کا ذکر ہمیں انجیل میں ملتا ہے اس کی دعوت حضرت مسیح نے اپنے قول و عمل سے کبھی نہیں دی تھی اس وقت عیسائیوں اور یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان جو نزاع قائم ہے اس کی ذمہ داری حضرت مسیح علیہ السلام کے سر نہیں بلکہ سب سے پہلے یہودی عیسائی بنے دین پال کا سر ہے نیز مقدس مقدس کا تشلیث و تجسیم کے طریقہ پر تشریح اور دیوتاؤں کو شہادی اور چیش لوؤں سے بھوجنے کا نتیجہ ہے۔ پال نے اسٹیفن (STEPHEN) کی تقلید میں جو مذہب ایسائی (ESSENIO) کا پیرو تھا حضرت مسیح کے ساتھ بہت سی بودہ رسمیں وابستہ کر دیں۔ آج انجیل میں جو متضاد کہانیاں اور واقعات ملتے ہیں اور حضرت مسیح علیہ السلام کو ان کے مرنے سے بہت فوق شکل میں پیش کرتے ہیں وہ سب پال کے وضع کئے ہوئے ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے نہیں بلکہ پال اور ان کے بعد آنے والے پادریوں اور ماہروں نے اس سارے عقیدے و نظام کو مرتب کیا ہے جس کو آج کل مسیحی دنیا نے اختیار کر رکھا ہے اور اپنے عقیدے کی اساس قرار دیا ہے۔

(ماخوذ از تاریخ دعوت و عزیمت ج ۱ - مصنفہ ابوالحسن علی ندوی)

ایک طرف تو اناجیل کے استناد کا یہ حال رہا، اور دوسری طرف ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں عرب کے افق سے نبی آخر الزمان محمد ہاشمی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نئی نبوت طلوع ہوئی جس نے عیسائیت سمیت تمام ادیانِ سابقہ کے منسوخ ہونے کا اعلان کیا۔ اور نئی دنیا کے نئے حالات کا سامنا کرنے کے لئے اسلام کے نام سے نئی تعلیمات پیش کیں جو مقدس عیسائیت کے نام سے رائج خود ساختہ اور من گھڑت تعلیمات کی طرح اپنی کوتاہ نظری اور تنگ دامنی کی شاکی نہیں۔ بلکہ اعلیٰ جامعیت اور عالمگیریت کی حامل تھیں۔

طلوع اسلام کے بعد عیسائیت کی اصل تعلیمات بھی اگر موجود ہوتیں تو بہرحال ناکافی اور ناقابلِ عمل ہوتیں کیونکہ ان کے لئے قدرت کی حکمتِ بالغہ کا مقررہ و مجوزہ وقت بیت چکا تھا۔ اور اب ان کو زندگی کے معاملات میں دخیل سمجھنے اور اس کے تحت ان کو نافذ کرنے کی کوشش سراسر ناحق اور باطل تھی۔ جو جاہلیکہ افتراپردازوں کی لگاتار کد و کاوش اور ذہنی اختراعات مکتفی ہو جائیں۔ چنانچہ عیسائیت ٹھیک ٹھیک "کہ بالا رود بھی نیم پختہ" کی مصداق بنی جو اس وقت کی مضطربہ بدایت و راہ نمائی فراہم نہ کر سکی۔ نتیجۃً زندگی کے تمام معاملات میں عموماً اور اس کے اہم ترین شعبۂ معیشت میں خصوصاً وہ بگاڑ رونما ہوا جس کی وجہ سے اس وقت کا انسان رائج الوقت معاشی طرز و طریق سے مطمئن نہ ہو سکا۔ اور کسی دوسرے متبادل راستے کی تلاش کی ضرورت محسوس کی۔

اہلِ یورپ کی عملی نامرادیاں

ہر چند کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی بیشتر تعلیمات مٹ گئی تھیں اور ان کے نافذ العمل رہنے کا وقت بیت چکا تھا۔ تاہم ان کے اندر اس قدر دم خم پھر بھی تھا۔ کہ اگر یورپی دنیا انہی کو حقیقی معنوں میں عمل کا معیار ٹھہراتی تو اگرچہ وہ قابلِ رشک اور عہدِ معاشرت تو وجود میں نہ آتی جو حقیقتاً خدائی احکام کے روح کے نفاذ سے ممکن ہے لیکن اتنا ضرور ہوتا کہ معاشی ناہمواریاں اس مہلک قطعاً نہ بڑھتیں جس سے گھبرا کر کوئی بھی انسانی آبادی ایسی اشتراکیت قبول کرتی جو انسانی فطرت کے ساتھ کسی طرح بھی ہم آہنگ نہیں۔

اہلِ یورپ کہنے کو تو عیسائی اور ان کا مجموعہ اناجیل کو ماننے والے تھے جو ان کے ہاں کتب سماوی کی حیثیت سے معروف تھا لیکن عملاً ان کے مندرجات سے بہت دور اور قطعاً آزاد و بے پروا تھے۔ یہ کتابیں اگرچہ تقسیم ثروت کے کسی جامع منصوبہ بندی اور تفصیلی پروگرام سے خالی تھیں تاہم ان میں

toobaa-elibrary.blogspot.com

کچھ اخلاقیات بالخصوص رحم و ہمدردی اور عفو و درگزر سے کام لینے پر بہت زیادہ زور دیا گیا تھا۔ ناجیل کی تعلیم میں دنیا سے فرار اور کامل بے رغبتی کی تلقین ایک مرکزی نقطے کی حیثیت سے شامل تھی۔ جس کے نتیجے میں عمل کرنے سے ناجائز تموّل کا دور دور تک احتمال بھی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ عیسائیت اگر تمام لوازم و متعلقات کے ساتھ رو عمل ہوتی تو دوسرے تمدن ہی کی بنیادیں ہل جاتیں اور یورپ کا کوئی بھی شخص بڑے سے بڑے بادشاہ و دولت کو کیا قوت لایموت سے زیادہ لینے کا روادار نہ ہوتا۔

مگر ایسا نہیں ہوا۔ نام نہاد عیسائیوں نے اسلامی تعلیمات کو ٹھکرانے اور مسترد کرنے کے بہانے کی حد تک تو عیسائیت کے وجود کو تسلیم کیا۔ لیکن معمول معاش کے سلسلے میں اپنی اہواء و خواہشات پر اس کی کوئی اخلاقی پابندی قبول نہیں کی۔ پیداواری وسائل کے مالکوں نے محنت کشوں کا استحصال کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ جاگیردار و سرمایہ دار خود تو بڑی وسعت اور فراخی سے عیش و عشرت کی زندگی گذارتے رہے لیکن زندگی کی بنیادی ضروریات تک کے سلسلے ترسنے والے کسانوں کی کوئی خبر گیری نہیں کی۔ نتیجۃً معاشرہ دو ایسے متفاوت گروہوں میں بٹ گیا جس میں سے ایک گروہ تمدن کا بڑا ستون ہونے کے باوجود دوسرے چھوٹے ستون کا دست نگر رہا۔ اٹھی گنگا کے اسی صورت حال نے اشتراکی خیالات کے لئے راستہ ہموار کیا۔

سائنسی ترقی اور صنعتی انقلاب

اس پیچھے کچھ مذہب کی رحیمانہ رحمت انسانیت کی تنظیم میں بری طرح ناکام ہو چکی تھی۔ اور یورپی معاشرہ ایک بالکل ہی غیر فطری راستے پر گامزن تھا۔ زمین اس وقت کا سب سے بڑا معاشی ذریعہ تھا جو جاگیری نظام کے تحت معدودے چند خوش نصیبوں یا خوش تدبیروں میں منقسم تھی۔ اونچا طبقہ جاگیرداروں کی اقلیت اور نچلا طبقہ وہ محروم القسمت اکثریت تھی جس کو خدا کی زمین میں سے قدر واجب بھی نہیں مل سکتا تھا۔ مالداروں کی دولت دن بدن بڑھ رہی تھی۔ نادار دن کی طرح مفلسی میں انحطاط و تنزل کا عمل جاری ضرور تھا لیکن اس عمل کی رفتار بہت سست تھی اور اعلیٰ و ادنیٰ کے بیچ میں حائل بعد مسافت کا تخمینہ نظر جا بجا زیادہ سے زیادہ وقت میں کم سے کم قطع مسافت کے اصول پر پھیلتا چلا جا رہا تھا کہ اچانک سائنسی اکتشافات کا وہ ہنگامہ خیز دور شروع ہوا جس نے صنعت و حرفت کی دنیا ہی بدل

دی اور اکتسابِ سرمایہ کی ایسی ایسی محیر العقول راہیں کھول دیں جن کی وجہ سے امراء و اغنیا کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ قطع مسافت کی بنیاد پر ایک دوسرے سے دور و متفاوت اور اس کے نتیجے میں متنفر ہونے لگے۔ دیرینہ طبقاتی کشمکش نے پہلے سے زیادہ خطرناک صورت اختیار کر لی۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ سائنسی آلات اور مشینوں کی دریافت سے پہلے زرعی اراضی ہی اقتصادی خوش حالی کی کنجی سمجھی جاتی تھی۔ صنعتی میدان میں معمولی پیمانے پر گھریلو دستکاری کا رواج ضرور تھا مگر وسیع بنیادوں پر صنعتی کارخانہ جو نمودِ زر کا صحیح ذریعہ ہو سکتا تھا۔ بہرحال جاگیردار رفتہ رفتہ چھوٹا موٹا صنعت کار۔ ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر کارکنوں کا زیادہ سے زیادہ محتاج تھا۔ یہ دونوں کامیاب پیداواری مہم چلانے کے لئے مناسب مقدار میں اچھے سے اچھے کاشتکاروں اور مزدوروں کا انتظام کرتے جن پر ان کے اپنے منافع کا ایک معقول حصہ اجرتوں میں صرف ہو جایا کرتا تھا۔

مشینوں کا دور چلا۔ تو کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ منافع بٹورنے کا بہت سستا طریقہ ہاتھ آیا۔ چنانچہ زندگی کے ہر میدان میں عموماً اور صنعتی مراکز میں خصوصاً مشینوں پر زیادہ سے زیادہ اور محنت کشوں پر کم سے کم انحصار کیا جانے لگا۔ مارکس اپنی کتاب کیپیٹل میں برطانوی پارلیمنٹ کے سرکاری بلیو بک کے حوالے سے لکھتا ہے:

"بھاری تعداد میں ذرائع آب پاشی کا استعمال، گھوڑے پالنے کے نئے طریقے اور سبز فصلوں کی مصنوعی کاشت، مشین کے ذریعے کھاد ڈالنے کے طریقے، زراعتی کو مختلف طریقوں پر تیار کرنے کے ذرائع اور کیمیاوی کھاد کا اعلیٰ پیمانے پر استعمال۔ بیشم انجن کا استعمال اور قسم قسم کی نئی مشینری استعمال میں لانے اور کاشت کو حد سے زیادہ بڑھانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ کاشت کے کام میں مزدوروں کی کمیت کم ہو گئی۔ ۱۸۵۱ء میں ان کی تعداد ۳۹۶، ۴۱، ۷ تھی۔ ۱۸۶۱ء میں یہ گھٹ کر ۳۴۸، ۱۰۷، ۶ ہو گئی۔"[1]

پیداواری تمام دور کا یہ مشینی نظام پے در پے جلو میں بے شمار نقائص و معائب ساتھ لے کر آیا۔ اس نئے نظام کی بدولت وسیع بنیادوں پر صنعت کاری کا آغاز ہوا۔ بڑی بڑی فیکٹریاں اور ملیں بننے لگیں۔ رفتہ رفتہ

---

[1] کیپیٹل جلد ۱ ص ۴۸۸۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

بڑی تیزی اور بلاخیزی پیدا ہوئی۔ کم فرچہ مشینوں کی تنصیب سے کارخانہ داروں اور مل مالکوں کی تجوریاں بھرنے لگیں۔ لیکن غریب صنعت کشوں کی گزر بسر پہلے سے بھی زیادہ سخت اور ان کی زندگیاں مفلوک تر ہو گئیں۔ اسٹیم کی طوفانی قوتوں کے کامیاب استعمال سے اولاً تو کارخانوں میں مزدوروں کی ضرورت ہی بہت کم رہی اور جو تھوڑی بہت رہی بھی، تو مشینی دور کی لائی ہوئی عام بے روزگاری نے کارخانہ داروں کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ کم سے کم اجرتیں مقرر کر کے اس ضرورت کو بڑی آسانی سے پورا کریں اور صنعت کشوں کے مفلوک سے کھیں کہ جس کو کوئی کاروباری حرج محسوس ہو کرے۔ مارکس صنعتی مزدوروں کی بدحالی کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتا ہے۔

"صنعتی مزدوروں کی حالت دن بدن گرتی گئی۔ بے چارے بے سہارا مزدوروں پر بڑے بڑے صنعت کاروں کی طرف سے سخت ظلم اور تشدد روا رکھا جاتا تھا۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے وہ موت کے دہانے پر جا پہنچے تھے۔ کوڑے لگائے جاتے اور انہیں ہتھکڑیاں پہنائی جاتی تھیں اور طرح طرح سے انہیں ایذا دی جاتی۔ بھوک کے مارے وہ ہڈیوں کا ایک پنجر بن جاتے تھے۔ لیکن انہیں کوڑے لگا کر کام کرنے پر آمادہ کیا جاتا۔ بعض اوقات وہ تنگ آ کر خودکشی کر لیتے تھے۔"[1]

نتیجۃً امیری و غریبی دو ایسی انتہاؤں پر پہنچ گئیں جن کو دیکھ کر انسان کے ان دو قسموں کے درمیان انسانی اشتراک کا تصور دھندلا جاتا۔ اور یہ بین حقیقت ایک بے اصل مفروضہ دکھائی دینے لگتا۔ اسی ناقابل برداشت اونچ نیچ نے نچلے طبقوں کو کوئی ایسی تدبیر سوچنے پر مجبور کیا جو سرمایہ داری کے ان مفاسد کا قلع قمع کر سکے۔ سوچ و فکر کا یہی انداز کچھ دوسرے عوامل کے ساتھ مل کر بالآخر سوشلزم پر منتج ہوا۔

سرمایہ داری کے خلاف خالص انتقامی ردِ عمل

نفس انسانی کا خاصا ہے کہ جب وہ اپنے گرد و پیش کی دنیا سے متاثر ہو کر فکری عمل کا آغاز کرتا ہے تو اس کی فکر اس کو انتہا کے دوسرے سرے پر پہنچا دیتا ہے۔ زمانے کے عام میلان سے بیزار ہو کر اس کا ذہنی رجحان بالکل مخالف راہ اختیار کر لیتا ہے۔ اور جن اقدار (VALUES) کو وہ عمرانی زندگی پر حکمران پاتا ہے

---

[1] کیپیٹل جلد ۱ ص ۵۵۸

انہیں الٹ پلٹ کر بالکل مخالف اقدار ترتیب دینا شروع کر دیتا ہے۔ غرض اس کی فکر غیر شعوری طور پر جانبِ نفرت اور بالفعل ہیجان سے متاثر ہوتی رہتی ہے۔

سوشلزم بھی انسانی فطرت کی اسی کمزوری سے برآمد ہوا اور اپنے عہد کے معاشی مظالم کو دیکھ کر ایک دوسری انتہا پر پہنچ گیا۔ عدالت کی طرف راہ نمائی کرنا تو کجا اس قسم کا فکری عمل بسا اوقات انسان کو اور زیادہ گمراہی میں پھنسا دیتا ہے۔ اور نئی نئی مشکلات و مصائب سے دوچار کر دیتا ہے۔

یورپ میں مشینی نظام کی ترویج سے ایک طرف تو دولت و ثروت کی منصفانہ گردش رک گئی اور مٹھی بھر سرمایہ داروں کا دور دورہ شروع ہوا اور دوسری طرف اسراف اور اظہارِ تمول کے انتہائی دلفریب مظاہر رونما ہوئے۔ آرام و آسائش اور آرائش و زیبائش کے نت نئے ساز و سامان بازاروں میں بکنے لگے جن کی وجہ سے زندگی کی رعنائیوں اور رنگینیوں اور پھر اس کی دلکشیوں اور دلچسپیوں میں حیرت انگیز اضافہ ہو۔ مگر اقلیت نے اکثریت کا خون چوس چوس کر دولت کے انبار لگائے اور اس کے بل پر تعیش کے ہر نئے ذریعہ سے بھرپور استفادہ کیا۔ جب کہ اکثریت ہر قسم کی لذتوں سے محروم رہی اور بیچاری قسمت کی ماری پہلے کی طرح اب بھی زندگی کی اس نئی گہما گہمی میں سے کوئی حصہ نہ پا سکی۔ مارکس کا بیان ہے:۔

"غیر جانب داری سے حالات کا جائزہ لینے والا معلوم کر سکتا ہے کہ ذرائع پیداوار کو جس قدر مرکزیت حاصل ہوتی جاتی ہے اسی قدر مزدوروں کو ایک جگہ پر ریوڑ کی صورت میں اکٹھا کر دیا جاتا ہے۔ اور اسی طرح جس قدر تیزی سے سرمایہ اکٹھا ہوتا ہے اسی قدر مزدوروں کی بہتات سے بالشت بھر زمین کی قیمت دہ ہوتی چلی جاتی ہے۔ شہروں کی سجاوٹ جس کا تعلق دولت کی فراوانی کے ساتھ ہے اور جس کا اہتمام بورژوا تعمیرات کو گرا دینے سے کیا جاتا ہے۔ بینکوں کے لئے عالیشان عمارات کی تعمیر، کارخانوں کی تعمیر تجارتی آمد و رفت کے لئے سڑکوں کی توسیع جو سامانِ تعیش کی نقل و حمل کے لئے ضروری ہوتی ہے، اور ٹرام سے کے لئے لازمی ہوتی ہے۔ ان سب ترقیات کا نتیجہ ہے کہ غریب کو اور زیادہ گنجان آباد کچی گاہوں کی طرف ہانک دیا جاتا ہے۔"

(کیپیٹل جلد ۱ ص ۶۵۱)

toobaa-elibrary.blogspot.com

مارکس ایک دوسرے مقام پر لکھتا ہے:

"یہی حالت دوسرے مزدوروں کی ہے جو اینٹیں بناتے ہیں، چونا بناتے ہیں یا ریوڑ کی تعمیرات میں کام کرتے ہیں۔ وہ خانہ بدوش ہوتے ہیں وہ جہاں بھی جاتے ہیں چیچک، ہیضہ اور دوسری وباؤں کا ایک دستہ اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ان کی رہائش کے لئے ٹھیکیدار چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بنا دیتے ہیں جہاں نکاس پانی اور روشنی کا ہرگز کوئی انتظام نہیں ہوتا اور پھر ستم یہ کہ تعدد مزدوران میں ٹھونس دیئے جاتے ہیں۔ چیچک کی وبا اور اموات بھی ٹھیکے داروں کو ان کی حالت بہتر بنانے پر مجبور نہیں کر سکتیں۔" (کیپیٹل جلد ۱ ص ۹۶۳)

ایک طرف تو بلند و بالا کوٹھیوں، زرق برق کے لباسوں اور انواع و اقسام کے لذیذ کھانوں کی ضرورت سے زیادہ بہتات اور فراوانی رہی، دوسری طرف گھاس پھونس کی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیاں۔ پھٹے پرانے چیتھڑے اور روکھی سوکھی روٹی بھی آسانی سے میسر نہ تھی۔ اب طبقاتی کی محرومیاں زیادہ سے زیادہ عیاں و نمایاں ہوئیں اور امیر کے فخر و مباہات کے پے در پے نمونوں کے سامنے ان کے احساسات کے نازک آبگینے زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے۔ شدید ترین احساس محرومی نے ناداروں کے دلوں میں نادیدہ کے خلاف بغض و عداوت کا بے حد و حساب زہر بھر دیا اور انتقامی جذبات کا ایک بے پناہ طوفان اُمڈ پڑا۔ جذبات کے اس استحصال و انگیخت نے طبقاتی کش مکش سے نمٹنے کی کوئی مناسب اور معتدل حل ڈھونڈنے کی بجائے ایک ایسا مفرطانہ اور خالص منتقمانہ راستہ اختیار کیا جس میں بھلے برے کی کوئی تمیز روا نہ رکھی گئی ہو۔ سوشلزم جلے ہوئے لوگوں کے اسی غیض و غضب کی صدائے بازگشت تھی۔

سوشلزم ایک یہودی تحریک

سیدنا حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں میں سے چوتھے بیٹے کا نام یہودا تھا۔ اسی سے بنی اسرائیل کے ایک خاندان کا ظہور ہوا۔ یشوع کے زمانے میں مفتوحہ علاقہ انہی لوگوں کے درمیان تقسیم ہوا۔ اس تقسیم میں ارشلیم سے لے کر اس کے جنوب کا تمام علاقہ بنی یہودا کے حصہ میں آیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام اسی خاندان سے تھے۔ ان کے زمانے میں تمام سلطنت بنی اسرائیل ان کے قبضے میں آئی جس سے اس خاندان کی عظمت اور شوکت کو چار چاند لگ گئے۔ ان کے بعد ان کے وارث حضرت سلیمان علیہ السلام ہوئے جنہوں

نے پہلے دارالسلطنت میں ہیکل کی تعمیر کی۔ اس سے بنی یہودا کی عظمت میں مزید اضافہ ہوا۔[1]

حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد ان کے اندر اختلافات پیدا ہو گئے۔ دس یہودی قوم دو حصوں میں بٹ گئی جس کے نتیجے میں شمالی فلسطین اور شرق اردن میں اسرائیل اور جنوبی فلسطین اور ادوم کے علاقے میں یہودیہ کی دو الگ الگ سلطنتیں قائم ہوئیں جن کے پایۂ تخت علی الترتیب سامریہ اور یروشلم قرار پائے۔ بعد کی تاریخ میں یہودیہ اور اسرائیل دو ہی نام آتے ہیں۔ پھر جب یہ لوگ کلدانیوں کی اسیری میں مبتلا ہوئے تو تمام بنی اسرائیل کے لئے یہود کا لفظ ایک مشترک نام کی حیثیت سے استعمال ہونے لگا۔[2]

جنس ایک بہت پرانی تاریخ اور عجیب و غریب روایات کی حامل ہے۔ ایک طرف تو اس کی آغوش انبیاء و رسل اور بڑے بڑے عابدوں، زاہدوں سے مالا مال اور آباد ہے اور دوسری طرف خبث باطن اور ہر قسم کی گمراہی کا آغاز بھی یہیں سے ہوتا رہا ہے۔

سید الانبیاء بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ ولادت، فضیلت اور آغاز نبوت میں ان کی قومی پستی اور زبوں حالی کا کیا حال تھا۔ پھر ان کے طفیل و برکت سے شرف و فضیلت کی کیا کیا خصوصیات پائیں! قرآن پاک کے لاثانی الاوراق میں اس کی مرقع تفصیلات موجود ہیں۔ پھر اس کے بعد سے لے کر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد تک بنی اسرائیل کے حالات و واقعات کو پڑھئے اور ان کے قومی سیرت و کردار کا جائزہ لیجئے آپ کو معلوم ہوگا کہ حضور حق میں بے رحیل اور گستاخیاں اور انبیاء کی بے باکانہ دل آزاریاں اور بلا جواز خونریزیاں ان کا طرۂ امتیاز رہا۔ تبدیل احکام، تحریف آیات الٰہی جیسے عظیم الشان جرائم کا ارتکاب ان کے اسلاف و اخلاف کا محبوب مشغلہ رہا۔ تمدن مزاجی، ابن الوقتی بدترین قسم کی خود غرضی اور مکر و فریب ان کی قومی شخصیت کی وہ جانی پہچانی علامتیں ہیں سے ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کسی دور میں بھی خالی نہ رہی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے میں رسوا و بدنام و اکثر و بیشتر خالق و مخلوق کی طرف سے معتوب و مطعون رہے۔

۷۲ء قبل مسیح میں اشور کے سخت گیر فرمانروا سارگون نے اسرائیلی سلطنت کے پایۂ تخت سامریہ کو فتح کر کے دولت اسرائیل کا خاتمہ کر دیا۔ ہزارہا اسرائیلی تہہ تیغ کئے گئے۔ ۲۷ ہزار سے زیادہ با اثر اسرائیلیوں

---

[1] تدبر قرآن حصہ اول از مولانا امین احسن اصلاحی۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

کو ملک سے نکال کر شوری سلطنت کے مشرقی اضلاع میں تتر بتر کر دیا گیا۔ ۷۲۲ ق م میں بابل کے بادشاہ بخت نصر نے بنی اسرائیل کی دوسری سلطنت یہودیہ پر ایک سخت حملہ کر کے اس کے تمام بڑے بڑے شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ یروشلم اور ہیکل سلیمانی کو اس طرح پیوند خاک کیا کہ اس کی ایک دیوار بھی اپنی جگہ کھڑی نہ رہی۔ یہودیوں کی ایک بڑی تعداد کو ان کے علاقے سے نکال کر مختلف ممالک میں منتشر کر دیا۔ اور جو یہودی اپنے علاقے میں رہ گئے وہ بھی ہمسایہ قوموں کے ہاتھوں بُری طرح ذلیل اور پامال ہو کر رہے۔ ۵۳۹ ق م میں ایرانی فاتح سائرس نے بابل کو فتح کیا اور اس کے دوسرے ہی سال اس نے بنی اسرائیل کو اپنے وطن جانے اور وہاں آباد ہونے کی اجازت دی چنانچہ یہودیوں کے قافلے یہودیہ کی طرف جانے شروع ہو گئے۔ (تفہیم القرآن جلد ۲)

۵۲۲ ق م میں دیریوس اول نے یہودیہ کے آخری بادشاہ کے پوتے زرو بابل کو یہودیہ کا گورنر مقرر کیا جس نے حجی نبی، زکریا نبی اور سردار کاہن یشوع کی نگرانی میں ہیکل مقدس نئے سرے سے تعمیر کیا۔ ۴۵۸ ق م میں حضرت عزیر علیہ السلام اور ۴۴۵ ق م میں نحمیاہ کے زیر قیادت یہودیوں کے اور کئی جلاوطن گروہ یہودیہ میں آ کر آباد ہوئے۔ حضرت عزیر علیہ السلام نے دین موسوی کی تجدید کا بہت بڑا کام سرانجام دیا۔ انہوں نے یہودی قوم کے تمام اہل خیر و صلاح کو ہر طرف سے جمع کر کے ایک منضبط انتظام قائم کیا۔ شاہ ایران نے نحمیاہ کو یروشلم کا حاکم مقرر کر کے اس امر کی اجازت دی کہ وہ اس کی شہر پناہ تعمیر کرے۔ اس طرح ڈیڑھ سو سال بعد بیت المقدس پھر سے آباد ہوا۔ (تفہیم القرآن جلد ۲)

ایرانیوں کے بعد رومیوں کا دور عروج آیا۔ ۶۳ ق م میں رومی فاتح پومپی نے بیت المقدس پر قبضہ کر کے یہودیوں کی آزادی کو خاتمہ کر دیا۔ ۴۰ ق م میں رومیوں کی قائم کی ہوئی یہ فلسطینی حکومت ایک ہوشیار یہودی ہیرودیس کے قبضہ میں آئی۔ ۳۷ ق م میں رومیوں نے اسی کے ایک پوتے ہیرود اگرپا کو اس سلطنت کا فرماں روا بنا دیا جس نے برسر اقتدار آنے کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام کے پیروؤں پر مظالم کی انتہا کر دی۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد یہودیوں اور رومیوں کے درمیان کش مکش شروع ہوئی۔ چنانچہ یہودیوں نے رومیوں کے خلاف کھلی بغاوت کر دی۔ ۶۶ء میں ٹیٹوس رومی نے زبردست لشکر لے کر یروشلم کو فتح کیا۔ اس موقعہ پر قتل عام میں ایک لاکھ ۳۳ ہزار یہودی مارے گئے۔ ۹۷ ہزار گرفتار کر کے غلام بنائے گئے۔ ہزارہا یہودی پکڑ پکڑ کر مصری کانوں میں کام کرنے کے لیے بھیجے گئے۔ اور ہزاروں کو مختلف شہروں

میں بھیجا گیا تاکہ وہاں عملی تھیٹروں اور کولوسیموں میں ان کو جنگلی جانوروں سے پھڑوانے یا شمشیر زنوں کے کھیل کا تختہ مشق بننے کے لئے استعمال کیا جائے۔ تمام دارالحکومت اور حسین لڑکیاں فاتحین کے لئے چن لی گئیں۔ اور یروشلم اور ہیکل کو مسمار کر کے پیوند خاک کر دیا گیا (تفہیم القرآن جلد ۲)

مار بار کی ان تباہیوں اور بربادیوں سے بچ کر ان کی ایک کثیر تعداد مغربی ممالک میں پھیلی۔ اور ایک بہت طویل زمانے تک اپنے مرکز قوم فلسطین کی آبادی کے لئے تڑپتی رہی۔ کم و بیش دو ہزار سال تک یہ یہودیوں کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ اور وہ ہجرت اور مسافرت کی مضطربانہ زندگی گذارنے پر مجبور رہے۔

یورپ کے دورِ قیام میں بھی ان کو عزت و سکون کا سانس لینا نصیب نہ ہوا۔ ایک زمانے تک تو بے خانماں اور مقامی باشندوں کی چاکری کی ذلت برداشت کرتے رہے۔ اور جب دنیا پرستانہ مہارت اور ہر جائز و ناجائز طریقے سے مٹھی بھرنے کی استحصالی روش سے معیشت کا خون چوس چوس کر ان کو ایک طبقہ وار ان کی اقتصادی زندگی پر چھا گیا تو بھی اپنے قومی رذائل کی بنا پر وہاں کی معاشرت میں کوئی جگہ نہ پا سکے

طرد و ضرب کی ان بے شمار روایتوں کے باوجود ان کے موروثی خصائل کی کارفرمائیوں میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ ان دولت اور متاع دنیا سے والہانہ دل بستگی اور خدا تعالیٰ کی محبوب اور چہیتی قوم ہونے کا غرہ بدستور قائم رہا۔ تمول اور تونگری اور نسل برتری کے پندار نے ان کے اندر بے جا بڑائی اور ڈھٹائی کی قبیح صفتیں ابھاریں جن کی وجہ سے پورا عیسائی معاشرہ ان سے متنفر ہوا۔ اور جلد ہی وہ عوام و خواص کی نگاہوں میں مطعون شہر رہے۔

فاتح تر سے متاثر ہو کر یورپ کی دو بڑی قوتیں حکومت اور کلیسا ان کے خلاف حرکت میں آئیں۔ چنانچہ دونوں کی ملی بھگت سے ۱۵۵۵ء میں پوپ پال چہارم نے ان کو معاشرتی زندگی سے پوری طرح منقطع کرنے

---

[1] اس طبقہ کی معاشی بربادی اور تونگری کا یہ حال تقاریباً ایک وقت آیا کہ یورپ کی اقتصادی زندگی کی سرگرمی ان کے ہاتھ میں تھی۔ تجارت پر ان کا قبضہ تھا۔ بڑے بڑے بنک اور ساہوکارے انہوں نے کھول رکھے تھے۔ حضرت عیسیٰ کے زمانہ میں ان کے سودی کاروبار کے پھندے ہوتے جال میں گرفتار تھے بلکہ جنگلوں اور ہنگامی ضرورتوں کے وقت حکومتیں ان سے قرضے لیتے پر مجبور تھیں۔ اس کے باوجود یہودیوں کی اکثریت معاشی زبوں حالی کی شکار تھی۔ اور یورپ کے متوسط طبقہ کی طرح دستکاری کر کے زندگی بسر کرتی تھی۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اور عیسائی سماج کو ان کی سازشوں سے محفوظ رکھنے کے لئے گیٹو یعنی یہودی بازارے قائم کرنے کے احکام صادر کئے۔ ان کے تحت کوئی غیر یہودی کسی یہودی کی ملازمت یا خدمت میں کام نہیں کر سکتا تھا۔ حکم ہوا کہ یہودی ہر وقت امتیازی بیج لگا کر رہیں۔ ان کی مذہبی کتابیں ضبط کر لی گئیں۔ انہیں تمام اہم مناصب و پیشوں سے محروم کر دیا گیا اور ان پر اعلیٰ تعلیمی اداروں کے دروازے بند کر دیئے گئے۔[1]

گیٹو کی الگ تھلگ زندگی میں یہودیوں کی سازشی ذہنیت کو اور جلا ملی۔ گیٹو کی زندگی میں انہوں نے اپنی اجتماعی زندگی کو تلمود کے پیش کردہ خطوط پر استوار کرنے کی جدوجہد کی۔ اسی زندگی سے آگے چل کر کمیون (COMMUNE) سسٹم کا تصور وضع کیا گیا۔ انہی خطوط پر یہودیوں نے فلسطین پر آباد ہوتے وقت کبوتز[2] (KIBBUTZ) یعنی مشترکہ خاندان، اجتماعی ملکیت کے تصور پر نئی بستیاں بسائیں۔ گیٹو نے آہستہ آہستہ ریاست در ریاست کی صورت اختیار کر لی۔ ہر گیٹو کا انتظام ایک مقامی کونسل کرتی تھی۔ مقامی ربی جس کا چیئرمین ہوتا اسے سب سے زیادہ اختیارات حاصل ہوتے وہ کونسل کے فیصلوں پر نظر ثانی کر سکتا تھا ان کی اپنی عدالتیں تھیں جن میں دیوانی مقدمات کے فیصلے ہوتے۔ عرف عام جدلی مقدمات میں انہیں ریاست کی عدالتوں کی طرف رجوع کرنا پڑتا۔ غیر یہودی حکام سے رابطہ رکھنے کے لئے ایک افسر نامزد کیا جاتا۔ پرائمری تعلیم ہر یہودی بچے کے لئے لازمی تھی۔ یہ تعلیم مذہبی ہوتی تاہم یہودی سیکولر تعلیم بھی حاصل کرتے جس کا انتظام ہر صاحب حیثیت یہودی خاندان خود کرتا۔[3]

سترھویں صدی عیسوی میں یہودیوں کو اسپین سے نکالا گیا تو ان کے بے شمار خاندان مغربی اور شمالی

---

[1] اور مسلمان تو ہیں

[2] اسرائیل میں مملکت مشترکہ ہوتی ہے جس میں یہودی اہل فکر کو مشترکہ قرار دیتے ہیں۔ فرق صرف تنظیم کا ہے۔ کبوتز میں ملکیت اسلامی ہے آباد یہودی خاندانوں کی ہے۔ اور سوشلسٹ حکومت میں اسے مزدوروں کا حق دے دیا گیا ہے۔ اجتماعیتوں میں سب خاندان مشترک طور پر رہتے ہیں۔ ان کی زندگی بس زندہ شہر کے تصورات تک محدود رہتی ہے۔ بچوں کے ساتھ ان کا تعلق برائے نام ہے۔ بچے اجتماعی نرسریوں میں پلتے اور سکولوں میں پڑھتے ہیں۔ ماں باپ انہیں وہاں جا کر ملتے ہیں۔ ایک حصے کے کئی شوہر اور ایک مرد کئی کئی بیویاں ہوتی ہیں۔ ازدواج و طلاق کو "روایت قرار دیا گیا ہے۔ آزادانہ اور آزادانہ جنسی ملاپ پر کوئی روک ٹوک نہیں۔ مرد اور عورت کبوتز کے کمیون ہال میں کھانا کھاتے ہیں۔ زن و شوہر کے تعلقات کے لئے تمام بنائے گئے ہیں۔ زمین اور صنعتی پیداوار کی آمدنی کا مالک کبوتز ہوتا ہے جس کی انتظامیہ کبوتز کے ارکان ووٹوں سے منتخب کرتے ہیں۔

[3] اور مسلمان تو ہیں

یورپ میں آباد ہو گئے۔ ان لوگوں کو مسلمانوں کے عہد حکومت میں اسپین میں اجتماعی زندگی کے ہر شعبے میں تجربہ حاصل تھا۔ اسپین میں مسلمانوں نے جو یونیورسٹیاں قائم کیں۔ انہی کے فارغ التحصیل یورپی نوجوان یورپ میں علمی و فکری بیداری کی تحریک کا آغاز بنے۔ ان یونیورسٹیوں سے یہودیوں نے پورا پورا استفادہ کیا تھا۔ چنانچہ ایک صدی تک عیسائی حکومت کے جبر و تشدد کا شکار ہونے کے باوجود جب اسپین سے نکل کر یورپ کے مختلف ملکوں میں آباد ہوئے تو علم و ہنر میں یورپی عیسائیوں سے کہیں آگے تھے یہاں انہوں نے جدید یورپ کے افکار و نظریات کی تشکیل و فروغ میں بھرپور حصہ لیا۔

گیٹو کی زندگی کے دوران یہودیوں میں کئی تحریکیں اٹھیں۔ متعدد افراد نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا ان تحریکوں اور مدعیان مسیحیت نے یہودیوں میں عیسائی اقتدار سے آزادی اور غیر یہودی دنیا پر چھا جانے کا جذبہ پیدا کیا۔ یورپ کی عقلیت پسندی اور آزاد خیالی کی لہر کے نتیجے گیٹو کی چار دیواری میں پرورش پانے والا یہی جذبہ اور تصور کارفرما تھا۔

عیسائی بادشاہ یہودیوں کے خلاف نفرت و عناد کی فضا پیدا کرنے میں برابر کے مصدر تھے۔ ان کی قوت توڑنے کے لئے مطلق العنانی، استبداد اور جاگیردارانہ نظام جس پر پوری ریاست کا سیاسی ڈھانچہ قائم تھا، کے خلاف آواز بلند کی۔ اور شہری آزادیاں، شہری حقوق دینے اور اقتدار میں عوام کو حصہ دار بنانے کی تحریک شروع کی۔

یورپی یہودیوں کی اکثریت جو معاشی لحاظ سے وہاں کے تیسرے درجے کے لوگوں پر مشتمل تھی، اور جو صنعتی مراکز اور بڑے بڑے کارخانوں میں محنت و مزدوری کے پیشے سے متعلق تھی، عام فکری بے چینی سے فائدہ اٹھا کر صنعتی دنیا میں اپنی بالادستی قائم کرنے کی جدوجہد کرنے لگی اور پرولتاریوں (محنت کشوں) کی اہمیت جتا جتا کر ان کی باقاعدہ انجمنیں اور تنظیمیں تشکیل دیں اور اس کے کلیدی عہدے خود ہی سنبھال لئے۔[1]

پرولتاری قوت و شوکت کا مطلب یہودی قوت و شوکت ہی تھا۔ اس لئے یہودی مفکرین نے پرولتاری تحریک کو مضبوط اور قوی بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ اجتماعی ملکیت کی برکات بڑھا چڑھا کر سوشلزم کی خیالی جنت دکھا دکھا کر اکثر یہودی کارکن مزدور طبقہ قائم کرنے کے لئے ذہنی اور عملی طور پر آمادہ کیا۔ اس طرح سے یورپ کی معیشت اور سیاست پر یہودیوں کا ایک قوت محرکہ کی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ اثر و اثر قائم ہوتا گیا۔ اور اس کو اس کے پرانے نظام سے سوشلزم کے نئے نظام کی طرف کھینچ لیا گیا۔

---

[1] سوشلزم کا بیرونیت کے ساتھ بنیادی اور بنیادی اساسی سرشاریوں پر مبنی ہے اور مسلمان تو ہیں "ناکام کتاب کے مصنف ایل ہالیس سے روشنی پڑتی ہے۔ سوشلزم جس کا آغاز پرولتاری انجمنوں سے آغاز ہوتا ہے۔ ابتدا سے لے کر ترقی کے آخری مرحلے تک یہودی تحریک رہا۔ کارل مارکس جس نے اس کو علمی بنیادوں پر استوار کیا (۱۸۱۸ء) کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوا تھا۔ مارکس جو ہر اس کا ساتھ دیتا اس کے پیدا نے (جو خود بھی حاخام تھا) عیسائیت قبول کر لی۔ اس کی ماں آخر دم تک یہودی رہی۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

کارل مارکس کا مسلک راست فرقہ نظریات میں جس نے پہلی انٹرنیشنل میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا فلسفہ ہی نہیں نہ تھا یہودی تھا سوشلزم بھی یہودی تحریک ہے۔ روس، یورپ اور امریکہ میں ہر جگہ سوشلزم کے صف اول کے رہنما یہودی تھے۔ روس میں سوشل انقلابیوں کا رہنما الیگزنڈر کرنسکی جو زار شاہی کا تختہ الٹنے کے بعد عبوری حکومت میں وزیر اعظم بنا پیدائشی اعتبار سے یہودی تھا۔ سوشلسٹ ڈیموکریٹک پارٹی جو آگے چل کر کمیونسٹ پارٹی کہلائی اس کا بانی پلیخانوف بھی یہودی تھا۔ موجودہ سوشلسٹ روس کا بانی لینن ایک یہودی النسل جرمن ڈاکٹر الیگزینڈر بلانچ کا لڑکا تھا۔ مارکسٹ مت دراصل لینن کے ساتھ عام کر اور جب اس کی سازشوں سے سوشل ڈیموکریٹک پارٹی میں پھوٹ پڑی تو منشویک (اقلیتی گروپ) کا سربراہ مارٹوف بھی یہودی تھا۔ ٹراٹسکی جس نے سرخ فوج مسلح کی اور کرنسکی کی عبوری حکومت کا تختہ الٹا، وہ بھی لینن کی رہنمائی میں اس کا پاکستان سمجھا جاتا تھا یہودی تھا۔ روس کی سوشلسٹ یونین کا پہلا چیئرمین سیکرٹری سوردلف بھی یہودی تھا۔ لینن کے قریب ترین رفیق، کامینیف اور کارل راڈک بھی یہودی تھے۔

سوشلسٹ تحریک کا سرمایہ بھی یہودیوں نے فراہم کیا۔ ان میں امریکہ کے یہودی ساہوکار جیکب شف اور کوہن لوب جرمنی کی کمپنی آف کوہن ویسٹ بالین رائن لینڈ سٹیل کمپنی شامل ہیں۔ شاک ہوم کا بنک دار بورگ، سینٹ پیٹرز برگ کا بنک کسر بورگ بہت نمایاں ہیں۔ جیکب شف کے بارے میں امریکی خفیہ پولیس نے رپورٹ دی کہ اس نے بالشویک انقلاب کو ۲۰ لاکھ ڈالر مہیا کئے تھے۔ اسی طرح بین الاقوامی سوشلسٹ تحریک کے رہنما بھی یہودی تھے۔ یوسٹن کی سوشلسٹ ڈیموکریٹک پارٹی کا پہلا صدر ہنری ڈیموکریٹک پارٹی تھا یہی صورت تھی میاکی سوشلسٹ ڈیموکریٹک پارٹی کی تھی۔ جرمنی کا سوشل ڈیموکریٹ فیڈریشن اسٹر کا ایڈیٹر، ڈرامر یکی لیبر فیڈریشن کا بانی سیموئیل گومپرز بھی یہودی تھے۔ اٹھارہ سو میں کمیونسٹ پارٹی کے بانی سات میں اور جولیا فنٹر تھے۔ دونوں میاں بیوی یہودی تھے۔ ہنگاری میں ۱۹۱۹ء میں انقلاب برپا کر کے ملک پر قبضہ کر لیا گیا اس کے لیڈر ایک شخص کے سوا سب یہودی تھے۔ فرانس میں مارکزم کے علمبردار ہمیشہ یہودی رہے ہیں۔ بلجیم میں کمیونسٹ پارٹی کا بانی چارلس فرڈ یہودی تھا۔ سویڈن کی کمیونسٹ پارٹی کا سب سے بڑا معاون آئیوکروگر یہودی تھا۔ ۱۹۲۰ء میں ماسکو کے مقام پر ۲۱ جولائی سے ۶ اگست تک بین الاقوامی کمیونسٹ پارٹیوں کی نمائندہ انجمن کمنٹرن (Comintern) کا اجلاس لاڈی زینوویف کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس میں ہنگری سے بیلا کوہن، فرانس سے روزمر، امریکہ سے ریڈ، جرمنی سے سٹاس ہارڈ، ہالینڈ سے سانس اور بلغاریہ سے شاپلن شریک ہوئے۔ سب یہودی تھے۔ یورپ اور امریکہ کی سوشلسٹ تحریک میں یہودیوں کا کتنا زبردست ہاتھ رہا ہے۔ اس کے متعلق مفصل معلومات کے لئے لوئس مارشانک (Louis Marshank) کی کتاب (The World Conquerors) کا مطالعہ نہایت مفید رہے گا۔

ایک نظر عرب ممالک پر بھی ڈالتے چلیں۔ کمیونزم غیر ملکوں میں جن لوگوں کو سوشلسٹ تحریک منظم کرنے کے لئے بھیجا وہ سب کے سب یہودی تھے۔ کاس یہیلی کو سوی اور اسرام نیشنلسٹ کو مصر۔ امریوچ کو فلسطین اور یاکوف تیمر کو شام بھیجا گیا۔ [illegible] کی بنیاد رکھنے سے سب سے پہلے ۱۹۱۹ء میں فلسطین کمیونسٹ پارٹی قائم ہوئی اس کے بانی اور ممبران سب یہودی تھے۔ یہی پارٹی ۱۹۲۱ء تک عالم عرب میں سوشلسٹ تحریک کی رہنمائی کرتی رہی۔

مصر میں سوشلسٹ پارٹی ۱۹۲۰ء میں وجود میں آئی۔ اس کا بانی اسکندریہ کا ایک یہودی جیری روبرٹی، شام اور لبنان میں کمیونسٹ پارٹی کی تشکیل ۱۹۲۵ء کے بعد ہوئی اس میں فلسطینی کمیونسٹ پارٹی کے یہودی مندوب برگر کا اہم حصہ تھا۔ آگے چل کر ایوام [illegible] ہوچیٹر و نجشتنکی نے سوشلسٹ نظریات پھیلانے، اور سوشلزم کی جڑیں مضبوط کرنے میں سرگرم حصہ لیا۔ سب یہودی تھے اور اپنا چہرہ چھپائے رکھتے تھے انہوں نے فرضی نام رکھ لئے تھے۔

عراق میں کمیونسٹ پارٹی دوسرے عرب ملکوں سے زیادہ طاقتور تھی۔ اس میں یہودیوں کی جدوجہد کا [illegible] کمیونسٹ پارٹی اور اس کی ذیلی تنظیموں پر یہی لوگ چھائے ہوئے تھے۔ عراق کی مرکزی کمیٹی کا اہم ترین رکن صدیق یہودی [illegible] بغداد کی مزدور یونین کا لیڈر یوسف سلمان تھا۔ بعد میں اسے یہاں بازوکی قوتوں اور مزدوروں کو منظم کرنے کے لئے حرہ [illegible] دی گئی۔ اسی طرح پیشہ ور تنظیموں کی تمام یہودیوں کے ہاتھ میں تھی۔ متوسط جماعت سادوں کی یونین کا لیڈر سلیم منشی۔ وکیلوں [illegible] کا لیڈر ڈاکٹر ہین۔ ڈاکٹروں کا یوسف داؤد اور تاجروں کا حسقیل ابراہیم سب یہودی تھے۔

Joan Peters, [illegible] دیکھئے البلاغ کویت ۱۵ اگست ۱۹۷۹ء

U.S.S.R. And the Arabs (London 1973) P. 35

toobaa-elibrary.blogspot.com

باب دوئم

سوشلزم کا فکری سفر

معیشت سے الحاد تک

سوشلزم نظریاتی ارتقاء کے کئی ادوار سے گزرا، اور مختلف فکری تغیرات سے اپنا سرمایۂ وجود اکٹھا کرتا رہا۔ پچھلی بحث کے مندرجات سے یہ حقیقت واضح از بام ہو گئی ہے کہ اس کا آغاز ایک فاسد اور بگڑی ہوئی معیشت کی اصلاح کی فکر سے ہوا جو بہت جلد ہی انسان کی نفسیاتی کمزوریوں سے متاثر ہو کر اپنی اصلیت اور افادی حیثیت کھو بیٹھا، اور اقتصادی ابتری کو ختم کرنے کی مخلصانہ کوشش کی بجائے انتقامی جذبات سے مغلوب ایک باطنیہ سازش میں تبدیل ہو گیا۔

اپنی سیدھی سادی ابتداء سے موجودہ پیچیدہ انتہا تک کا راستہ اس نے کیوں اور کس طرح طے کیا ہے اس پر کئی پہلوؤں سے بحث کی گنجائش ہے مگر ہم باقی تمام پہلوؤں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے فقط یہ بتانے اور سمجھانے کی کوشش کریں گے کہ کن حالات و مقتضیات کے تحت اس کو وہ کھلا ہوا الحاد اختیار کرنا پڑا جو موجودہ سوشلزم کے تمام ہیولے تریکس پر غالب ہے بلکہ سچ پوچھئے تو موجودہ سوشلزم الحاد ہی کا ایک مہذب اور سائنسی سا عنوان ہے جس کے دامن میں خدا، رسول اور ہر قسم کی مذہبیات اور اخلاقیات کے قطعی انکار کے سوا اور کچھ رہا ہی نہیں۔

اس باب میں انہی مقتضیات کی تشریح و تفصیل ہے جو سوشلزم کو الحاد تک پہنچانے میں بنیادی اور حتمی کردار کے حامل ہیں۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اہلِ کلیسا کی تنگ نظری

یورپ میں سائنسی ترقی کا نور تھا۔ نئی نئی ایجادات نے ملک کے طول و عرض میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا۔ زندگی کا ہر شعبہ پرانی چال چھوڑ کر نئے نئے انداز اپنا رہا تھا۔ تہذیب و تمدن کی وضعیں بدل رہی تھیں۔ اور پرانی معاشرت کا ایک ایک طور قدامت کے ننگ و عار سے کھسک کھسک کر اپنا خول چھوڑ رہا تھا۔ اور اس کی جگہ جدید طور کی آبادکاری بڑی تیزی سے ہو رہی تھی۔

یورپ کی دوسری بڑی قوت کلیسا جو مذہبیات کی نگران و پاسبان تھی حقیقت شناسی، نکتہ رسی، بالغ نظری اور تحسینِ طرفی کے اوصاف سے محروم ہو چکی تھی۔ انسانی سیرت و کردار کی جانچ پرکھ اور اس کے بود و باش کے طریقوں کی صحت و فساد معلوم کرنے کے لئے وہ ان تنگ و تاریک، اور گھسے پٹے پیمانوں کو استعمال کرتی جو خدا تعالیٰ کی کسی شریعت نے نہیں بلکہ اس کی اپنی تنگ نظری اور خود ساختہ تردید و ترہیب نے متعین کئے تھے۔ انہی پیمانوں کے نپنے تک اندر بیٹھے اور اس کے سوا سب کچھ اس کی نگاہ میں برائیوں کی فہرست میں شامل تھا۔ اہلِ کلیسا زندگی کے قدیم طور طریقوں کو مذہب کا اٹوٹ انگ اور ان سے سرمو ہٹنا مذہبی زندگی سے انحراف کے مترادف سمجھتے تھے۔

سائنسی ترقی اور اس کے نتیجے میں رونما ہونے والی معاشرتی تبدیلیاں کلیسا کی رجعت پسندی کو بڑی شاق اور ناگوار گذر رہی تھی۔ چنانچہ اس نے جدیدیت کے اس پورے نظام کو بیک جنبش قلم ناجائز اور اس کے پرستاروں کو گردن زدنی قرار دیا۔

یورپ کا دانشور طبقہ کلیسا کی جابرانہ روش اور نامعقول مذہبی پابندیوں سے پہلے ہی سے نالاں اور بیزار تھا۔ نئی زندگی کی بابت اس کی یہ سطحیت و جمود اور پھر اس درجہ کی سخت گیری دیکھ کر اور بھی زیادہ پریشان ہوا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ طبعی حقائق کی دریافت سے زندگی کا ایک نیا نظام مرتب ہو رہا ہے جس میں انسانیت زیادہ سے زیادہ آرام و راحت اور خوشی کے ساتھ اپنے منصبی فرائض سرانجام دے سکتا ہے تو مذہب کا یہ نام نہاد محافظ کیوں اس پر ناک بھوں چڑھا رہا ہے۔ اس قسم کی صورتِ حال نے دانشوروں کے

ف۱ یورپ صدیوں تک فکری و تہذیبی پستیوں میں غرق رہنے کے بعد ابھر رہا تھا۔ نئی نئی علمی و فکری راہیں کھل رہی تھیں۔ سائنس کے میدان میں تحقیقات زور و شور سے جاری تھیں۔ نت نئے انکشافات ہو رہے تھے۔ بھاپ کی قوت کے انکشاف سے صنعت کی دنیا میں انقلاب آ گیا تھا۔ ہر طرف کارخانے اور فیکٹریاں قائم ہو رہی تھیں۔ تنگ نظر کلیسا نے جس کے پاس معدودے چند اخلاقی نصائح کے سوا جدید زندگی کا کوئی لائحہ عمل نہ تھا، اس علمی و فکری انقلاب کو خلافِ مذہب قرار دے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائیوں کے تعلیم یافتہ طبقے اور پادریوں کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی۔ عیسائی حکومتوں نے پادریوں کا ساتھ دیا اور فکرِ جدید کے علمبرداروں پر سخت ظلم توڑے۔ اس کا ردِ عمل جدید مفکرین اور دانش ور طبقے میں مذہب و حکومت کے خلاف نفرت و فکری و سیاسی آزادی کی طلب کی صورت میں ہوا۔ یہودی نظریات نے اس نفرت کو مزید ہوا دی۔ شہری حقوق اور سیاسی آزادیوں کے پردے میں یہودی مفکرین نے عیسائی دانشوروں کو اپنے حق میں استعمال کیا۔ ان مفکرین میں مڈے میڈ لسن (۱۷۰۴ - ۱۷۸۶ء) نامی یہودی کا نام بہت نمایاں ہے۔ یہ بظاہر راسخ العقیدہ یہودی تھا۔ مگر عیسائی معاشرے میں فکری و سیاسی نفوذ پانے کے لئے یہودیوں کو جدید طرزِ زندگی اختیار کرنے کی تلقین کرتا تھا۔ اس نے عیسائی اہلِ فکر کو سب سے زیادہ متاثر کیا (روس میں مسلمان قومیں بلکہ شاہ ولی اللہ)

ف۲ کلیسائی اقتدار کے خلاف باقاعدہ تحریک شروع کرنے والا سب سے پہلا شخص مارٹن لوتھر تھا (۱۴۸۳ء میں آئسلیبن (Eisleben) کے مقام پر پیدا ہوا۔ انٹرفٹ (Ein Furt) یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی اور ویٹن برگ (Witten Berg) کی یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوا۔ (مصنف)

toobaa-elibrary.blogspot.com

دقیانوسی دور اور اوہام کہا جانے لگا۔

کلیسا اور دانشوروں کی اس جنگ سے یورپ کے عوام بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ پورے معاشرے میں اباحیت اور آزاد خیالی کا رجحان پیدا ہونے لگا جو رفتہ رفتہ مذہب بیزاری کی ایک منظم اور ملک گیر تحریک کی شکل میں نمودار ہوا۔

قریب قریب یہی زمانہ تھا یورپ میں اشتراکیت کے پنپنے اور پروان چڑھنے کا بھی۔ علاوہ ازیں دونوں ..... باحیت اور اشتراکیت .. ایک ہی بطن ... یہودیت ... سے تولد ہوئے تھے اور اسی لئے دونوں اسی سے پرورش پا رہے تھے۔ لہٰذا ایک کا دوسرے سے شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر ہو جانا بالکل قدرتی بات تھی۔

علوم طبیعیہ کی ترقی کا منفی اثر

انسان کی کامیابی اور ناکامی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ اس نے دنیا و آخرت کی زندگیوں میں سکون و اطمینان کا کتنا حصہ پایا ہے جس قدر اس کو چین و قرار نصیب ہوگا اتنا ہی وہ کامیاب و کامران قرار پائے گا اور جتنا وہ بے چین و بے قرار ہوگا اسی کے بمقدار ناکام و نامراد محسوب ہوگا۔

سکون و اطمینان کیفیات کے قبیلے میں سے ایک کیفیت کا نام ہے جس کو ہر شخص محسوس تو بڑی آسانی سے کر سکتا ہے اور کبھی اپنے مطمئن یا بے اطمینان ہونے میں کسی قسم کے تردد کا شکار نہیں ہوتا لیکن اس حقیقت کی تفصیل کو الفاظ کا ایسا جامہ پہنانے میں بڑی مشکل سے دوچار ہوتا ہے جو اس کی قدر و قامت پر بالکل راست آجائے۔ ہم اپنی دانست کی عدالت سکون دل کی اس کیفیت کو کہتے ہیں جس کے پیدا ہونے سے انسان کو ایک ایسی سرخوشی حاصل ہو جاتی ہے جس میں دوران نفس کے "میل من یرید" کا ہر وہ چھوٹا سا تقاضا خود بخود دب کر فنا ہو جاتا ہے جو اس کو زندگی بھر مضطرب رکھتا ہے۔

یہ فرق سمجھے بغیر کہ انسان کے اندر سے تقاضے ابھرنے کی جگہ نفس ہے یا روح اور پھر عمل کے اعتبار سے ان میں کیا کیا امتیازات ہوتے ہیں، ہم حالات تقاضا کی بنیاد پر اس کو دو قسموں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک وہ جس کو اشتہائے تقاضا ہی میں صاحب تقاضا کو چنی محرومی کا اس شدت سے احساس ہوتا ہے کہ جس کی تکمیل میں اس کو عموماً بسمل کی طرح تڑپاتی ہیں اور دوسری قسم وہ جب کہ دوران تقاضا میں بدن کے ریشے ریشے اور رگ

رگ پٹھے پٹھے میں ایک ناقابل بیان تشنگی اور سرور پاتا ہے۔ پہلی قسم کا تقاضا سکون کو برباد کرنے والا اور دوسری قسم کا تقاضا اس کو فزوں تر کرنے والا ہوتا ہے۔

دنیا اور اس کی زندگی انسان کا ساز و سامان ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ انسان اپنی مادی زندگی کو باقی رکھنے کے لئے مادی چیزوں سے استفادہ کرنے پر مجبور ہے۔ کیونکہ دنیا میں اسی کی بنیاد پر اس کی انسانی زندگی کی بالائی عمارت کھڑی ہے تاہم اس کے باوجود انسانی سکون و اطمینان کا اس کی مادی زندگی سے چنداں تعلق نہیں۔

مادی اشیاء سے مادی زندگی کی بقا کی حد تک استفادے کی جس قدر ضرورت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنی فطرت اور انبیاء علیہم السلام کے ذریعے سے اس کے ٹیکنک و حدود بتائے اور سکھلائے لیکن اس سے بڑھ کر مادی اشیاء کے استعمال کے جزئیات کی تعلیم سے فطرت یا خدا کی شریعتیں خاموش اور ساکت ہیں۔ ان کو اس کی مادی زندگی کے ارتقاء کے سلسلے میں پروسے کار لایا جا سکتا تھا۔ اس کام کو رب تعالیٰ نے اس کی عقل پر چھوڑ دیا تاکہ ایک طرف تو نفس کے زور دار تقاضے اس کو عقل کے استعمال کا خوگر بنائیں اور دوسری طرف اشیائے مادی کی پیچیدگیوں اور ان کی حکمت آمیز ہیئت و ترکیب کا مطالعہ اس کو خالق کی قدرت و حکمت کی طرف متوجہ رکھے اور وہ ایمان و ایقان کا علم اور رسوخ حاصل کرتا چلا جائے۔

اس کے برخلاف انسان کا روحانی چین و سکون جو اس کی دنیا و آخرت کی زندگیوں کی کامیابی کا اصل الاصول ہے چونکہ ایسے امور و اعمال سے مربوط اور وابستہ تقاضوں کا ادراک اس کی عقل کی دسترس سے باہر تھا۔ اس لئے شفیق و مہربان خدا نے حکم و عمل کا وہ پورا نظام اس کو عطا فرمایا جو اس کی روحانی بقا اور نشوونما و ارتقاء دونوں کے لئے کافی شافی ہے

تجربہ اور مشاہدہ ہی جو اس حقیقت کو جانتے ہیں کہ انسان کی مادی زندگی کا نظام اس کی روحانی زندگی کے نظام سے بالکل الگ اور جدا ہے۔ ایک کو دوسرے پر قیاس کرنا عقلمندی نہیں بلکہ اعلیٰ درجے کی بے عقلی اور حماقت ہے۔ اسی حقیقت سے بے خبری یا چشم پوشی نے یورپ کے ایک بڑے حصے کو اس فکری انتشار میں مبتلا کر دیا جس سے ان کی روحانی سکون تباہ و برباد ہو کر رہ گیا۔

انیسویں صدی عیسوی میں جب علوم بہت تیزی سے ترقی کر رہے تھے ۱۸۶۳ء میں وٹانی انجن سے بڑی بڑی مشینیاں چلانے کا کام لیا جانے لگا۔ ۱۸۰۱ء میں ٹریوتھک (TREVITHICK) نے بھاپ کے

toobaa-elibrary.blogspot.com

تجویز کردہ انجن میں مزید اصلاح کی جس سے وہ عمل و نقل کی ضروریات کے لئے قابلِ استعمال ہو گیا چنانچہ ۱۸۲۵ء میں ڈارلنگٹن اور سٹاکٹن کے درمیان پہلی ریلوے کا افتتاح عمل میں آیا۔ ذرائع نقل و حمل اور تسطیع مسافت کے دائرے میں ان ایجادات کی وجہ سے جو عظیم الشان تبدیلی عمل میں آئی اس کا اندازہ کچھ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ نپولین نے روس میں شکست کھانے کے بعد برف سے پیرس تک کی ۱۴۰۰ میل کی مسافت ۱۲ دن میں طے کی تھی جس کا فی گھنٹہ اوسط پانچ میل ہوتا ہے۔ لیکن ریلوں کی ایجاد کے باعث یہی سفر ۲۸ گھنٹوں میں طے کیا جانے لگا۔ گویا کہ جو مسافتیں ایک ہفتہ تک کم ہو گئیں۔ دخانی انجن کے بعد دخانی جہازوں کی ایجاد عمل میں آئی تو نہ صرف بحری سفر کے مخاطرات گھٹ گئے بلکہ آمد و رفت کے وقات کا تعین بھی ہونے لگا۔ واٹ کا گالوانی اور فیریڈے کے نتائج تحقیقات نے برقی قوت کے استعمال کا دروازہ کھول دیا تار برقی پہلی مرتبہ ۱۸۳۵ء میں ایجاد ہوئی۔ ۱۸۵۱ء میں انگلستان اور فرانس کے درمیان تار برقی کا پہلا تحت البحر سلسلہ قائم کیا گیا۔ تھوڑے عرصے میں اس کا جال ساری دنیا کے سمندروں میں پھیل گیا اور ایک ملک کی خبریں مہینوں اور سالوں کی بجائے دنوں اور گھنٹوں میں دوسرے ملکوں تک پہنچنے لگیں۔

اٹھارھویں صدی کے وسط تک لوہے کو صاف کرنے کی غرض سے لکڑی کا کوئلہ استعمال کیا جاتا تھا اور اس طرح جو صاف لوہا نکلتا تھا اس کے صرف چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو ڈھالا جا سکتا تھا۔ لوہے کی بڑی سے بڑی مقدار جسے ایک وقت میں ڈھالنے کی کوشش کی جا سکتی تھی وہ تین ٹن سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اس کے بعد کچے لوہے کو صاف کرنے کے لئے پتھر کے کوئلے کو استعمال کیا جانے لگا۔ اس شعبے میں مزید ترقی اس وقت عمل میں آئی جب نئی قسم کی بھٹیاں تیار کی جانے لگیں۔ اور بالآخر برقی بھٹی کی ایجاد نے لوہے اور فولاد کی صنعت کو ہم عروج پر پہنچا دیا چنانچہ ان بھٹیوں میں ہزاروں من لوہا ایک وقت میں ڈھالا جانے لگا اور لوہے کی بڑی بڑی وسیع چادریں تیار کی جاتی تھیں جس کے نتیجے میں دیو ہیکل انجن لوہے کے بڑے بڑے جہاز اور وسیع و عریض پل بننا شروع ہو گئے۔ انیسویں صدی سے قبل دو ہزار ٹن سے زیادہ کسی جہاز کا وزن نہیں ہوتا تھا۔ اب پچاس ہزار ٹن وزن کے جہاز معمولی سمجھے جاتے ہیں۔[1]

ہماری مادی زندگی کی ان حیرت انگیز اکتشافات اور طبعی تحقیقات کے نتیجے میں بدولت یورپ نے کیا کچھ پایا اور کیا کچھ کھویا؟ اس استفہام کا مختصر جواب یہ ہے کہ بے شک چند حقیر اور بے اہمیت قسم کی مادی تعیشات تو اس کے ہاتھ لگیں مگر دین و مذہب کی اس دولت اور نعمتِ عظمیٰ سے ہاتھ دھو بیٹھا جو اس کے

[1] تشریح اس امر کی یہ ہے کہ مادی کی بے جان اشیاء کی ہر نوع کچھ خاص خصوصیت رکھتی ہے جو اس کے تمام افراد میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ مثلاً لوہے کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مقناطیس کی طرف کشش کرتا ہے۔ اسی طرح ہر نوع کی خصوصیت کو ظہور میں لانے کے لئے ہر ایک کے ساتھ مخصوص طبعی خاصیت رکھنے والی مختلف چیزوں کے کیمیائی ترکیب و تالیف سے ہیئت کے لحاظ سے ایک جیسے نتائج پیدا کئے جا سکتے ہیں اور اسی طرح یہ عمل مسلسل آگے بڑھایا جا سکتا ہے لیکن عالم انسانی اور دوسرا کا معاملہ ایسا نہیں۔ اس میں تو ہر جان شے خواہ وہ حیوانی جان ہو یا نباتی جان، ہر ایک فرد اپنی انفرادی خصوصیت رکھتا ہے۔ اس لئے ایک ہی قسم کے تجربات سے ایک ہی نتیجہ پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر ایک فرد سے ایک مختلف نتیجہ پیدا ہوتا ہے جو اس کے شعور و ارادہ کی پیداوار ہوتا ہے۔ یہاں کوئی ایسا ہو بنا بنایا کلیہ نہیں ہے جس کی مدد سے ہم انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کے بارے میں پیش گوئی کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ عالم مادی میں انسانی عقل نے تعمیر و ترقی کے جو کارنامے سرانجام دیئے ہیں عالم انسانی میں اس کی مساوی ترقی کا ساتھ نہیں دے سکی۔

امن و سکون کی بنیاد و اساس تھی اور جس پر اس کی ایک اچھی بھلی اخلاقی اور شریفانہ زندگی استوار تھی۔ اپنی کامیابی کے نشے میں مست یورپ کو اندھا دھند انسان کچھ اس طرح سے سوچنے لگا کہ ہمارے آباؤ اجداد پرانے خیالات و افکار سے چمٹے رہنے کی بدولت زندگی کی رونق اور چہل پہل سے محروم رہے ہم نے اس فرسودگی کو بالائے طاق رکھ کر سوچ و بچار کی نئی راہیں ڈھونڈ نکالیں تو وہ رعنائیاں نصیب ہوئیں جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہ آئی ہوں گی۔ وہ زیب و زینت کی نئی نئی صورتوں سے لطف اندوز اور آرام و راحت کے نئے نئے طریقوں سے شاد کام ہو رہا تھا۔ اور اپنے اسلاف کی عظمتوں پر کف افسوس مل رہا تھا۔ اس نے یورپ کی ماضی کو تاریک خیالی اور حال کو روشن خیالی کا دور قرار دیا۔ اس کے غور و فکر کے زاویے ایسے متاثر ہوئے کہ ماضی کی ہر چیز کو ماضی کی یادگار سمجھنے لگا۔ اور اس کو گرانے کی فکر اور کوشش کرنے لگا۔

جدت پسندی کے جوش نے اس کو اس قدر خود فراموش کر دیا کہ سیاہ و سفید کی کوئی تمیز نہ کر سکا۔ اس نے پرانے خیالات و احساسات کے بوسیدہ خانے بھی نذرِ آتش کئے جو واقعتہً جلانے کے مستحق تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ علم و آگہی کے وہ دفاتر و دواوین بھی دیدہ دلیری سے برد کر دیئے جو اس کی مذہبی زندگی کا مضبوط سہارا تھے۔ عالم مادی کے میدان میں اس کی مہم جویانہ کوششوں نے جو حوصلہ افزا نتائج پیدا کئے جس کی روشنی میں اس سے متعلق پرانے خیالات قطعی طور پر غلط ثابت ہوئے اسی پر قیاس کر کے اس نے عالم انسانی کی عمرانی اور تمدنی زندگی کو بھی ایسی ہی کوششوں کی جولانگاہ سمجھا اور عالم طبیعی ہی کی طرح اس میں بھی علت و معلول اور سبب و مسبب کے تعلقات کے ضوابط و قوانین اخذ کر کے عمران و تمدن کی پرانی بنیادیں ڈھا کر نئی بنیادیں متعین کرنے لگا۔[1]

toobaa-elibrary.blogspot.com

بھی وہ غلطی تھی جس کے سرزد ہونے پر اس کی روحانی زندگی کے تار و پود یکسر بکھر گئے کہ اس کو دوبارہ سمیٹنا تو یکسر جاگرنے میں وہ ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکا۔ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ اسی لئے کہ وہ مادی تصورات اور اعمال کے درمیان باہمی فرق نہ کر سکا۔ اور دونوں کو ایک ہی وقت کا برگ و بار سمجھ کر اکٹھا پھینک دیا۔ اشتراکیت کی ہوا بھی اسی ماحول میں چل رہی تھی۔ چنانچہ مذہب بیزاری اور علوم طبیعہ کی ترقی کے اس اثر کا تعفن و سڑاند اس کے جھونکوں میں بھی غلط ہو کر دور دور تک پہنچ گیا۔

نجی ملکیت اور مذہب کا لازمہ

ملامت دل کے متعدد آیات میں ہم کتنے گناہ کرتے ہیں؟ اور نفس کی متابعت میں مذہب و اخلاق کی کتنی حد بندیاں توڑتے رہتے ہیں؟ اس کا پورا پورا اندازہ کرنے کے لئے وجدانِ صحیح اور قلب سلیم کی ضرورت ہے گناہ کیا ہے؟ مذاہب و ادیان کی تفصیلات سے پتہ چلتا ہے کہ اس حقیقت کے مفہوم میں کمی بیشی ہوتی رہی ہے اور مختلف زمانوں میں مختلف چیزوں کو گناہوں کے زمرے میں شامل کیا جاتا رہا ہے۔ تاہم اس کی ایک جامع تعریف جو بلاشبہ اپنی تمام جزئیات پر پوری طرح منطبق اور ہر لحاظ سے واضح اور غیر مشتبہ ہے اس طرح سے کی گئی ہے کہ "ہر وہ چیز جو دل کو کھٹکتی ہے گناہ ہے"[1] باقی رہا یہ مسئلہ کہ دل کو کیوں کھٹکتی ہے۔ اس کی وجہ ہر دور کے مذہبی اور اخلاقی تصورات کی وہ غیر شعوری تاثیر ہوتی ہے جس نے قلوب کے اندر بھلے بُرے کی تمیز اور ہر برائی کے بعد دل گرفتگی اور ذہنی کوفت کے احساس کا ایک ملکہ پیدا کیا ہوا ہوتا ہے۔

گناہوں کے ارتکاب سے اس لئے اجتناب کیا جاتا ہے کہ انسان اپنے ضمیر کا لعن طعن اور معاشرے و ماحول کی وہ تشنیع و تقبیح برداشت نہیں کر سکتا۔ جو رد عمل کے طور پر اس کا پیچھا کرتی ہے۔ لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مسلسل گناہوں کے تکرار اور عادۃ الوقوع ہو جانے سے اُن کی برائی کا احساس تک اٹھ جاتا ہے اور اب اس کے کرگزرنے پر نہ تو ضمیر کے ملامت کرنے کا کوئی خوف ہوتا ہے اور نہ ہی معاشرے کی انگشت

---

[1] ایک شخص نے نبی علیہ السلام سے نیکی اور گناہ کی بابت پوچھا۔ آپ نے فرمایا نیکی اچھی خصلتیں ہیں اور گناہ ہے جو دل میں کھٹکتا ہو اور تو نہیں کہ اس پر مطلع ہو جائے کوئی تو اس پر نظر رکھے۔ ترغیب الترہیب

کا کوئی اندیشہ۔ اب بڑے سے بڑا گناہ بھی بہت ہلکا پھلکا اور اس کا ارتکاب بہت سہل اور آسان ہو جاتا ہے۔

اسی طرح ضمیر کی ملامت کو ختم یا کم از کم خفیف تر بنانے اور اس کی تیز و تند دھار کو کند کرنے کے لئے بھی کچھ ایسے تقاضوں سے مغلوب ہو کر عقل انسانی حیلہ جوئیوں کا راستہ اختیار کرتی ہے۔ اور ایک ہی واضح اور بین گناہ محض اس لئے جائز العمل قرار پاتا ہے کہ معتزلہ عقل کی نکتہ آرائیوں نے اس کی قباحت کا نقشہ ہی داغ دیا ہوتا ہے اور اب اس کے کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کیا جاتا۔

عقل کی ایسی چارہ سازیاں عام طور پر انہی لوگوں کو لے ڈوبتی ہیں جن کو اپنی ہوشمندی اور دانشمندی کے ساتھ ساتھ اپنے تدین کا بھی گھمنڈ ہوتا ہے۔ گمراہی کی یہ صورت دوسری تمام صورتوں سے زیادہ مہلک ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں گناہ کے ساتھ ساتھ جرأت و جسارت کی جارحیت بھی ہوتی ہے۔

اشتراکیت کی مفکرین کو اشتراکی فلسفے اور اس کے مطلوبہ نتائج سے جو عشق و محبت تھی اس کے تحت اس کا بھی نفاذ دنیا کی تمام آزادیوں کی واحد آزادی بن گئی تھی۔ یہ زندگی کے جملہ مظاہر میں اس کی بالادستی قائم کر دینا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے بھی آمادۂ عمل نظر آتے تھے۔

لیکن اشتراکیت کی جدوجہد کا آغاز کار ہی نجی ملکیت کی نفی سے ہو رہا تھا۔ اشتراکیت کی زعماء نجی جائیداد کو طبقاتی کشمکش اور بوٹ گھسوٹ کی اصل وجہ قرار دیتے تھے۔ اور جیسا کہ کمیونزم کے لغوی معنی سے ظاہر ہے وہ نظریاتی طور پر نجی ملکیت کا خاتمہ چاہتے تھے اور اس کی بجائے تمام اراضیات اور ذرائع پیداوار کو مشترک قومی ملکیت میں دے دینا چاہتے تھے۔ ان کے خیال میں اس اقدام سے معاشرے میں طبقات کا بھی خاتمہ ہو جاتا اور طبقات کے خاتمے کے ساتھ ساتھ بوٹ گھسوٹ کا بھی قلع قمع ہو جاتا اور ایک خوشحال اور ترقی پذیر معاشرہ نمودار ہو جاتا۔ لینن نے ایک تقریر میں کہا۔

"ہم اپنے آپ کو کمیونسٹ کہتے ہیں۔ کمیونسٹ ایک لاطینی لفظ ہے مشترک کی لاطینی "کمیونس" ہے کمیونسٹ معاشرہ وہ معاشرہ ہوتا ہے جس میں تمام چیزیں یعنی زمین اور فیکٹریاں مشترک ملکیت ہوتی ہیں اور لوگ مشترک طور پر کام کرتے ہیں اسے کمیونزم کہتے ہیں"[1]

---

[1] Lenin Selected Works, V III P. 471

toobaa-elibrary.blogspot.com

ایک اور موقعے پر لینن نے کہا۔

زمین کا تو میلہ جس کا مطلب زمین کی نجی ملکیت کا خاتمہ ہے حقیقت میں تمام نجی ذرائع پیداوار پر بالعموم ایک کاری ضرب لگائے گا۔ اس لئے مزدوروں کو چاہیئے کہ وہ ہر ممکن طریقے پر ان اصلاحات کے نفاذ میں مدد کریں۔[1]

ایک طرف تو انفرادی ملکیت کو ان تمام معاشی اور معاشرتی مفاسد اور مضرت کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا تھا جس کے ہجوم نے مزدوروں اور محنت کشوں کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ اور اس کے خلاف اندر ہی اندر لاوا پک رہا تھا جو حالات کی کسی چھوٹی سی تبدیلی کو توڑ کر بہہ نکلنے کے لئے بے تاب تھا۔ اور دوسری طرف [illegible] کر بلا استثنا سان تمام مروجہ مذاہب کی تائید و حمایت حاصل تھی۔ جس میں کسی مافوق الفطرت ہستی [illegible] شعوری وجود اور اقتدار مسلم تھا۔ غرض نجی ملکیت اور مذاہب کا ایک دوسرے کے ساتھ چولی دامن کا تعلق تھا جس کی وجہ سے ایک کو دوسرے سے الگ اور جدا نہیں کیا جا سکتا تھا۔

یہی وہ دوراہا تھا جس پر پہنچ کر اشتراکی مفکرین کو اپنی خواہش ..... نجی ملکیت کا خاتمہ..... یا مذہب میں سے کسی ایک کو اختیار اور دوسرے کو مسترد کرنے کا دوٹوک فیصلہ کرنا تھا۔ اہل کلیسا کی تنگ نظری اور طبعی تحقیقات کے منفی اثرات نے مذہب کی چولیں پہلے ہی سے ہلا دی تھیں۔ اس لئے اس [illegible] انکار پر ماحول و معاشرے کی خوشنودی اور دل کی مراد بھی جاتا رہا تھا اور وسیع تر عوامی اور قومی مفاد [illegible] کی معاصت پینیول نے ضمیر کی خلش کو بھی ختم کر کے اس کی ملامت سے بے پروا کر دیا تھا۔ چنانچہ بڑی بے شرمی اور ڈھٹائی سے سرے سے اس کے وجود ہی کا انکار کر دیا گیا۔

اس تفصیل سے یہ بات نکھر کر سامنے آ گئی ہے کہ مذہب کا انکار اشتراکیت کی وہ بنیادی ضرورت تھی جس کے بغیر وہ ایک گام کا فیصلہ طے نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ اس ضرورت کے تحت اس نے مذہب دشمنی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

★

---

[1] V. I. Lenin Selected Works, V III, P. 1-1

مارکس کا مادی نظریۂ تاریخ

ایک طویل زمانے تک یورپ کی یہ چین فضیلت میں کروٹیں بدلتے رہنے کے بعد اشتراکی خیالات ایک ایسی کاری کی گاہ تلاش میں تھے جہاں ان کی منتشر شعاعیں مجتمع ہو کر ایک طرز منتظم اکائی میں منضم ہو سکیں اور ایک مسلم الاعضاء جاندار وجود کی شکل میں متشکل ہو کر ایک طرف تو زندگی کے مظاہر میں اپنی فلاسفی کی کارفرمائی کا عمل شروع کر سکیں اور دوسری طرف اپنے ہر مدمقابل پر قریب سے شست باندھ کر موثر [illegible] کر سکیں۔

کارل مارکس (۱۸۱۸ء — ۱۸۸۳ء) پہلا شخص تھا جس نے ایسی ہی ایک کمین گاہ ڈھونڈ نکالی۔ اس نے [illegible] کے پورے سوشلزم نظریات کے لئے علمی بنیادیں فراہم کیں۔ اور اس کو ایک معروضی حقیقت کی حیثیت [illegible] کے سامنے پیش کیا۔

مارکس نے انسان کی پوری تاریخ کو اس کی معاشی کیفیات کا عکس قرار دے دیا۔ اس کی نظر میں قانون، مذہب، علوم و فنون، سیاسی ادارے اور معاشرتی آداب و رسوم یہاں تک کہ زبان اور اس کے مختلف اسالیب بیان بھی زندگی کے مادی تقاضوں اور مروجہ معاشی نظام کی ضروریات سے پیدا ہو کر نشوونما پاتے ہیں۔ معاشی نظام ہی وہ بنیاد ہے جس پر تمدن کی بالائی عمارت کھڑی کی جاتی ہے اور یہی وہ اساس ہے جس پر انسانوں کے باہمی تعلقات قائم ہوتے ہیں خواہ یہ تعلقات خانگی زندگی سے متعلق ہوں یا سیاسی اور معاشرتی زندگی سے۔

جی۔ ڈی۔ ایچ کول مارکس کے اس نظریے کی تشریح یوں کرتا ہے۔

"مارکس کے نزدیک ہر دور کے قانونی اور سیاسی نظامات اور وہ نظریات جو ان نظامات کی تشریح و تائید و حمایت میں قائم کئے جاتے ہیں، دراصل معاشی زندگی کی ضروریات سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ قوانین و ضوابط، سیاسی ادارے اور اخلاقی نظریات ان اصولوں اور معیاروں (Standards) کو مضبوط کرتے ہیں جن سے اس عہد کے معاشی نظام کو قائم اور برقرار رکھنے میں مدد ملتی ہے اور سوسائٹی کے عام معاشی حالات میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ ان کے اثرات ان سب پر لازمی طور سے مترتب ہوتے ہیں۔ کیونکہ معاشی تبدیلیاں نئی طبقہ پیدا کر

toobaa-elibrary.blogspot.com

کے استعمال کے نئے طریقوں سے روشناس کرکے انسان کو اس بات پر مجبور کرتی ہیں کہ وہ مادی اشیاء سے اپنے تعلقات کی نوعیت کو اور خود آپس کے باہمی تعلقات کی نوعیت کو بدلے اور اس کے مطابق اس سیاسی اور قانونی نظام میں تبدیلی پیدا کرے جو ان تعلقات کو متعین کرتا ہے۔[1]

اوپر کے بیان سے دو باتیں صاف ہو جاتی ہیں ایک یہ کہ مارکس کی رائے میں ذہنی افکار و تصورات مادی زندگی کے حالات سے پیدا ہوتے ہیں اور ان حالات کے قائم رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ پھر جب یہ حالات بدلتے ہیں تو انسانی فکر بھی اس تبدیلی سے مطابقت پیدا کرتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس عمل کی صورت یہ ہوتی ہے کہ قدرت نے انسانی ضروریات کی تکمیل کے لئے وسائل پیداوار کا جو لامتناہی خزانہ جمع کر رکھا ہے۔ اس کا استعمال انسان ہمیشہ کسی خاص طور پر سیکھتا ہے ہر نئی ایجاد یا دریافت پیداوار کے لامتناہی قدرتی وسائل میں سے بعض اپنے وسائل کے استعمال کا راستہ کھول دیتی ہے جس سے کام لینے اور جنہیں کارآمد بنانے کے طریقوں سے انسان اس وقت تک ناواقف ہوتا ہے۔ قدرتی وسائل سے بہرہ مند ہونے کے بعض نئے طریقوں انسان جب واقف ہو جاتا ہے تو اس کی یہی واقفیت کچھ اور مزید انکشافات کا سبب بنتی ہے حتیٰ کہ ایک خاص مدت گزرنے کے بعد جب اس طرح کے انکشافات و ایجادات سے انسان اچھی طرح اپنے گرد و پیش کے نئے وسائل کو استعمال کرنے کے قابل ہو جاتا ہے تو وہ مجبور ہوتا ہے کہ اس معاشی نظام میں تبدیلی پیدا کرے جس کے ماتحت اب تک وہ کام کر رہا ہوتا ہے کیونکہ پیداوار کے نئے طریقوں سے اسی صورت میں کام لیا جا سکتا ہے جب ان تعلقات کی نوعیت بدل جائے جو انسان اور اشیائے مادی نیز خود انسانوں کے مابین قائم ہیں موجودہ معاشی نظام کے اندر رہ کر نئے انکشافات اور معلومات سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ سوسائٹی کا رائج الوقت ڈھانچہ ان نئی قوتوں کے عمل کو قبول کرنے میں مزاحم ہوتا ہے۔ اس طرح سے پیداواری قوتوں میں اور حالات پیداوار میں وہ کشمکش رونما ہوتی ہے جس کی وجہ سے طبقوں کی ایک نئی تقسیم عمل میں آتی ہے اس کے ساتھ ہی سیاسی اداروں قانون اور اخلاقی تصورات اور طرز معاشرت میں انقلاب ناگزیر ہو جاتا ہے۔[2]

خلاصہ یہ نکلا کہ حیات انسانی کے کسی بھی شعبے میں جب کبھی کوئی انقلاب برپا ہوتا ہے اس کا اصلی سبب

---

[1] اشتراکیت اور نظام اسلام از محمد ظفر الدین صدیقی ص ۱۵۶

معاشی تغائب ہوتا ہے جس کے تحت کوئی تازہ دم نئی معیشت کسی تھکی ہاری پرانی معیشت کو دھکے دے کر خارج از کر دیتی ہے۔

مارکس کے اس نظریے میں مذہب کو کسی مستقل اور پائیدار حقیقت کی حیثیت حاصل نہیں بلکہ وہ دوسرے عوامل کی طرح حیات بدلتے ہوئے حالات کی پیداوار ہے جس کی کل تک اسی شکل میں باقی رہنے کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی ہے۔

مارکسیت وحی الٰہی اور الہام کی معروضی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتی۔ اس کا کہنا ہے کہ انسان کے خارجی تجربات ہی اس کے تمام علمی تصورات کا ماخذ ہیں۔ اس لئے وہ انسانی حواس و ادراکات کے سوا کسی ذریعۂ علم کو حقیقی تسلیم نہیں کرتی ہے۔

پروفیسر داس گپتا اس بارے میں لکھتا ہے:۔

علم کا سارا مواد جسے عالم مادی کے تجربات سے حاصل ہوتا ہے۔ مختلف تجربات کے باہمی تعامل سے نئے افکار و تصورات پیدا ہو سکتے ہیں جن کا علم ہے کہ ہمارے خارجی ادراکات سے کوئی تعلق معلوم نہ ہو۔ لیکن اگر ان افکار و تصورات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے سابقہ تجربات ہی میں سے کوئی نہ کوئی تجربہ ان کا ماخذ اور سرچشمہ ہے۔ الہام ربانی، افکار خالص اور وجدان علم کے ذرائع نہیں ہو سکتے یہ محض الفاظ ہیں۔ انسان کے تجربات جن کا کبھی وہ شعور رکھتا ہے اور کبھی نہیں رکھتا۔ لیکن جو اپنی زندگی کے سلسلے میں حاصل کرتا رہتا ہے اس کے تمام تصورات و نظریات کا مواد ہیں۔ جب وہ انہیں عملی دنیا میں گزار لیتا ہے۔ تو یہی تصورات و نظریات علمی حقائق بن جاتے ہیں ایک سائنسدان یا فلسفی اپنے علمی نظریات ان تجربات پر قائم رکھتا ہے جن کا وہ غیر شعوری طور پر حامل ہوتا ہے لیکن جس چیز کو الہام ربانی کہا جاتا ہے اس کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ کسی لطیف اور حساس ذہن میں اس کے غیر شعوری تجربات جگہ پا لیتے ہیں اور کسی تخلیقی عمل کے حصول میں اس کی رہنمائی کرتے ہیں جب کبھی یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ کوئی تصور خالص کسی تخلیقی عمل یا سائنٹیفک انکشاف کا سبب ہے تو ہوتا یہ ہے کہ خارجی تجربات کا کوئی ذخیرہ کسی ذہین شخص کی بالغ نظر اور اعلیٰ صلاحیت فکر کے

toobaa-elibrary.blogspot.com

کے ساتھ مل کر ایک نئی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔[1]

مارکسیت کے اندر ہر شے تغیرات کی آماجگاہ ہے اس لئے اس میں کسی دائمی صداقت کے ہونے کی گنجائش ہی نہیں۔ خدا، رسول اور آخرت جیسی تصورات جو تعبیر یا اختلاف اور کسی قدر کمی بیشی کے ساتھ تمام مذاہب کا جزو مشترک ہیں اس کے نزدیک لاشے محض ہیں۔ چنانچہ ان تصورات پر مبنی اخلاقی ضوابط بھی اس کے نزدیک خالی خولی ڈھانچے ہیں جن کے اندر کوئی حقیقی مواد کارفرما نہیں۔

مارکسیت کی شہ پا کر لبرلزم کو عمل سے گزر کر علم کی دنیا میں پنجے گاڑھنے کا موقعہ اور مذہبی افکار و اعمال کی بابت کھل کر بدیدہ دلیری کی جسارت پیدا ہوئی۔ اشتراکیت کے آوارہ خیالات بھی سمٹ سمٹ کر ماریت اور الحاد کی اس نئی بستی میں کھنچنے لگے۔ اور تھوڑی دیر ستانے کے بعد سکاری و عیاری کے نئے اسلحہ سے لیس ہو کر چار سُو غارت گری کے لئے نکلنے لگے۔

○

---

[1] اشتراکیت اور اسلام ص ۲۰۶۔

باب سوم

سوشلزم کی عملی سرگرمیاں

(۱)

جنگِ اقتدار

toobaa-elibrary.blogspot.com

سوشلزم ابھی یک فکر و نظر کے تناظر میں تشکیل کے مراحل سے گزر رہا تھا کہ پرولتاری انجمنوں کے قیام سے اس نے زندگی کے میدان میں جن سازی کی ابتدائی مشقیں شروع کی ہوئی تھیں لیکن کوئی ایک واضح نصب العین اور اس کے طریقہ و حصول کا تعین نہ ہو سکنے کے سبب ان مشقوں میں کوئی تسلسل اور نظم و نسق موجود نہیں تھا۔ جیسے کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ مارکس نے جہاں سوشلزم کو دلیل و برہان کی بنیادیں فراہم کیں وہاں اس کو ایک نصب العین اور اس کو حاصل کرنے کا لگا بندھا عملی پروگرام بھی عطا کیا۔ جس سے اس کی پریشان خیالی میں یک سوئی اور عملی جدوجہد میں انضباط پیدا ہوا۔

مارکس نے اپنے طور پر یہ طے کیا ہوا تھا کہ پرولتاری آمریت ہی سوشلزم کو پوری طرح سے نافذ کرنے کی ضامن ہو سکتی ہے اور اس آمریت کے قیام کے لئے "بورژوائی اقتدار" کا مکمل بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا ضروری ہے

۱؎ سوشلزم کی اصطلاح میں متوسط طبقہ "بورژوا" کہلاتا ہے۔ سوشلزم اس لئے بھی دشمن ہے اور اس کا استیصال اپنی بقا کا ستون کام کے لئے ناگزیر سمجھتا ہے۔ دراصل متوسط طبقہ کسی قوم کی ریڑھ کی ہڈی بھی ہوتا ہے اور دل و دماغ بھی یہی طبقہ اسے زندگی کے ہر میدان میں قیادت فراہم کرتا ہے۔ متوسط طبقہ جس قدر قوی اور با شعور اور با مستقل ہوگا قوم اسی طاقت ور اور منظم و مضبوط ہوگی۔ سوشلزم ..... یہودی تحریک ..... اسے اسی لئے دنیا کے کل شان جانتا ہے۔ غیر یہودی قومیں ذہین اور باشعور اور منظم و مضبوط قیادت سے محروم ہو جائیں۔ اس نظام میں پرانے لوگوں کو بنیادی اہمیت حاصل تھی اور کسی ایک انسانی سوسائٹی کے انتقاد کی بنیاد پر پرولتاری طبقہ تھا۔ یہودی دنیا کے تمام ممالک میں پرانے لوگوں کی حیثیت رکھتے ہوئے اس نظام میں پوری ساجھے داری کو اہمیت اس لئے دی گئی کہ انہیں حرص آمیز اور فریب کاروں کے ذریعے آسانی سے اپنے عام مفاد کے لئے استعمال کیا جا سکتا تھا چنانچہ جس معاشرے (یورپ کے عیسائی معاشرے) میں سوشلزم کا نظریہ متعارف کیا گیا وہاں پرولتاری طبقے کی بھاری اکثریت یہودیوں ہی پر مشتمل تھی۔ یورپ میں یہودیوں پر اعلیٰ و ادنیٰ سرکاری ملازمتوں اور تجارت کے دروازے صدیوں سے بند چلے آ رہے تھے اس لئے ان کی اکثریت یا تو دست کار اور کاریگر تھی یا مزدور اور محنت پیشہ (باقی اگلے صفحہ پر)

(صفحہ کے استحصال کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ مارکس آپس کی معاملانہ پالیسی اختیار کرنے کا قائل نہیں تھا اور نہ ہی اس سلسلے میں کسی آئینی یا جمہوری عمل پر یقین رکھتا تھا۔ بالفاظ دیگر وہ اقتدار یا تمتہ زور کے سوا کسی تیسری چیز پر بھروسا کرنا نہیں سیکھ رہا تھا۔

اس کے انہی مجوزہ خطوط پر منظم مارکسیت کا آغاز کیا۔ مارکسیت کے بہت سے ہم نواؤں نے نصب العین کے حصول کی کاریں اختلاف کی رو سے مختلف مرحلوں پر اس کا ساتھ دینا چھوڑ دیا۔ بلکہ اس کی راہ میں روڑے اٹکانے کی منصوبہ بندیاں کیں۔ لینن وہ اپنی دشمن کا بہت پکا ثابت ہوا، اور کسی موقع پر بھی ذہنی تردد یا عملی تعطل کا شکار نہیں ہوا۔ اس کی یہ عملی جدوجہد کچھ اس تفصیل کے ساتھ مرحلہ وار جاری رہی:

عالمی ارتباط کی مہم

انیسویں صدی کے نصف آخر میں عام طور پر مزدوروں اور ان کے رہنماؤں کو صنعتی نظام اور نظام حکومت کی طرف سے مایوسی ہو چکی تھی اور ان کے دلوں میں اس نظام سے ایک شدید جذبہ مخالفت پیدا ہوا۔ اس وقت یہ احساس شدت اختیار کر گیا کہ نظام سرمایہ داری کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکے کے بغیر عام انسانوں کی مادی فلاح

(صفحہ گزشتہ) اقتصادی انقلاب آیا تو یہودی کاریگر اور دست کار کارخانوں اور فیکٹریوں میں نوکر ہو گئے۔ اس طرح پرولتاری طبقہ وجود میں آیا۔ بالفاظ دیگر یورپ میں پرولتاری طبقے کی حکومت کا مطلب تھا یہودیوں کی حکومت چنانچہ سوشلسٹ تحریکوں کا بانی یہودی، پرولتاری دور پیش کرنے والا، یورپ میں اس طبقے کی قوت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ یہودی تحریک کے بانی ہر اں (Herzl) نے صہیونی سوسائٹیوں کو یہودی ریاست بنانے کے لئے سودا بازی کرنی چاہی تھی کہ وہ ترکی پر دباؤ ڈالے دیکھو کہ صفحہ ۱۰۰ حاشیہ

یہ تھا اصل تصور جس کے تحت انہوں نے اپنی تحریک کو آگے بڑھایا۔ اور اسی تصور کے تحت انہوں نے اپنے ہم نواؤں کو ہدایت کی کہ وہ اپنی تمام تر توجہ اور کوشش کو اپنے اس نصب العین کے حصول پر مرکوز کر دیں۔ اس کے علاوہ کسی اور چیز کی طرف توجہ دینا یا اس کے لئے کوشش کرنا ان کے نزدیک ایک ناقابل معافی جرم تھا۔ اس کے قریب سے دیکھا کہ اگر وہ اس مسئلے کو اپنے اختیار میں لے لیں تو یورپ میں سوشلسٹ اور ریڈیکل پروپیگنڈہ کی رو کو اس کا سب سے زیادہ بہت جرمنی تھا۔ ایک بات قیصر نے کوئی چیز دلانے سے تاخیر کی تو ہرزل نے اسے دھمکی دیتے ہوئے کہا اگر ہمارا مطالبہ جائز ہے تو ہم جہت میں سیکڑوں انقلابی تحریکوں کے ساتھ جا ملیں گے۔" انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۳ صفحہ ۱۰۰ (سوشلزم) یہودیت قومیں صفحہ ۸۶

toobaa-elibrary.blogspot.com

اور معاشی اطمینان کی صورت پیدا نہیں ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اس زمانے سے مزدوروں کی جدوجہد میں انقلابی رنگ نمودار ہونے لگا۔ ۱۸۴۸ء میں کارل مارکس اور انجلس نے اپنا مشہور اشتمالی منشور شائع کیا جس میں سرمایہ داری کا خاتمہ کرنے کی خاطر دنیا کے تمام مزدوروں کو دعوتِ اتحاد دی گئی تھی۔

اس اعلان کے بعد سے یورپ کے ہر ملک میں اشتراکی جماعتوں کا زور ہونے لگا۔ ۱۸۶۴ء میں مختلف ممالک کی اشتراکی جماعتوں کو متحد کرنے کی پہلی کوشش کی گئی۔ اور مزدوروں کی پہلی بین الاقوامی انجمن کا قیام عمل میں لایا گیا یہ انجمن "فرسٹ انٹرنیشنل" کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ اس کی قیادت کارل مارکس کے ہاتھ میں تھی۔ اسی زمانے میں جرمنی میں معاشرتی جمہوری پارٹی قائم ہوئی جو مارکس کے خالص اشتراکی اصولوں کی حامی تھی۔ لیکن جرمنی میں اس پارٹی کے مقابلے پر مزدوروں کی ایک اور جماعت بھی موجود تھی جس کا رہنما لاسال (LASSALE) تھا۔ فرانس میں فرسٹ انٹرنیشنل کو پرودھان اور بلانکی کے پیروؤں کا سامنا کرنا پڑا۔ پرودھان اور اس کے حامی نراجی ذہنیت رکھتے تھے اور بلانکی انقلاب برپا کرنے کے لئے عوام الناس کی تائید و اعانت غیر ضروری سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر ایک معتد بہ اقلیت بھی طبقاتی شعور و احساس سے بہرہ مند ہو جائے تو انقلابی اقدام کے لئے اور کسی امر کی حاجت نہیں۔

فرسٹ انٹرنیشنل کو صرف بیرونی حریفوں کا سامنا ہی نہ تھا بلکہ اس میں اندرونی اتحاد کی بھی کمی تھی انگلستان کی جانب سے جو نمائندے شریک تھے۔ وہ زیادہ تر انگریز مزدوروں کے انجمنوں کے رہنما تھے جو انجمنوں کے طریق کار کو اشتراکی مقاصد کے حصول کا بہترین ذریعہ سمجھتے تھے اور ان طریقوں کو براعظم یورپ میں پھیلانا چاہتے تھے۔ اس کے اطالوی نمائندوں میں سب سے زیادہ نمایاں شخصیت میزینی (MAZZINI) کی تھی جو ایک جمہوریت پسند تھا جو اطالیہ کی آزادی کے لئے لڑ رہا تھا۔ اور محض اس خیال سے اس بین الاقوامی انجمن میں شریک ہوا تھا کہ اس کے ذریعے اطالیہ کی جمہوری تحریک کے لئے بین الاقوامی تائید و حمایت حاصل کرے۔ روس کی طرف سے باکونین (BAKUNIN) فرسٹ انٹرنیشنل میں شریک ہوا۔ وہ ایک بڑی متحرک شخصیت کا حامل تھا لیکن وہ پکا نراجی اور خلیہ ساز تشکیلوں کے فن کا ماہر تھا۔ اس لئے کارل مارکس سے اس کی بعد دسکی باتوں کے مقاصد اور طریق کار میں بڑا اختلاف تھا۔ کارل مارکس کی قیادت کے باوجود اندرونی اور بیرونی مخالفت کے باعث فرسٹ انٹرنیشنل کی عمل جدوجہد کمزور پڑ گئی۔ ۱۸۷۲ء اور ۱۸۷۲ء میں نیویارک کو اس انجمن کا مستقر بنایا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ براعظم یورپ سے اس کا تعلق برائے نام رہ گیا۔ بالآخر ۱۸۷۶ء میں فرسٹ انٹرنیشنل کی

[illegible] کیا گیا

[illegible] ڈیسٹرکشنل کے خاتمے کے بعد براعظم یورپ کی بڑی ممالک کی حکومتوں کی جانب سے اشتراکی تحریک [illegible] مٹانے کی کوشش کی گئی چنانچہ روس میں اکثر اشتراکی لیڈروں کو قید یا جلاوطن کر دیا گیا۔ جرمنی [illegible] تو بسمارک کو کچلنے کے لئے متعدد سخت گیر قوانین رائج کئے گئے۔ اسی دوران میں جرمنی کی اشتراکی [illegible] مزدور یورپ کی سوشلسٹ جماعتوں میں سب سے زیادہ طاقتور اور موثر تھی، ایک نمایاں [illegible] قوانین نے سوشلسٹ کی انقلابی روح کو سخت نقصان پہنچایا۔

۱۸۹۰ء میں جرمن سوشلسٹ جمہوری پارٹی جو مارکس کے اصولوں پر قائم ہوئی تھی مسلسل کی جماعت سے مل [illegible] ایک ایسے منشور کی بنا پر عمل میں آیا جس میں دونوں فریقوں کے نقطہ نظر کی رعایت کی [illegible] یہ منشور "گوتھا پروگرام" کہلاتا تھا مارکس کو یہ مصالحت پسندانہ [illegible] اور اس نے گوتھا [illegible] پروگرام پر تنقید کی۔ واقعہ یہ تھا کہ مارکس اور لاسال کے درمیان نظریات کا بنیادی فرق تھا۔ لاسال [illegible] کا قائل تھا۔ اور ریاست و حکومت میں حکومت کی مداخلت کے ذریعے سے مزدوروں کے [illegible] میں اصلاح چاہتا تھا۔ اس کے برخلاف مارکس کا پروگرام یکسر انقلابی تھا اور وہ سرمایہ دار [illegible] سے مزدوروں کے لئے رعایت نہیں چاہتا تھا۔ بہرحال اس واقعہ کے بعد جرمنی کی معاشرتی جمہوری پارٹی نے قدیمی اشتراکیت کا مسلک اختیار کر لیا۔ اور اس کا انقلابی رنگ بالکل اڑ گیا۔ دوسرے [illegible] ممالک کے اشتراکی جماعتوں کا بھی کم و بیش یہی حال رہا۔

مزدوروں کی دوسری بین الاقوامی انجمن

(سیکنڈ انٹرنیشنل)

۱۹۰۱ء [illegible] انٹرنیشنل یا مزدوروں کی دوسری بین الاقوامی انجمن کا قیام عمل میں آیا۔ لیکن اس [illegible] کارل مارکس کے انقلابی پروگرام سے کوئی سروکار نہ تھا۔ کیونکہ اس کے لاکھوں زیادہ تر صنعتی [illegible] جماعتیں تھیں جنہوں نے انقلابی طریق کار کو چھوڑ کر آئینی طریق کار کو اختیار کیا تھا۔ یہ جماعتیں [illegible] کی پارلیمنٹوں میں [illegible] حاصل کر کے سرمایہ دارانہ نظام میں [illegible] کی [illegible] علاوہ ازیں ان پر قومی رنگ بہت غالب تھا۔ اور جو کچھ بین الاقوامیت ان میں [illegible]

toobaa-elibrary.blogspot.com

رہ گئی تھی وہ صرف اس حد تک تھی کہ یہ جماعتیں جنگ کی مخالف تھیں اگرچہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عالمگیر شروع ہو جانے کے بعد انہوں نے نظریات کو بالائے طاق رکھ کر اپنی قومی حکومتوں کا ساتھ دینے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔

مغربی یورپ میں کارل مارکس کے انقلابی طریق کار کو مقبولیت نصیب نہ ہو سکی۔ اور نہ اشتراکیت مغربی طبقات کا وہ بین الاقوامی اتحاد پیدا کر سکی جس کے متعلق مارکس اور اینجلس نے اشتہاری منشور میں پیشین گوئی کی تھی۔ مغربی یورپ کے اشتراکی پارٹیوں پر تدریجیت اور قومیت کا اثر غالب رہا۔ انگلستان میں اشتراکیت کو اتنا فروغ بھی حاصل نہ ہوا جتنا براعظم یورپ کے ممالک میں۔ کیونکہ وہاں مزدوروں کی انجمنوں نے ان کے مخصوص طریق کار نے ایک جداگانہ ذہنیت پیدا کر دی تھی جو اشتراکی اثرات کی ترقی میں مانع تھی۔ صرف روس ایک ایسا ملک تھا جہاں مارکس کے نظریات کو اور اس کے انقلابی طریق کار کو خوب فروغ ہوا اور اس کی بنا پر ایک زبردست انقلابی تحریک وجود میں آئی۔ لیکن مارکس کو اپنی زندگی میں اس انقلابی تحریک کی مقبولیت اور کامیابی دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔

روسی محنت کشوں کی بیداری

قرون وسطیٰ میں یورپ کے دیگر ممالک کی طرح روس میں بھی جاگیرداری نظام قائم تھا۔ اس نظام کی اساس نیم غلام کاشتکاروں کی محنت اور عرق ریزیوں کی رہین منت تھی۔ ۱۸۶۱ء میں جنگ کریمیا کے بعد روس میں نیم غلام کاشتکاروں کو آزادی دے دی گئی اور اس کا سبب یہ تھا کہ ان سے جو جبری محنت لی جاتی تھی وہ کچھ زیادہ بار آور ثابت نہیں ہوئی۔ بہرحال اس آزادی کے بعد کاشتکار اور زمیندار کا تعلق غلام اور آقا کا نہیں رہا۔ مگر اس سے کسانوں کو کوئی معاشی فائدہ حاصل نہیں ہوا کیونکہ زمینیں اب بھی زمینداروں کے قبضے میں تھیں اور کاشتکار جو اراضی کاشت کے لئے حاصل کرتے تھے۔ اس کا لگان انہیں جنس کی صورت میں ادا کرنا پڑتا تھا۔ جس کی مقدار پیداوار کا نصف تھا۔ اس لگان کے علاوہ کاشتکاروں کو محاصل بھی دینے پڑتے تھے جس کے بعد انہیں مشکل سے دو وقت کی روٹی میسر آتی تھی۔ زمینداروں کے ظلم ستم سے تنگ آکر اور محاصل کے بار سے مفلس ہو کر کسانوں نے بڑی تعداد میں گاؤں کی سکونت ترک کر کے شہروں میں آباد ہونے کی کوشش کی جہاں نئی نئی صنعتیں قائم ہو رہی تھیں۔ ان صنعتوں میں کسانوں

۱؎ اشتراکیت اور نظام اسلام

کی میشیت سے جذب کر لیا گیا۔ اس طرح سرمایہ داروں کو محنت کرنے والے مزدوروں کی ایک بڑی سستے داموں حاصل ہو گئی۔

نیم غلام کاشتکاروں کی آزادی کے بعد روس میں ۱۸۶۵ء اور ۱۸۹۰ء کے درمیان صنعتی سرمایہ داری کی اور فروغ ہوئی اور کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد سات لاکھ چھ ہزار سے چودہ لاکھ اور بیس ہزار ہو گئی۔ ۱۸۹۰ء کے بعد سے بڑے پیمانے کی صنعتوں کو اور زیادہ فروغ ہوا اور ریلوں کی تعمیر شروع ہوئی جس سے صنعت ملک کی اندرونی تجارت پر اچھا اثر پڑا بلکہ کوئلہ اور دھاتوں کی صنعتوں نے بھی ترقی کی۔

صنعت کی اس ترقی کے باوجود روس کی بیشتر آبادی زراعت پیشہ تھی جو قدیم طرز و رواج کے مطابق چھوٹے چھوٹے قطعات اراضی پر الگ الگ کھیتی باڑی کرتی تھی۔ کاشت کا طریقہ انفرادی تھا۔ اس سے پیداوار کا اوسط بہت کم تھا۔ چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں کے علاوہ روس میں مالدار کسانوں کی بھی ایک تعداد تھی جو (KULAK) کہلاتے تھے۔

سرمایہ داروں اور زمینداروں کی حکومت نے کام کرنے والے عوام پر بہت ظلم ڈھائے تھے۔ ۱۰۰،۰۰۰ زمیندار روس میں ۱۰۰،۰۰۰،۰۰۰ (دس کروڑ ستر لاکھ چالیس ہزار) ایکڑ زمین تھی اور ایک کروڑ کسانوں کے پاس ۱۰۰،۰۰۰،۰۰۰ (دس کروڑ ستر لاکھ دس ہزار) ایکڑ زمین تھی۔ پہلی جنگ عظیم سے پہلے ایک تجارتی ادارہ پروڈامٹ (PRODAMET) ملک کی آدھی فیصد سے زائد لوہے اور فولاد کی پیداوار کی تجارت پر قابض تھا اسی طرح رائل شیل (ROYAL SHELL) اور نوبل (NOBEL) کے تجارتی ادارے سارے تیل کی صنعت کے مالک تھے۔[1]

۱۹۱۴ء میں ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ آدمی فوج میں تھے جس کی وجہ سے دیہی علاقوں میں مزدوروں کی کمی واقع ہوئی اور تقریباً ایک تہائی کھیت نگرانی کے بغیر رہ گئے۔ پیداوار بہت کم ہو گئی۔ قرضہ بہت زیادہ بڑھ گیا۔ جنگ کے دوران بہت سے کسان غریب تر ہو گئے جب کہ مٹھی بھر کسان امیر تر ہو گئے۔[2]

۱۹۱۷ء میں روسی مزدوروں میں بیداری کے آثار پیدا ہونے شروع ہوئے کیونکہ ان پر سرمایہ داروں کے

---

[1] History of October Revolution P. 13

[2] P. 14

toobaa-elibrary.blogspot.com

مظالم بہت تھے ہو گئے تھے۔ روس کے کسی کارخانے میں اوقات کار سات سے بارہ گھنٹے سے کم نہ تھے۔ بچوں
بڑوں میں کام کے اوقات کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا اور عورتوں کو مزدوروں کے مقابلے میں بہت
کم اجرت دی جاتی تھی۔ کارخانوں کی طرف سے مزدوروں کو رہائش کے لئے جو مکانات ملتے تھے وہ بے
تنگ و تاریک ہوتے تھے۔ اکثر اوقات ایک چھوٹے سے کمرے میں بارہ بارہ مزدوروں کو رکھا جاتا تھا۔
انہیں اس بات پر بھی مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ اپنی مزدوریات کی اشیاء کارخانہ سے متعلق دکان سے خریدیں
بہاں انہیں ہر چیز دوگنی یا تین گنی قیمت پر فروخت کی جاتی تھی۔ ان حالات سے تنگ آکر مزدوروں نے
باہمی اتحاد و یکجہتی اور اشتراک عمل کو مؤثر بنانے کی غرض سے اپنی انجمنیں قائم کرنی شروع کیں۔
میں اوڈیسیا (ODESSA) کے مقام پر جنوبی روس کے مزدوروں کی انجمن قائم ہوئی۔ ۱۸۷۸ء میں سینٹ
روس کے مزدوروں کی انجمن کا قیام سینٹ پیٹرزبرگ میں عمل میں آیا۔ اس انجمن کا صدر دفتر جنیوا (جنیوا سوئٹزرلینڈ
(OBNORSKY) تھا جو وسطی یورپ کے معاشرتی جمہوری پارٹیوں کے کام اور مارکس اصولوں سے واقف
تھا۔ یہ انجمنیں بالیچ الوقت سیاسی نظام کا خاتمہ کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن ان کا فوری مقصد یہ تھا کہ مزدوروں کے
لئے اکثر ہی تحریر و تقریر، آزادی اجتماع، انجمن سازی اور دیگر سیاسی اور معاشرتی حقوق حاصل کرنے
جدوجہد کریں، اور اوقات کار میں کمی کرائیں۔

چنانچہ ۱۸۷۰ء کے بعد روس میں ہڑتالوں کا دور شروع ہوا۔

۱۸۷۱ء کی اصلاحات کے ذیل میں غالباً اہم ترین فیصلہ یہ تھا کہ یہودی دست کاروں، کالج کے گریجوئیٹوں
اور عدالتا تاجروں کو خالص روس میں رہنے کی اجازت دی گئی۔ اب تک یہ لوگ روس کے مقبوضہ علاقوں میں رہتے
تھے۔ روس پولینڈ میں ان کی بہت بڑی آبادی تھی۔[1] اس آبادی کو ایک خاص علاقے میں یک جا کر دیا گیا جو
جو تاریخ میں (Pale of Settlement) کہلاتا ہے۔ یہاں کے یہودی مشرقی اور وسطی یورپ میں
یہودیوں کی قیادت میں اٹھنے والی تحریکوں سے متاثر تھے۔ یہ لوگ جب اس اجازت کے تحت روس کے پایہ تخت

---

[1] روس میں یہودیوں کی آبادی دنیا میں سب سے زیادہ تھی۔ یہودی تجویز کے بانی، اسے پھیلانے اور اسکی راہ میں
سے کانٹوں کو ہٹانے اور اسرائیل کی ہمایت دلوں میں لانے والے سب روس کے مقبوضہ یورپی علاقوں کے یہودی
تھے۔ ان میں سے اکثر وہ تھے جنہوں نے بالشویک انقلاب لانے میں بھی حصہ لیا تھا۔

سرے بڑے شہروں میں پہنچے تو ان کو اپنے ساتھ لے کر آگے۔ کارخانوں، فیکٹریوں، یونیورسٹیوں
یلے حلقے اور سیل قائم ہو گئے۔ خفیہ جماعتوں نے مار دھاڑ، قتل و غارت اور دہشت پسندی کا بازار گرم کر دیا۔
۱۸۸۱ء میں الیگزینڈر دوم انہی یہودی دہشت پسندوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔ الیگزینڈر سوم (۱۸۸۱ء تا ۱۸۹۴ء) کے عہد میں
ہماعتیں وجود میں آگئیں۔ سوشل ڈیموکریٹک پارٹی جو بعد میں بالشویک اور پھر کمیونسٹ پارٹی کہلائی
سلسلے کی پیداوار تھی۔ یہ پارٹی پہلے پہل روس سے باہر ۱۸۸۳ء میں ایک گروپ کی صورت میں قائم ہوئی
ات اس گروپ کا لیڈر تھا۔ ۱۸۹۸ء میں اس نے روس کے اندر باضابطہ طور پر پارٹی کی بنیاد رکھی۔

زارِ شاہی استبداد کا سامنا

اس سے پہلے کہ روس میں سوشلزم کی انقلابی جدوجہد کا جائزہ لیا جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ زارِ شاہی
س کا مختصر سا تعارف پیش نظر رہے اور اس کی مستبدانہ کارروائیوں کی روئداد بیان کی جائے تاکہ اس کی مدد سے اس
ظام پر چیرہ دستیوں اور چار سو پھیلی ہوئی افراتفری کے مضمرات کو آسانی سے سمجھا جا سکے جس کی وسعتوں میں بالشویزم
کی انقلابی تحریک کو شوونما اور ارتقاء کا موقع ملا۔

اس وقت کا روس مغرب میں ٹرکی کی سرحدوں، بحر اسود کے ساحل سے شروع ہو کر مشرقی ترکستان (سنکیانگ)
منگولیا اور شمال میں سائبیریا کے سٹیپ کے میدانوں سے جنوب میں ایران و افغانستان کی سرحدوں تک پھیلا ہوا
تھا۔ یہ وسیع و عریض علاقہ مغربی ترکستان، افغانستان، شمالی قفقاز، ایدل اورال، کریمیا، شمالی آذربائیجان،
وسائبیریا کے مغربی اضلاع پر مشتمل تھا۔[1]

کشور کشائی کا جنون

زاروں کی اس عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ماسکووی کی اس چھوٹی سی ریاست سے
ہوئی تھی جو دریائے ماسکو کے کنارے آباد تھی۔ یہ ریاست ایگزینڈر نیوسکی کے بیٹے ایوان اول (۱۳۲۵ء تا ۱۳۴۰ء)
نے اپنے کچھ مغربی اور شمالی علاقے ہتھیا کر قائم کی تھی جس کا رقبہ پانچ سو مربع میل تھا۔[2]

---

[1] صفحہ پچھلے صفحہ میں ہے۔ [2] روس میں مسلمان صفحہ ۳۴۰

toobaa-elibrary.blogspot.com

آئیوان اول کے بیٹے سائمن (۱۳۴۱ء - ۱۳۵۹ء) نے ماسکو کی حدود پھیلانے اور گرد و پیش کے علاقے فتح کرنے کا کام جاری رکھا۔ سائمن کا بیٹا دیمتری (۱۳۵۹ء - ۱۳۸۹ء) باپ سے بھی بڑھ کر حوصلہ مند تھا۔ اس نے اپنی ریاست کو مزید وسعت دی۔ لیتھوانیوں کے حملے کامیابی سے روکے اور تاتاری مسلمانوں کے خلاف کامیابی حاصل کی۔ ۱۳۸۰ء میں دریائے ڈان کے کنارے تاتاریوں کے ساتھ تصادم میں ماسکو نے پہلی مرتبہ بڑھتی ہوئی قوت کا مظاہرہ کیا۔ تاہم دیمتری اس تصادم کو اپنے منطقی انجام تک نہ پہنچا سکا۔ تیمور کے حملے نے اسے دریائے اوکا (وولگا) کے مشرق اور جنوب کی جانب بڑھنے سے روک دیا۔ ماسکو نے اب مغرب کی طرف بڑھنا شروع کیا۔[1]

۱۴۴۲ء سے ۱۵۰۵ء تک کا زمانہ روس کی تاریخ میں نقطۂ تغیر سمجھا جاتا ہے۔ یہ آئیوان سوم کا دور حکومت تھا جس کے عہد میں ماسکو کی مختصر سی جاگیر بہت وسیع سلطنت بن گئی۔ اس کارنامے کی بنا پر آئیوان سوم، آئیوان اعظم (IVAN THE GREAT) کہلاتا ہے۔ وہ ماسکو کا پہلا حکمران تھا جس نے زار، قیصر کا لقب اختیار کیا۔ آئیوان سوم نے اپنی مختصر سی سلطنت جدید خطوط پر استوار کی۔ فوج کو از سر نو منظم اور آتشیں اسلحہ سے مسلح کیا۔ اور پھر اس کا اقتدار آکاس بیل کی طرح گرد و پیش کے علاقوں میں پھیلنے لگا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کریمیا اور ملک کی ازبک سلطنت افتراق و تفرقت کا شکار ہو رہی تھی۔ مغربی علاقے میں تین سلطنتیں قائم ہو چکی تھیں، استرخان اور کریمیا قائم ہو چکی تھیں مشرقی علاقے میں قازق تھی۔ آئیوان سوم نے قانان کو خراج دینے سے انکار کیا۔ ۱۴۷۳ء سے ۱۵۴۹ء تک ۷۶ برس کے عرصے میں ماسکو اور قازق کے درمیان بہت سی لڑائیاں ہوئیں۔ آخر آئیوان چہارم (Ivan the Terrible) نے ۱۵۵۲ء میں قازق سلطنت کو فتح کر لیا۔[2] سویڈن کے فوجی مہمجروں کی مدد سے قانون پر غلبہ حاصل کر لینے کے بعد روسی افواج دریائے ایدل (وولگا) اور اورال کے پورے علاقے پر چھا گئیں۔ ۱۵۵۶ء میں روس نے استرخان پر بھی قبضہ کر لیا۔[3]

اس کے بعد روسی افواج نے سائبیریا کا رخ کیا۔ سائبیریا اس وقت وہ تاتاری خوانین سلطان یادگر اور کشم خان کی زیر نگاہ بنا ہوا تھا۔ ۱۵۵۸ء میں آئیوان چہارم نے نوورگرڈ کے ایک متمول تاجر گریگوری سٹراگانوف کو سائبیریا کا بہت بڑا علاقہ برائے نام ٹیکس پر بخش دیا۔ سٹراگانوف نے اپنے ہمسایوں پر مشتمل ایک چھوٹی سی

---

[1] ماسکو میں سلطانوی ص ۳۲۴ [2] روس میں مسلمان قومیں ص ۳۰

باقاعدہ فوج بنائی اور مسلمانوں پر دست درازیاں شروع کر دیں۔ بخارا کے امیر عبداللہ خان نے کشم خان کو اپنا مددگار سمجھا، یا کہ وہ کافروں کا مقابلہ کرنے کے لئے مقامی خوانین کے ساتھ امن و صلح سے رہے۔ لیکن کشم خان نے ان پند و نصیحت پر کان نہ دھرے۔ وہ اپنے ہمسایوں کو تر نوالہ سمجھتا رہا۔ اس دوران میں اس کے سب سے قوی دشمن اس کی مملکت میں قدم جما چکا تھا۔ کشم خان اور اس کے بیٹوں علی خان اور ایشم خان روسیوں کو سائبیریا سے نکال باہر کرنے کے لئے چالیس برس تک جدوجہد کرتے رہے لیکن ناکام رہے۔ ۱۸۹۸ء میں یہ آخری مسلمان سلطنت بھی صفحۂ ہستی سے مٹ گئی۔[1]

اٹھارہویں صدی میں کوہستان اورال سے تن شان تک اور سائبیریا سے ترکستان کے اطراف تک پھیلے ہوئے وسیع و عریض میدانوں (STEPPES) روس کے جاہ و حشم عزائم کی جولانگاہ بنے ہوئے تھے۔ یہ میدان بدوش قازق قبائل کی ملکیت تھی۔ یہ قبائل چار لشکروں سے تعلق رکھتے تھے جو ہر وقت بہترین مرغزاروں پر قبضہ کرنے کے لئے آپس میں لڑنے بھڑنے میں مصروف تھے۔ ادھر مغربی منگولیا کے بدھ جنگاری قبائل ان پر تخت کئے ہوئے تھے۔ روسی سامراج کے لئے اس سے بہتر وقت اور کیا ہو سکتا تھا۔ وہ جنوب اور مشرق کی طرف بڑھا اور کسی بڑی مزاحمت کے بغیر ۱۸۱۹ء تک بہت بڑے علاقے پر قبضہ ہو گیا۔ اس زمانے میں جنگاری اور کالمک قبائل کے حملے تازقوں پر سنگین صورت اختیار کر گئے۔ انہوں نے روسیوں سے تحفظ کی درخواست کی۔ روسیوں نے اس عداوت پر آمادگی ظاہر کی۔ ۱۷۴۳ء تک چاروں لشکروں کی حفاظت میں آ چکے تھے۔ یہی حفاظت بتدریج ان قبائل کی غلامی میں تبدیل ہو گئی۔[2]

استرخان پر قبضہ کرنے کے بعد کریمیا روسی سامراج کی ہوسناک نگاہوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ یہاں کے تاتاری قبائل اپنی آزادی کے لئے روسیوں سے تقریباً دو سو سال تک نبرد آزما رہے۔ تاتار خان کریم گیری نے کئی مرتبہ روسیوں کے دانت کھٹے کئے۔ آخر ۱۷۷۴ء میں کوچک قائنرجی کا معاہدہ طے پایا جس کی رو سے عثمانی سلطنت اور روس دونوں نے کریمیا کو آزاد ریاست تسلیم کر لیا۔ لیکن یہ نام نہاد آزادی کریمیا کو ترکوں سے کاٹ دینے اور اپنی تائید و حمایت سے محروم کر دینے کا حربہ تھی۔ کریمیا کے خان محلاً روسی زاروں کے کٹھ پتلی بن گئے۔ ان کے خلاف تاتاری مسلمانوں نے پہلے ۱۷۷۸ء اور ۱۷۸۲ء میں بغاوت کی جسے دونوں مرتبہ روسی فوجوں نے کچلا۔ آخر ۱۷۸۳ء

---

[1] روس میں مسلمان قومیں ص ۳۰۸-۳۰۹ [2] ایضاً ص ۳۰

toobaa-elibrary.blogspot.com

روسیوں نے پورا علاقہ باقاعدہ روسی سلطنت میں شامل کر لیا۔[1]

اب روسی سامراج داغستان کی طرف بڑھا۔ داغستان کی جنگیں روسی سامراج کے مقابلے میں مسلمانوں کی مزاحمت کا حیران کن اور عظیم الشان نمونہ ہیں۔ اہل داغستان ۱۵۹۲ء سے ۱۸۵۹ء تک ملک کے چپے چپے کے لئے جنگ کرتے رہے۔ داغستان کی مزید یہ تحریک نے تقریباً ۵۰ سال تک روسی سامراج کا مقابلہ امام شامل آخری دینی رہنما تھے جنہوں نے ۱۸۳۴ء سے ۱۸۵۹ء تک مسلسل ۲۵ برس روسیوں سے جنگ اور انہیں تگنی کا ناچ نچاتے رکھا۔ روس کے ایک فوجی مورخ جنرل تاریخیف نے داغستان کی لڑائیوں کے بارے میں لکھا:

"کوہستانی قفقاز کے باشندوں کے ساتھ لڑائی میں ہمیں اتنے لشکر سے ہاتھ دھونا پڑے جو ہندوستان سے جاپان تک پھیلے ہوئے ملک کو فتح کرنے کے لئے کافی تھا۔"[2]

امام شامل ان کے اہل خاندان اور مٹھی بھر ساتھی جو زندہ بچ رہے تھے گرفتار کر لئے گئے اور داغستان کی عظیم الشان اور طویل مزاحمت کے بعد روسی سامراج کا غلام بن گیا۔[3]

اٹھارہویں صدی عیسوی میں روسی سامراج نے آذربائیجان میں اپنے پنجے گاڑھنے شروع کئے۔ روسی سامراج نے یہاں کے دیہاتی حکمرانوں میں انتشار اور عدم اعتماد کا بیج بویا اور پھر ایک ایک کر کے روس میں مدغم کر دیا۔[4]

قازان اور استرخان پر قبضہ کرتے ہی روسی سامراج نے معروبی ترکستان پر بھی دست درازیاں شروع کی تھیں۔ اٹھارہویں صدی میں جب ترکستانیوں کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی اور مقامی ریاستیں باہمی منافشت میں الجھ گئیں تو ۱۷۸۱ء میں روس نے سائبیریا اور اورنبرگ کی طرف سے بخارا کی ترکستانی تقریباً سو برس تک کامیاب مزاحمت کرتے رہے۔ ۱۸۶۴ء میں روس نے چمکند پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۶۵ء میں تاشقند فتح کر لیا۔ اس کے دو سال بعد بخارا پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۶۸ء میں سمرقند بھی ترکستانیوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ۱۸۷۳ء میں خیوا نے دم توڑ دیا۔ ۱۸۷۵ء میں روسی خوقند پر چڑھ دوڑے۔ اور ایک زبردست جنگ کے بعد ترکستان میں ملت اسلامیہ کا آخری مضبوط حصار بھی سرنگوں ہو گیا۔ اب وہ ترکستان کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ آخری بڑا شہر تھا جو

---

[1] روس میں مسلمان قومیں ص ۳۹ [2] جنرل تاریخیف کا اقتباس، مجلہ قفقاز سیریز ۱۸۶۲ء جلد ۱ صفحہ ۶ ص ۹

[3] " " ص ۴۱، ۴۲ [4] روس میں مسلمان قومیں ص ۴۲، ۴۳ بالاختصار

سمرقند میں روسیوں کے ہاتھ لگا۔ ۱۸۸۵ء تک روس پورے مغربی ترکستان پر مستقل ہو چکا تھا۔ قازق اور فرغانہ کو اس نے براہ راست اپنا صوبہ بنا لیا۔ بخارا اور خیوہ کی ریاستیں برقرار رکھیں اور انہیں زیر حمایت طاقتوں کی حیثیت دی۔ اس طرح سوا تین سو برس کے اندر اندر اسکووی کی بے پایہ جاگیر ایک زبردست سامراجی قوت بن گئی۔

مذہبی عدم رواداری

روسی قیصریت نے ملک گیری کے شوق میں جن درجنوں کے علاقوں پر قبضہ کر لیا، مزاحمت کرنے والوں میں سے لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور لاکھوں کو اپنا وطن چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ باقی ماندہ لوگوں کے ساتھ اس کا کیا سلوک رہا۔ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لئے زار شاہی روس کی دینی، سیاسی، معاشرتی اور معاشی ترجیحات کا سرسری مطالعہ ہی کافی ہو گا۔

زار روس یوں تو اپنی ساری رعایا کا شہنشاہ تھا لیکن وہ آرتھوڈکس کلیسا کا محافظ بھی تھا۔ چنانچہ تمام لوگوں پر کلیسائی سلوک کے دعووں کے باوجود آرتھوڈکس کلیسا کے پیروکار ترجیحی سلوک کے مستحق قرار پاتے۔ لیکن اس پر بھی غنیمت آرتھوڈکس کلیسا کی اس مذہبی عدم رواداری کی سرپرست بھی تھی۔ جس کی بدولت دوسرے مذہب کے لوگوں کو تبدیلی مذہب پر مجبور کیا جاتا تھا۔ چونکہ روسی مقبوضات کے زیادہ تر باشندے مسلمان تھے اس لئے انہی کے مذہب و تاریخ کو بدلنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی گئی۔ مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی اہم ہی حکومت کا کتنا حصہ تھا اس کا اندازہ کرنے کے لئے ہشتے نمونہ خروارے

ایدل اورال کے تاتاری علاقے میں اس مہم کی تفصیلات خود روسی حکومت کی رپورٹ میں سنیئے:۔

اس علاقے پر روس نے ۱۵۵۲ء میں قبضہ کیا۔ ۱۵۵۵ء میں ایک روسی بشپ گوریئیں نے عیسائیت پھیلانے کا کام شروع کیا۔ تاتاریوں نے اس کی شدید مزاحمت کی۔ انتظامیہ نے مقبوضہ سرگرمیوں کو ہر ممکن تقویت پہنچائی۔ ۱۵۶۰ء میں تاتاریوں نے بغاوت کر دی جو ناکام رہی۔ اس ناکامی کے بعد حکومت نے تاتاریوں کو جو عیسائیت قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے شہر قازان میں رہنے کی ممانعت کر دی اور شہر کی مسجدیں یا تو

---

[5] روس میں مسلمان قومیں ص ۴۳، ۴۴

toobaa-elibrary.blogspot.com

بند کر دیں اور بالآخر ۱۵۹۳ء میں فرمان جاری کیا گیا کہ تاتاریوں کی تمام مسجدیں مسمار کر دی جائیں۔ اور آئندہ حکومت روس کی اجازت کے بغیر کوئی مسجد تعمیر نہ کی جائے لیکن تاتاری اپنے دین کے وفادار رہے[1]

تاہم مشنریوں نے حکومت کی پشت پناہی میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں تاتاری مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی نت نئی تدبیریں اختیار کی جاتی رہیں۔ چنانچہ روسی حکومت نے وقاف پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح بے شمار مسلمان اور مدرسے مالی وسیلے سے محروم ہو جانے کے باعث بند ہو گئے۔ مقصد یہ تھا کہ تاتاری بچوں کو دینی تعلیم نہ ملے گی تو وہ عیسائیت کو آسانی سے شکار ہو سکیں گے۔ ۱۷۱۳ء میں پیٹر اول نے ایک اور فرمان جاری کیا کہ جو غیر روسی چھ مہینے کے اندر عیسائیت قبول نہ کریں گے ان سے ارضی چھین لی جائے گی[2]

تبدیلی مذہب کے سلسلے میں یہ جبر و ظلم صرف مسلمانوں کے مقابلے میں روا نہیں رکھا جاتا تھا بلکہ خود عیسائیت کے دوسرے فرقے بھی اس سے محفوظ نہیں تھے۔ یعقوبیا کے سرحدی علاقے میں زیادہ تر کیتھولک فرقے کے پیرو آباد تھے۔ یہاں ۱۸۴۹ء میں وہ اتحادی کلیسا کو ختم کر دیا گیا۔ یوکرین کے علاقے کو لیں میں اسے ۱۸۷۵ء میں نابود کر دیا گیا اور اس کے پیروکاروں کو آرتھوڈکس کلیسا میں واپس لے لیا گیا انیسویں صدی کے پچھلے عشرے میں لیتویا اور استونیا کے کئی ہزار پروٹسٹنٹ عیسائیوں کو آرتھوڈکس کلیسا کے عقائد تسلیم کرنے پر مجبور کیا گیا۔ روسی آرتھوڈکس پادریوں نے جارجیا کے علیحدہ کلیسا پر کنٹرول حاصل کرنے کی بھی کوشش کی۔ یہ مرقابل ذکر ہے کہ عظیم پیٹر کے زمانے سے ہی افسر شاہی نے کلیسا کے معاملات میں دخل دینا شروع کر دیا تھا۔ پیٹر نے جو دینی سینٹ قائم کی تھی اس کا سربراہ ایک عام افسر ہی تھا۔ اس لئے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ لوگوں کے مذہب تبدیل کرنے کی تحریکوں میں کلیسا سے زیادہ حکومت کا ہاتھ تھا۔ روس کے دو آخری شہنشاہوں الیگزینڈر سوئم (۱۸۸۱ء تا ۱۸۹۴ء) اور نکولس دوئم (۱۸۹۴ء تا ۱۹۱۷ء) کے بارے میں یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ وہ کلیسا کی عدم رواداری کی پالیسی کے متقاضی تھے[3]

جنگل کا قانون - سیاسی طور پر زار شاہی روس میں جنگل کا قانون نافذ تھا۔ روس کی وسعتیں یا ضمیر

---

[1] Sergie A Zinkovsky : Pan Turkism & Islam In Russia (1960) P. 15

[2] روس میں مسلمان قومیں ص ۱۵۔ [3] الیگزینڈر سولژنیتسن، مترجم حمیدی، ص ۲۴

روسی قوم کے لئے بڑی تک تھیں یہاں کسی کو حکومت کی پالیسیوں پر جائز تنقید کرنے کا حق بھی نہیں تھا۔ رعیت بیشتر زر خرید غلاموں کی تھی جس کو ہر وقت زار شاہی کے سامنے دست بستہ کھڑے ہونے کے سوا کی چارہ کار نہ تھا۔ ترکستان کے فاتح جنرل کافمین نے ایک موقع پر علان کیا کہ روس سب سے بڑا حاکم ہے جسے نے اپنی مسلمان رعایا پر حکومت کرنے کے لئے مبعوث کیا ہے اور اس کے دنیوی نمائندے کو زر جنرل کو وہ تمام خصوصی اختیارات دیے ہیں جو خلفاء راشدین استعمال کیا کرتے تھے[1]

ایک روسی جنرل ابراخوف نے اپنے ماتحت حکام کو یہ ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ مقامی لوگوں پر کسی جماعت میں بھی رحم کریں۔ ان پر سیاسی کوڑے برسائے ہیں اور انہیں ہر وقت روسی طاقت سے مرعوب رکھیں۔ تاکہ وہ روسی برتری کے سامنے سرنگوں رہیں اور اس کے خلاف آواز تک نہ اٹھا سکیں[2]

روسی حکام کو مقبوضہ مسلمان علاقوں میں غیر محدود اختیارات حاصل تھے یا غیر اختیارات ضلعی افسر سے لے کر گورنر جنرل تک ہر سطح پر ایک ہی ہاتھ میں مرکوز تھے۔ مثلاً ضلعی افسر پولیس کا سربراہ، ضلع میں متعین فوجی دستوں کا کمانڈر، دیسی عدالتوں کا پریذائیڈنگ جج، جسٹریٹ اور ضلع کا منتظم اعلیٰ ہوتا تھا۔ گورنر جنرل کو قانون سازی حکم و نسق برقرار رکھنے، معافی دینے اور ہمسایہ ریاستوں سے جنگ و صلح کا اعلان کرنے کے مکمل اختیارات حاصل تھے۔ ان اختیارات کو حکام حسب خواہش استعمال کرتے اور کوئی احتساب کرنے والا نہ تھا[3]

سیاسی ظلم و ستم کا پورا پورا اندازہ ۲۲ جنوری ۱۹۰۵ء کے اس واقعہ سے ہوتا ہے جس میں ہزارہا مزدور پادری گیپن (GAPON) کی قیادت میں زار کے محل کے سامنے جمع ہوئے اور اپنے ہاتھوں میں عرضیاں لیے ہوئے تھے جن میں عام مسلم کی تصاویر لئے ہوئے درخواست پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ انہیں شہری آزادی دی جائے، معقول اجرت دی جائے، ایک عام اور مساوانہ انتخاب کے ذریعے ایک دستور ساز اسمبلی قائم کی جائے۔ لیکن درخواست کو منظور کرنا تو کجا اس کو پیش کرنے کا موقعہ ہی نہیں دیا گیا۔ اور نہتے مزدوروں پر گولیاں چلائی گئیں جس کے نتیجے میں ایک ہزار سے زائد مزدور ہلاک ہوئے اور دو ہزار سے زائد زخمی ہوئے[4]

---

[1] Mission to Turkestan OP Cit P.P. 49 50

[2] ہفت روزہ ترجمان کراچی جنوری ۱۹۵۱ء۔ مقالہ ترکستان روس کے پنجہ استبداد میں از علم الحق ترکستانی

[3] Lenin Selected Works Vol. I P. 788 [4] Mission to Turkestan OP Cit P 142

toobaa-elibrary.blogspot.com

دوسیعیت کا دیوتا

روسی سلطنت میں روسیت کا دیوتا پوجا جا رہا تھا۔ یہاں کے باشندے روسی اور غیر روسی کے دو طبقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ اول تو فقط شاہی خاندان کو تمام تر تقدسات اور ترجیحات حاصل تھیں۔ روسی سلطنت میں کوئی بھی اس کا شریک و سہیم نہ تھا لیکن بعد ازاں پوری روسی قومیت کو اس امتیاز سے نوازا گیا۔ اور اس کو غیر روسیوں کے مقابلے میں خاصے امتیازات حاصل ہوتے۔ اولیانا آنا کے گورنر جنرل سامونوف نے ایک مرتبہ اپنے اہل کاروں کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

"روسی کسان اور مزدور خواہ وہ چور اور ڈاکو ہی کیوں نہ ہو، شریف اور معزز ترک شہری کے مقابلے میں زیادہ عزت کا مستحق ہے۔ اور زیادہ حقوق رکھتا ہے۔"[1]

اس شخص نے اپنی اور زار کی تصویر اولیانا آنا کی جامع مسجد میں آویزاں کر رکھی تھی۔ ایک اور گورنر جنرل مارٹنس نے فرمان جاری کیا کہ جب کوئی افسر خواہ وہ کسی محکمے اور عہدے کا ہو، راستے سے گزرے تو ہر ترکستانی اپنی جگہ پر ٹھہر جائے، سیدھی اور گردن خم کر کے دست بستہ کھڑا ہو جائے۔ اسی گورنر جنرل نے یہ حکم بھی نافذ کیا کہ کوئی ترکستانی کسی پارک میں داخل نہیں ہو سکتا۔ جنرل کروپاٹکن (Kruptkin) ترکستان میں زارشاہی کا آخری گورنر جنرل تھا۔ اس نے ظلم کی انتہا کر دی۔ شمال مشرقی ترکستان کے کرغیز اور قازق کی رہی سہی زمینیں زبردستی چھین کر روسیوں کو دے دیں اور جب ترکوں نے پُرامن احتجاجی مظاہرہ کیا تو اس نے مظاہرین کے قتل عام کا حکم دے دیا۔ اس قتل عام میں تقریباً ۱۵ ہزار ترک مارے گئے۔[2]

مغربی ترکستان میں روسی زاروں کا دور استبداد ۴۲۰ سال پر محیط تھا۔ اس عرصے میں چند بغاوتیں بڑے وسیع پیمانے پر ہوئیں۔ یہی کیفیت ایسل وراں داغستان اور کریمیا کی تھی۔ روسی سامراج اپنے راؤلشکر اور ہتھیاروں کی قوت سے اگرچہ ہر بغاوت کو کچلنے میں کامیاب رہا مگر وہ راکھ کی آگ سرد ہو سکی اور نہ خاکستر میں دبی ہوئی چنگاریوں کی طرح دوبارہ بھڑک اٹھنے کے لیے موقع کی منتظر رہی۔

انیسویں صدی کے آخر میں روسیانے کی پالیسی پر عمل شروع کیا گیا۔ اس پالیسی کا محور و مرکز یہ تصور تھا کہ زار کی دوسری رعایا کے مقابلے میں روسی افضل و برتر ہیں اور زار کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ روسیوں کو دوسرے

---

[1] ماہنامہ ترجمان، کراچی جنوری ۱۹۶۵ء مقالہ ترکستان روس کے بیوروکریٹ استبداد میں۔ از اعظم کاشغری ترکستانی

[2] ایضاً

پر ترجیح دے۔ ۱۹۰۵ء کے انقلاب کے بعد کچھ عرصے تک تمام غیر روسی اقوام کو نسبتاً زیادہ آزادی حاصل ہو گئی۔ لیکن ۱۹۰۷ء کے بعد روسیانے کی مہم دوبارہ زور شور کے ساتھ شروع ہو گئی۔ اس دفعہ زیادہ تر روسی زمینوں پر اس تحریک کا رخ روس تھا۔ اس نے جو نیم آمرانہ اور نیم دستوری نظام وضع کیا اس کا اساسی نظریہ یہی روسیت تھی۔[1]

روسیت یا روسی قوم پرستی کا جنون سب سے زیادہ یوکرین، سفید روس، لیتھونیا، بسارابیا اور پولینڈ کے یہودیوں کے خلاف کارفرما نظر آیا۔ مزدوروں، محنت کشوں، کسانوں اور نچلے متوسط طبقے کے بعض حصوں کے یہودیوں پر تسلط و غارت گری اور لوٹ مار کا استاد بنیادی طور پر اتنے روسی نہیں تھے جتنے کہ مذکورہ علاقوں کے مقامی باشندے۔ ۱۹۰۵ء میں یہ ہنگامے اور قتل و غارت گری روسی قوم پرستی کا مظہر نہیں تھے۔ بلکہ یہ زار اور جاگیرداروں کے مخالف طبقوں کے جذبات کا رخ یہودی سرمایہ داروں کی جانب موڑ دینے کی ایک سوچی سمجھی سازش تھی۔ یہودی سرمایہ داری اور تمول کی علامت تھے۔ لوگوں کو یہ تاثر دیا گیا کہ وہ محض یہودیوں کے استحصالی ہتھکنڈوں کا نشانہ بننے کی وجہ سے غربت و افلاس کا شکار ہیں۔ چنانچہ سماجی انقلاب کی عوامی خواہش کا رخ یہودیوں سے نفرت کا روپ دھار لیا۔ وہ یہودیوں کو تباہ کرنے لگے۔ اور محکوم قومیتوں کا روسی حکمران طبقات سارا غصہ یہودیوں پر نکلنے لگا۔ یہودی قربانی کا بکرا بنے اور روسی سرمایہ دار عوامی غیظ و غضب سے محفوظ رہا۔ یہی وجہ تھی کہ روسی پولیس نے یہودیوں کے خلاف ہنگاموں کی حوصلہ افزائی کی۔ اسی طرح کے شدید فسادات برپا کر دیے گئے۔ باکو میں کئی قومیتیں آباد تھیں۔ یہاں یہودیوں کی بجائے آرمینیائی عیسائیوں کو عرب اور پسماندہ آذری ترکوں کے غیظ و غضب کا نشانہ بننا پڑا۔ اس ترقی پذیر شہر کی آبادی کا بڑا حصہ مزدوروں اور محنت کشوں کی اکثریت تھی۔ روسی شہنشاہیت کے آخری برسوں میں اس کو بعض علاقے میں آذربیوں کے ہاتھوں آرمینیائی باشندوں کی غارت گری اور آرمینیائی باشندوں کی آذری ترکوں پر حملے آئے دن کا معمول بن گیا تھا۔ اور روسی حکام اسے ناپسندیدگی کی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔[2]

معاشی استحصال۔ روس میں اقتصادی لوٹ کھسوٹ کی گرم بازاری تھی جس سے معیشت

---

[1] ریوولیوشنری ایشین وائسز ص ۳۲، ۳۳ [2] ایضاً

toobaa-elibrary.blogspot.com

کا استحصال و تعاون ناقابل اصلاح حد تک بگڑ گیا تھا۔ ایشیائی مقبوضات میں روسی اور مقبوضہ یورپی عوام کے نوآبادکاروں کو حکومت کی سرپرستی میں لا بسانے کی کوشش کی گئی۔ اس سے سائبیریا، ایل اور اس کریمیا میں تاتاری مسلمان جو کبھی غالب اکثریت میں ہوا کرتے تھے اقلیت میں تبدیل ہو گئے۔ اس کے بعد باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ نوآبادکاروں کے اس سیلاب کا رُخ قازق اور ترکستان کی جانب پھیر گیا۔ کوہستان اورال سے فرغانہ کی سرسبز وادیوں تک روسیوں اور غیر روسی یورپین کے گاؤں آباد ہو گئے۔ یہ نوآبادکار جہاں بھی گئے زرخیز زمینیں مسلمان مالکوں سے چھین کر انہیں دی گئیں۔ سینٹ پیٹرسبرگ (حاکم اعلیٰ حکومت) سے احکام جاری کیے گئے تھے کہ نوآبادکاروں کے لئے زمین مہیا کرو۔ ان احکام کی تعمیل میں حکام اپنی صوابدید کے مطابق منصوبے بناتے۔ نوآبادکار خود بھی گوناگون ہتھکنڈے استعمال کرتے۔ یہ تو ایک مصیبت تھے۔ روسی پہلے معمولی کرایہ پر زمین لیتے اور پھر اس پر قبضہ کر لیتے۔ ترکستان میں جو لوگ آباد کئے گئے وہ کسان تھے نہ مزدور۔ بلکہ وہ لوگ تھے جو روس میں مختلف حالات کی بنا پر مفلس و قلاش ہو چکے تھے۔ روسی حکومت انہیں طرح طرح کے حیل اور فریب دے کر ترکِ وطن پر آمادہ کرتی، شاندار مستقبل کے سپنے دکھاتی، کبھی انہیں وہاں سونے کے پہاڑ ملیں گے۔[1]

ان نوآبادکاروں نے زرخیز اراضی ہی پر نہیں ریشم کی صنعت اور معدنیات کی کانوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ یہ لوگ ان نوآبادیات کے گوناگوں ہتھکنڈوں سے لوٹتے تھے۔ سامراجی افسروں کی بڑی بڑی تنخواہیں تھیں بخصوصی مراعات ان کے علاوہ تھیں۔ گورنر جنرل سے لے کر عام فوجی تک سب بھرپور ہاتھ رنگتے اور کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ کوئی کام رشوت کے بغیر انجام نہ پاتا۔ ترکوں سے بیگار لی جاتی اور ان کی اجرت روسی خود ہضم کر جاتے۔ رشوت خوری، اور بدعنوانیاں عام تھیں۔ اس لوٹ کھسوٹ کا نتیجہ یہ تھا کہ روسی دیہات اور قصبات میں خوشحالی کا دور دورہ تھا جو لوگ اپنے وطن میں غربت و افلاس کی چکی میں پسا کرتے تھے، انہیں مسلمان علاقوں میں آباد ہوتے زیادہ دیر نہ لگتی کہ بیش و عشرت کی بساط بچھ لیتے۔ ملک کی زرعی و معدنی دولت بے تحاشہ روس منتقل کی جانے لگی۔ زرخیز زمینیں بڑے بڑے کاروبار اور صنعتیں چھن جانے سے مقامی باشندے معاشی بدحالی کی پستیوں میں غلطاں کر دیے گئے۔[2]

---

[1] Mission to Turkestan OP Cit P 183, 191, 194

[2] Mission to Turkestan OP Cit P. 142, 143

روس کی اکثر زرعی فصلیں اور معدنی وسائل غیر روسی علاقوں سے حاصل کی جاتی تھیں۔ مثلاً روس کی [illegible] پیداوار کا بیشتر حصہ ان علاقوں میں پیدا ہوتا تھا جن کی آبادی یوکرینی اور تاتاری تھی۔ ملحقہ لگانے [illegible] زخیز اراضیات والگا، کریمیا اور یوکرین میں تھیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں روسی سلطنت میں [illegible] خاصی مقدار میں پیدا ہونے لگی۔ اور اس کی وجہ وسطی ایشیا کے وہ زرخیز علاقے تھے جن پر روس نے [illegible] کر لیا تھا۔ روس کی ایک اور اہم فعل چقندر تھی جس پر قند سازی کی صنعت کا انحصار تھا۔ چقندر [illegible] کیف کے مغربی علاقے میں پیدا ہوتا تھا لیکن اس کی کاشت بھی روسی نہیں بلکہ یوکرینی کاشتکاروں [illegible] تھی۔[1]

اسی طرح اٹھارہویں صدی عیسوی میں یورال کی کانوں سے لوہا نکالنا شروع ہوا اور روس لوہے کا سب [illegible] برآمدی تاجر بن گیا۔ انیسویں صدی کے وسط میں یورال کے لوہے کی جگہ روسی پولینڈ اور یوکرین نے [illegible] مشرقی یوکرین کا علاقہ کوئلے کی سپلائی کا سب سے بڑا ذریعہ بنا۔ انیسویں صدی کے آخر میں جزیرہ [illegible] سے وسیع پیمانے پر تیل نکالنا شروع ہوا جہاں زیادہ تر آذری ترک آباد تھے۔[2]

لیکن اس کے برعکس انیسویں صدی کے آخر تک جتنے بھی کارخانے لگائے گئے ان میں سے بیشتر روسی [illegible] والے علاقوں میں تھے۔ ان میں سینٹ پیٹرزبرگ، ماسکو اور وسطی روس کے علاقے خاص طور پر قابل [illegible] ہیں۔ اس نامعقول اور بے جوڑ مکینک نے معیشت کے اندر کافی ناہمواریاں اور تضاد پیدا کر [illegible] کے رکھ دیے۔

صدائے بازگشت

زار شاہی روس کے اس استبدادی دور میں لوگوں کا بے چین ہو جانا اور زیر زمین سرگرمیوں میں مصروف ہو جانا ایک قدرتی بات تھی۔ چنانچہ مختلف بہیوں میں [illegible] ضرب کی صدائے بازگشت سنائی دی جانے لگی۔ ۱۹۰۵ء میں زار شاہی کے خلاف روسی عوام اور [illegible] افواج میں بغاوت ہو گئی۔ انقلاب کی اس کوشش ناکام کے بعد زار روس نے عوام اور فوج کو مطمئن [illegible] کے لئے متعدد اقدامات کئے نیا دستور نافذ کیا، سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دی اور انتخابات کروائے

---

[1] Mission to Turkestan OP Cit P 27, 28

toobaa-elibrary.blogspot.com

مختلف گروہ اور سیاسی جماعتیں وجود میں آئیں۔ رسائل و جرائد شائع ہوئے۔ اگست ۱۹۰۵ء میں "اتفاق مسلمین" کے نام سے ایک جماعت وجود میں آگئی جس کا مقصد روس کے تمام ترک مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا تھا۔ یہ جماعت توورانیت (Pan Turkism) کی علمبردار تھی تاہم اس کا سیاسی نصب العین مذہبی آزادی کی جدوجہد قانون کی نظر میں تمام شہریوں کی مساوات اور قومی تہذیب و ثقافت کی ترقی تھا۔ اس کے متوازی دائیں بازو کی جماعت "صراط مستقیم" وجود میں آئی۔ مسلمان اقوام میں سیاسی زندگی کا آغاز اپنے حقوق کے تحفظ کا ہوش و جذبہ روسیوں کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ چنانچہ نارنکوس دوم نے ۱۹۰۷ء میں انتخابی قوانین میں ترمیم کر کے ۱۹۰۸ء میں اس سیاسی زندگی کی بساط لپیٹ دی۔ رکھ دی گئی جو ۱۹۰۵ء کے ہنگامہ انقلاب کا ردعمل تھی۔ تمام تحریکیں اور جماعتیں زیر زمین چلی گئیں۔ اس کا فائدہ انقلابی گروپوں نے سمیٹا۔

اتفاق المسلمین کے لیڈروں نے مختصر سی سیاسی آزادی کے دور میں اپنے مطالبات منوانے کی آئینی کوشش کی مگر روسی حکومت نے انہیں سخت مایوس کیا۔ انجام کار سرگرم نوجوان انقلابی جماعتوں سے وابستہ ہو گئے۔ یہ سیاسی زندگی ختم ہونے کے بعد قازان میں "حریت" اور آذربائیجان میں "مساوات" نامی خفیہ جماعتیں قائم ہو گئیں۔ انتہا پسندوں نے تاتاری سوشلسٹ انقلابی گروپ بنایا۔ مساوات سے تعلق رکھنے والے آذر کے افراد نے ہمت کے نام سے جماعت بنائی۔ بعد ازاں یہی لوگ سوشلسٹ ڈیموکریٹس کے ساتھ منسلک ہو گئے جس نے آگے چل کر بالشویک گروپ کی شکل اختیار کر لی۔[1]

چنانچہ اس زمانے کی دوسری تحریکوں کی طرح سائنٹیفک سوشلزم (مارکسیت) کی اس تحریک کو بھی اپنے وجود اور تقاضے کے ہر مرحلے پر زار شاہی استبداد کا سامنا کرنا پڑا۔

مارکسزم کی انقلابی جدوجہد

لینن کا کارنامہ

اسی زمانہ میں لینن منظر عام پر آیا۔ وہ ۱۸۷۰ء میں سمبرسک کے مقام پر پیدا ہوا۔ ۱۸۸۷ء میں اس نے جامعہ قازان میں شرکت کی لیکن طالب علمانہ

---

[1] روس میں مسلمان تحریکیں ص ۱۶۹، ۷۰

[illegible] میں حصہ لینے کی وجہ سے بہت جلد اسے جامعہ سے خارج کر دیا گیا۔ ۱۸۹۳ء میں لینن سینٹ پیٹرز [illegible] وہاں کے مارکسی حلقے اس کی بحث و گفتگو سے بہت متاثر ہوئے۔ اپنی تنظیمی اور علمی قابلیت کے [illegible] اس مقام کے مارکسیوں کا رہنما بن گیا۔ ۱۸۹۵ء میں اس نے تمام مارکسی کارکنوں کو ایک مجلس میں جمع [illegible] اس کا نام "طبقۂ محنت کی نجات و خلاصی کے لئے جدوجہد کرنے والی مجلس"[2] League of Struggle for the Emancipation of Working [illegible] لینن نے اس مجلس کے [illegible] کیا کہ وہ طبقۂ محنت سے زیادہ قریبی روابط قائم کرے۔ اور سیاسیات میں ان کی رہنمائی کا کام سرانجام [illegible] مارکسی اصولوں کی تبلیغ و اشاعت مزدوروں اور محنت کے اس طبقے تک محدود تھی جو [illegible] سے بیدار تھا۔ لینن کو یہ ایک عظیم کام کا نام تھا کہ اس نے تمام مزدوروں میں اس تحریک کو [illegible] شروع کیا۔ لینن کی رہنمائی میں مجلس جدوجہد نے اپنے معاشی مطالبات کے علاوہ حکومت کے خلاف سیاسی [illegible] بھی "عائد کیا"۔ ۱۸۹۵ء میں حکومت نے لینن کی سیاسی سرگرمیوں سے خوفزدہ ہو کر اسے گرفتار کر لیا۔ لیکن وہ [illegible] کی پناہ کام کرتا رہا۔ سینٹ پیٹرزبرگ کی مجلس جدوجہد نے دوسرے شہروں کے مزدور حلقوں میں بھی اتحاد و [illegible] پیدا کر دیا۔ چنانچہ ان شہروں میں بھی مماثل مجالس کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۸۹۴ء میں ماسکو میں مزدوروں کی انجمن [illegible] ۱۸۹۸ء اور ۱۹۰۰ء کے درمیانی سالوں میں قاف کے علاقوں میں بھی مارکسی تنظیمیں قائم ہونے لگیں۔ ۱۹۰۰ء کے [illegible] میں معاشرتی جمہوری انجمن کا قیام عمل میں آیا۔ اس طرح سے روس کے تمام بڑے بڑے شہروں میں مارکسی [illegible] جمہوری تحریک پھیلنے لگی۔[3]

کانگریس کا انعقاد

اس تحریک نے مغربی روس میں ترقی کا ایک اور قدم آگے بڑھایا۔ پولینڈ کی قوم پرست جماعت سے وہ تمام عناصر علیحدہ ہو گئے جو مارکسی نظریات کے حامی تھے [illegible] نے لتھوانیا اور پولینڈ کی معاشرتی جمہوری پارٹی کی بنیاد رکھی۔ اسی طرح لیٹویا میں بھی معاشرتی جمہوری [illegible] قائم ہوئیں۔ ۱۸۹۷ء میں یہودی (یہودی) معاشرتی جمہوری پارٹی کا قیام عمل میں آیا۔ جلسے ہنڈ کیا [illegible] ۱۸۹۸ء میں سینٹ پیٹرزبرگ، ماسکو اور کیف کی مجالس جدوجہد نے ہنڈ کے ساتھ اتحاد قائم کرنے کی کوشش [illegible] کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ یہ تمام جماعتیں اپنی انفرادی حیثیت چھوڑ کر ایک عام معاشرتی جمہوری پارٹی

[illegible] ص ۱۷۰

toobaa-elibrary.blogspot.com

کی شکل اختیار کرلیں۔ چنانچہ اس غرض سے انہوں نے روس کی سماشرتی جمہوری جماعتوں کی ایک کانگریس
کی۔ جو ۱۸۹۸ء میں بمقام منسک (Minsk) منعقد ہوئی۔ اس کانگریس میں صرف نو اشخاص
ہوئے۔ لینن بھی قید میں ہونے کی وجہ سے شرکت نہ کرسکا۔ حکومت نے بقیہ سماشرتی پارٹی کی مرکزی
کو فوراً گرفتار کرلیا۔ اس کے باوجود کانگریس نے روس کی سماشرتی جمہوری مزدور پارٹی کے باقاعدہ قیام
اور ایک منشور جاری کیا۔ یہ اعلان محض لفظی تھا کیونکہ کانگریس مختلف مارکسی حلقوں کو ایک جا اور متحد کرنے
رہی۔ ملک کی مختلف مقامی تنظیمات اب تک کسی مشترک پالیسی یا طریق کار پر کاربند تھیں۔ پارٹی کا کوئی
پروگرام تھا نہ قواعد و ضوابط مرتب کئے تھے۔ صرف یہی کوئی مرکز وجود میں آیا تھا۔ ان حالات میں ایک فکری
کا پیدا ہو جانا ایک قدرتی بات تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مزدوروں کی تحریک میں بے اصول اور مصلحت پسند
داخل ہونے لگے۔[1]

اسکارا اور دوسری کانگریس

لینن نے سائبیریا کی قید ہی میں اپنی مشہور کتاب
(Development of Capitialism) تصنیف

اسی زمانے میں اس نے معاشیین (Economists) کے رد پر توجہ دی۔ لینن کو اس کا اندیشہ تھا
مزدوروں کی تحریک معاشیین کے افکار سے متاثر ہو گئی تو انقلاب کے امکانات ختم ہو جائیں گے۔ یہ گروہ سا
کے قید کے زمانے میں سینٹ پیٹرزبرگ کے جلسے جلوس ہی کے اندر سے نمودار ہوا اور کہتا تھا کہ مزدور
صرف اپنے مالکوں کے مقابلے میں معاشی جدوجہد کرنی چاہئے۔ اور کسی سیاسی جدوجہد کا میدان جمہوریت پسندوں
اعتدال پسند عناصر کے لئے چھوڑ دینا چاہئے۔

قید سے رہائی کے بعد لینن نے ایک اخبار نکالنے کا ارادہ کیا تاکہ اس کے ذریعے وہ مارکسیت کے صحیح
نظریہ پیش کرکے اس پراگندہ خیالی کو دور کرے۔ جس میں مارکسیوں کے مختلف حلقے مبتلا تھے۔ یہ کام اس
ضروری تھا کہ فکری اتحاد کے بغیر مختلف مارکسی تنظیمات کو ایک متحدہ جماعت کی شکل نہیں دی جا سکتی تھی۔ اس سے
اندازہ ہوتا ہے کہ لینن ہی مارکس کا اصل جانشین اور مارکسزم کی انقلابی جدوجہد کا روح رواں تھا۔ اس سے
علاوہ مارکسیت کی نام نہاد تمام جماعتیں مارکس کی مجموعہ انقلابی لاتعلقی سے بچی ہوئی تھیں۔ لینن ان سب کے

---

[1] ڈاکٹر محمد اللہ نظام اسلام ص ۴۲۱

کی ایک لڑی میں پرو دینا چاہتا تھا۔ روس میں آزادی تحریر و تقریر پر جو پابندیاں تھیں ان کی وجہ سے مجوزہ
جماعت اس ملک میں ممکن نہ تھی۔ اس لئے لینن نے اپنا اخبار "اسکارا" بیرون ملک سے شائع کرنا شروع
۱۹۰۰ء میں اس اخبار کا پہلا پرچہ منظر عام پر آیا۔[1]

لینن نے اپنے اخبار اسکارا میں مزدوروں کی ایک پارٹی کی تشکیل پر بہت زور دیا۔ بالخصوص اس نے اپنی کتاب
(What is to be D) میں نہایت مدلل طریقے سے پارٹی کی ضرورت کو ثابت کیا۔ مجوزہ پارٹی کا پروگرام
اور مزدوروں کی جدوجہد کا آخری مقصد واضح کیا۔ لینن کی تحریکی جدوجہد بے اثر نہیں رہی۔ ۱۹۰۳ء میں
جمہوری پارٹی کی دوسری کانگریس بمقام بریسیلز اور پھر لندن میں منعقد ہوئی۔ اس کانگریس میں کل ۴۳
شریک تھے۔ جو ۲۶ مختلف تنظیمات کے نمائندے تھے۔ ان میں سے ۳۳ مندوبین اسکارا کے پیش کردہ پروگرام
متفق تھے۔ لیکن بقیہ مندوبین اس سے اختلاف رکھتے تھے۔ دو مسائل خاص طور پر مختلف فیہ تھے۔ اولاً
شریت کا قیام۔ دوم روس کے مختلف اقوام کے حق خود ارادیت کا مسئلہ۔ پہلے مسئلے کے متعلق ایک گروہ کا خیال
دوسرے ملک کی سماشرتی جمہوری پارٹیوں نے اپنے پروگرام کا جزو نہیں بنایا ہے اس لئے مجوزہ روسی
بھی اس بارے میں سکوت اختیار کرنا چاہتے۔ دوسرے مسئلے کے بارے میں بھی ایک گروہ کا خیال یہی تھا
سے کچھ ہونا مناسب نہیں۔ بالآخر کانگریس نے اسکارا کا تجویز کردہ پروگرام منظور کر لیا۔ جس کے دو اجزا
فوری مقاصد سے متعلق تھا اور ایک آخری مقصد سے تعلق رکھتا تھا۔ فوری مقاصد میں یہ امور شامل تھے
کا خاتمہ۔ جمہوری حکومت کا قیام۔ آٹھ گھنٹوں کا دن اور غلامی کی رسومات کا استیصال۔ آخری مقصد
اشتراکی انقلاب برپا کرکے سرمایہ داری کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اور ملک میں پرولتاری آمریت قائم ہو جائے۔[2]

کشمکش کا آغاز

کانگریس کے مندوبین میں اس بات پر بھی اختلاف تھا کہ پارٹی کو کن
اصولوں پر منظم کیا جائے۔ لینن اور اس کے ہم خیال مندوبین کی رائے یہ
میں شرکت کے قواعد سخت ہونے چاہئیں اور اس میں صرف پارٹی کے مرتبہ پروگرام پر سختی سے کاربند
شریک کیا جائے۔ ایسے لوگ جو پارٹی کی مالی اعانت بھی کرتے ہوں۔ اور اس کی مختلف مجالس میں عملی
شرکت بھی کرتے ہوں۔ مارٹوف (MARTOO) اور اس کے دوساتھی اس خیال کے حامی تھے کہ یہ ضروری نہیں

---

[1] ڈاکٹر محمد اللہ نظام اسلام ص ۴۲۱

[2] ڈاکٹر محمد اللہ نظام اسلام ص ۴۲۱

toobaa-elibrary.blogspot.com

جہیں کہ پارٹی کے تمام اراکین لازمی طور پر اس کی تمام مجلسوں کے عملی پروگراموں میں شریک ہوں۔ اس اختلاف کی
کانگریس میں لینن اور اس کے ہم خیالوں کو غالب اکثریت کی تائید حاصل تھی۔ اس لئے ان لوگوں کو بالشویک
لگا جس کے معنی اکثریت کے ہیں اور دوسرے فریق کو منشویک یعنی اقلیت کے ہم سے موسوم کیا گیا
کانگریس کے بعد بالشویکوں اور منشویکوں کی کشمکش میں اور زیادہ شدت پیدا ہو گئی۔

بالشویکوں اور منشویکوں کے درمیان اسکاد کی مجلس ادارت میں اکثریت اور غلبہ حاصل کرنے کی کوشش
ہوئیں۔ اول تو منشویکوں کے تمام ارکان کو اس سے خارج کر دیا گیا لیکن سدیں منشویک پھر مجلس ادارت
اور اسکاد اہنی کا ترجمان بن گیا۔ ۱۹۰۴ء میں دو علاحدہ بالشویکوں کی مدد سے منشویکوں نے پارٹی کی
میں بھی غلبہ حاصل کر لیا۔ اخبار اور مرکزی کمیٹی میں مغلوب ہو جانے کے بعد بالشویکوں کی حالت بہت مر
اس لئے انہوں نے ایک الگ اخبار اور مرکزی کمیٹی تشکیل دینے کی ضرورت محسوس کی جس کے لئے انہوں
کی تیسری کانگریس منعقد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔[1]

۱۹۰۵ء کا انقلاب اور تیسری کانگریس

اسی اثنا میں روس اور جاپان کی جنگ شروع ہو
میں روس کو کئی شکستیں اٹھانی پڑیں جس سے
حکومت کو عوام کی نظر میں بے وقعت کر دیا۔ اور انہیں محسوس ہو گیا کہ حکومت اندر سے کھوکھلی ہو چکی ہے
دوران بالشویکوں کی سرگرمی میں پہلے باکو اور پھر سینٹ پیٹرزبرگ کے کارخانوں میں مزدوروں نے ہڑتالیں
پھر یہ سلسلہ تمام شہروں تک پھیل گیا۔ مزدوروں نے زار کے محل کے سامنے جمع ہو کر
اور عاجزی سے اپنے مطالبات پیش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن حکومت نے بھی پہلے تحاشا گولیاں چلائیں جس
بے شمار مزدور ہلاک اور زخمی ہو گئے۔ یہ خبر پورے ملک میں جنگل کی آگ کی طرح بہت جلد پھیل گئی۔ حکومت
سفاکی کے ردعمل میں ہر جگہ ہڑتالیں شروع ہو گئیں۔ پھر شہروں سے نکل کر یہ شورش دیہاتوں میں بھی پھیل
کسان زمینداروں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ان کی زمینوں پر قبضہ کر لیا۔ اور ان کے محلات میں آگ لگا
فوجیوں اور ملاحوں نے بھی بغاوت کر دی۔ روسی حکومت نے بغاوت کو فوجی طاقت سے کچل دیا لیکن
حکومت عمل پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ عوام سے وعدہ کیا کہ ایک نیابتی مجلس (ڈوما) سر

[1] المنشویک، ص ۱۴۷-۱۴۸، ۱۵۰-۱۵۲ نیز ایضاً ص ۱۵۵-۱۵۸

کے گی جس میں عوام کے نمائندوں کو اصلاح مشورے کی غرض سے شریک کیا جائے گا تاہم ڈیوما کو قانون سازی کا
حاصل نہیں ہوگا۔ بالشویکوں نے اس ڈیوما کے مقاطعہ کا اعلان کر دیا۔ لیکن منشویکوں نے طے کیا کہ وہ ڈیوما میں
حصہ لیں گے[1]

اس کی سماشرتی جمہوری پارٹی اگرچہ اس وقت تک صرف ایک دکھاوی چیز تھی لیکن شدید اختلافات کی
درحقیقت بالشویک اور منشویک دو گروپوں میں بٹی ہوئی تھی جن کے پریس اور مرکز جدا جدا تھے۔
نے تیسری کانگریس منعقد کرنے کا اعلان کیا تو منشویکوں نے الگ کانگریس منعقد کرنے کا تصفیہ کیا۔
۱۹۰۷ء میں بمقام لندن پارٹی کی تیسری کانگریس منعقد ہوئی۔ منشویکوں نے اپنی کانگریس جنیوا میں منعقد کی۔[2]

نظر کا اختلاف

دونوں کانگریسوں میں تقریباً یکساں مسائل زیر بحث تھے یعنی انقلاب
برپا کرنے کی تدابیر اور طریق کار۔ بالشویکوں کی کانگریس اس نتیجے پر
پہنچا جو دیکھ کر ۱۹۰۵ء کی انقلابی جدوجہد درمیانی طبقہ کی جدوجہد ہے جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ نظام سرمایہ داری
باقی رکھتے ہوئے اس میں چند سیاسی اور معاشی حقوق حاصل کئے جائیں۔ لیکن پرولتاری طبقہ اس انقلاب کی
سے بہت زیادہ تعلق خاطر رکھتا ہے کیونکہ اس کی کامیابی ہی سے وہ سیاسی، مدنی اور معاشی حقوق حاصل
جس سے فائدہ اٹھا کر پرولتاریہ اپنی تنظیم مستحکم کرے گا۔ اور سیاسی جدوجہد کے طریقوں میں تجربہ حاصل کر
درمیانی اقتدار پسند طبقوں کے حاصل کردہ حقوق و مراعات سے ایک قدم بڑھ کر پرولتاری انقلاب برپا کرے
مقصد کے لئے پرولتاریہ یعنی مزدوروں کو کسانوں کا تعاون حاصل کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر
روں کے ایک بڑے حلقے یعنی زمینداروں کی طاقت کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ جمہوریت پسند درمیانی طبقات
مکمل پرولتاری انقلاب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ مزدوروں اور کسانوں کے مقابلے میں زار
یادت کو ایک حلیف قوت کی حیثیت سے باقی رکھنا چاہتے ہیں اور اس کے اقتدار کو صرف آئینی شکل
ہتے ہیں۔ اس لئے بہت ممکن ہے کہ جمہوریت پسند درمیانی طبقہ دستوری بادشاہت کی بنیاد پر نارودس
ت سے مصالحت کر لے اور انقلاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچنے سے روک دے۔ انقلاب کی تکمیل کے لئے ضروری
سیاسی تحریک کی رہنمائی پرولتاریہ کے ہاتھ میں ہو اور انہیں کسانوں کی ہمدردی اور تعاون حاصل ہو نیز انقلاب

---

[1] ایضاً ص ۱۵۸-۱۶۰ [2] ایضاً ص ۱۶۰-۱۶۲

taobaa-elibrary.blogspot.com

کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ معاشرتی جمہوری پارٹی کسی ایسے موقع کو ہاتھ سے جانے دے جس میں اس کے
انقلابی حکومت بنانے کا امکان موجود ہو۔"

منشویکوں کا خیال تھا کہ ملک میں جو انقلاب واقع ہو رہا ہے وہ چونکہ درمیانی طبقوں کا انقلاب ہے
اس کی رہنمائی بھی انہی طبقوں کو کرنی چاہیئے اور پرولتاریہ کو اپنے ہاتھ میں رہنمائی لینے کی کوشش نہیں
پرولتاریہ کو کسانوں کے ساتھ تعلقات قائم نہیں کرنے چاہئیں۔ بلکہ درمیانی مقتدر سپند طبقوں کے ساتھ
کام کرنا چاہیئے۔ جو اس وقت سیاسی تحریک کے رہنما ہیں۔ سب سے ضروری بات یہ ہے کہ اس وقت پر
اپنے انقلابی نظام سے درمیانی طبقوں کو خوف زدہ نہ کرے کیونکہ اگر پرولتاریہ کی انتہا پسندی اور
طرز اندیشہ سے ڈر کر انہوں نے اپنی سیاسی جدوجہد کو ملتوی کر دیا یا روس کی حکومت سے مصالحت
تو انقلاب کے مواقع کم ہو جائیں گے۔ انقلاب کی تکمیل کے لئے بہتر یہی ہوگا کہ کوئی نیابتی مجلس (مسکی سو
ڈیوما کی مانند) قائم ہو جائے جس پر مزدور طبقہ باہر سے اپنا اثر ڈال سکے۔"

مسلح بغاوت اور چوتھی کانگریس

۱۹۰۵ء کے موسم خزاں میں انقلابی تحریک پورے زور
ستمبر میں ماسکو اور تمام دوسرے شہروں کے مطابق
ہوئی۔ اکتوبر میں ریلوے کے مزدوروں نے ہڑتال شروع کی جس کی وجہ سے ریلوں اور تار گھروں کا کام
ہو گیا۔ اس کے معاً بعد ہر طرف ہڑتالیں شروع ہو گئیں اور سارے ملک کا نظام تہہ و بالا ہو گیا۔ ۱۷ اکتوبر کو
کو تا ہر روس نے خوف زدہ ہو کر ایک اعلان کے ذریعہ مدنی آزادیاں عطا کرنے کا وعدہ کیا۔ شخصی آزادی
ضمیر و مذہب کی آزادی، تحریر و تقریر اور اجتماع کی آزادی کی پیشکش کی گئی۔ ایک قانون ساز ڈ
انعقاد کا ارادہ بھی ظاہر کیا گیا۔ لیکن یہ بھی محض ایک دھوکا تھا۔ اور عوامی اضطراب کو ختم کرنے کی ایک
بالشویکوں نے مزدوروں کو اس کے خلاف ابھارا۔ اور مسلح بغاوت پر اکسایا۔ اکتوبر کی عام ہڑتال
رہنے میں ایک نئی قسم کی تنظیم کی بنا ڈالی گئی جو بعد میں نائبین حمال سوویٹ
Soviet of Workers
Deputies
کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ سوویٹ مختلف کارخانوں کے مزدوروں کے منتخب
نمائندوں پر مشتمل تھی اور ان میں عام انقلابی عناصر جمع تھے۔ پہلے یہ سوویٹ سینٹ پیٹرزبرگ میں قائم ہوئی

۱۔ تاریخ اسلام، ص ۹۱۷-۹۱۸

سکو میں دسمبر ۱۹۰۵ء میں سارے ملک میں سوویٹ قائم ہو گئے۔ اور یہ کوشش شروع ہوئی کہ قانون
ں کے بھی مثال سوویٹ قائم کئے جائیں۔ اور پھر انہیں مزدوروں کے سوویٹوں سے متحد کیا جائے۔
ں نے مزدور دل اور کسانوں کو مسلح کرنے میں بڑی ہمت اور پامردی کا ثبوت دیا۔ انہوں نے بیرونی
سے خفیہ طور پر اسلحہ خرید کر کسانوں اور مزدوروں میں تقسیم کیا۔ نومبر ۱۹۰۵ء میں لینن جو ابھی تک
باہر تھا واپس روس آیا۔ مالی نے لینن میں سٹالن کوہ قاف کے علاقے میں انقلابی کام کر رہا تھا۔ لیکن
سرے سے شخصی طور پر متصادم رہتے تھے۔ دسمبر ۱۹۰۵ء میں فن لینڈ میں بالشویکوں کی ایک کانفرنس
ہوئی۔ اس کانفرنس میں لینن اور سٹالن میں پہلی دفعہ ملاقات ہوئی۔ اس عرصہ میں مزدوروں کی ایک
بغاوت شروع ہو گئی۔ اس لئے لینن کے مشورے پر کانفرنس نے اپنا کام جلدی ختم کر دیا۔ اور لیڈر اپنے
قات پر بغاوت کی رہنمائی کی غرض سے واپس چلے گئے۔

اور روس کی حکومت بھی غافل نہ تھی۔ چالاکی سے صلح ہو جانے کے بعد زار کی حکومت کو سانس لینے کا موقع
اور اس نے انقلابی تحریک کو کچلنے کی پوری قوت صرف کر دی۔ لیکن زار نے صرف تشدد کے حربے پر
نہیں کیا۔ بلکہ دسمبر ۱۹۰۵ء میں ایک قانون نافذ کیا جس کے لئے ایک نئی قانون ساز ڈیوما کے لئے
بات کرنے کا طریقہ معین کیا گیا۔ یہ انتخابی قانون بھی جمہوری طریقہ کے منافی تھا۔ کیونکہ اس میں ایسا
طریق وضع اختیار کیا گیا تھا کہ ڈیوما میں کسان والوں اور درمیانوں کے نمائندوں کی اکثریت رہے۔ اسی
ں مزدوروں نے ایک دفعہ پھر محسوس کیا کہ ان کے درمیان مؤثر اتحاد کا فقدان ہے۔ چنانچہ پارٹی کی
وچی کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ جو سویڈن میں اپریل ۱۹۰۶ء میں منعقد ہوئی۔ یہاں بھی بالشویکوں
بالشویکوں کے درمیان اختلافات ختم ہو سکے۔ کانگرس کی منتخب کردہ مرکزی کمیٹی نے بہت جلد ہی اپنی مصلحت
کا ثبوت دیا اور یہ بات ظاہر ہو گئی کہ یہ کمیٹی عوام کی انقلابی تحریک چلانے کی اہلیت نہیں رکھتی۔[1]

ڈیوما بگار اور سخت گیری

اس درمیان میں پہلی ڈیوما کا انتخاب عمل میں آیا۔ اس ڈیوما کے منتخب
شدہ زار کی توقع کے برخلاف آزاد رائے رکھنے والے افراد تھے
حکومت کے مطیع اور منقادین کر رہنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے زار نے اس ڈیوما کو معطل کر دیا۔ اور

۱۔ تاریخ اسلام، ص ۹۱۷-۹۱۸

toobaa-elibrary.blogspot.com

سخت گیری کی پالیسی اختیار کی۔ اسی کے ساتھ ساتھ اپنی مرضی کے آدمیوں کو لانے کی خاطر نمائندے دوسری منعقد کی لیکن پھر بھی یہ توقع پوری نہ ہوئی۔ اس لئے جون ۱۹۰۷ء کو دوسری ڈیوما بھی برخاست کر دی گئی بعد تیسری ڈیوما کے انعقاد کا اعلان کر دیا گیا اور ساتھ ساتھ سخت گیری کی پالیسی بھی جاری رکھی۔ معاشرتی جمہوری پارٹی کے ۱۶۵ نائبین کو گرفتار کر کے سائبیریا میں جلاوطن کر دیا گیا۔ فیروز نامہ کے وزیر استولیپن (۱۹۰۶ء سے مزدوروں اور کسانوں کے خلاف تشدد کی مہم کا آغاز کیا۔ ہزاروں انقلابی کارکنوں اور مزدور رہنماؤں کو سولی پر چڑھا دیا گیا۔ اور بالشویکوں کی تمام تنظیمات کو درہم برہم کر دیا گیا۔ اس طرح پہلی انقلابی تحریک مقصد میں ناکام ہوئی اور وہ ایک عرصے تک حالات کی ناسازگاری کی بنا پر دبی رہی۔[1]

بالشویکوں کی جداگانہ پارٹی

تحریک کے دور تنزل میں منشویکوں کا انقلابی جذبہ بالکل سرد اور انہوں نے سرمایہ داروں اور اعتدال پسند عناصر کے ساتھ مصالحانہ رویہ اختیار کرنا شروع کیا۔ بلکہ اس سے بھی گزر کر ایک اصلاح پسند پارٹی کی داغ بیل ڈالنے کی کوشش کی۔ اس طرح انہوں نے انقلابی تحریک کے ساتھ عین وقت پر بے وفائی کی۔ بالشویکوں نے محسوس کیا کہ اگر اب بھی وہ اپنی الگ پارٹی نہیں بنائیں گے بلکہ منشویکوں کے ساتھ بدستور ایک پارٹی میں شریک رہیں گے تو انہیں منشویکوں کے اعمال و افعال اور منافقانہ روش کا ذمہ دار قرار دیا جائے گا اس طرح پارٹی کی وحدت سے ان دونوں فریقوں کی مخالفت پر جو پردہ ڈال رکھا تھا اب چاک ہو گیا اور وہ ظاہری اتحاد ٹوٹ گیا۔ جو مخالفتوں کے باوجود اب تک ان کے درمیان قائم تھا۔ بالشویکوں نے قطعی ارادہ کر لیا کہ اب وہ منشویکوں سے باضابطہ علیحدہ ہو جائیں گے۔ اور ایک جداگانہ پارٹی قائم کر لیں گے۔ اس غرض سے انہوں نے پارٹی کی پانچویں کانگریس کے انعقاد کی تیاری شروع کی۔ جس کے سامنے سب سے اہم مسئلہ ایک جداگانہ پارٹی کی تنظیم کا تھا۔ بالشویک ایسی پارٹی بنانا چاہتے تھے جس میں مصالحت پسندوں کے لئے کوئی گنجائش نہ ہو اور جو درمیانی اعتدال پسند طبقات کی مخالفت ہو۔ روس کی معاشرتی جمہوری پارٹی کی پانچویں کانگریس ۱۹۱۲ء میں بمقام پراگ منعقد ہوئی اور اس نے منشویکوں کو پارٹی سے خارج کر دینے کا تصفیہ کر لیا۔ منشویکوں کے اخراج کے بعد بالشویک پارٹی

[1] انقلاب روس مصنفہ ایم ایچ سرکار

ایک مستقل اور جداگانہ پارٹی کی حیثیت سے وجود میں آئی لیکن اس نے اپنا سابقہ نام (معاشرتی جمہوری پارٹی) قائم رکھا اور ۱۹۱۸ء تک وہ اسی نام سے یاد کی جاتی تھی۔ منشویکوں کے اخراج سے بالشویک پارٹی اور زیادہ قوی ہو گئی۔ کیونکہ اب اس میں مصالحت پسند عناصر باقی نہیں رہے تھے۔[1]

نیا جوش نئے ولولے

۱۹۱۲ء میں سائبیریا میں لینا کے مقام پر سونے کی کان میں کام کرنے والے ۴۰۰ مزدوروں کو گولی سے اڑا دیا گیا۔ اس واقعہ کا اثر یہ ہوا کہ سینٹ پیٹرز برگ، ماسکو اور دوسرے صنعتی شہروں میں مزدوروں نے لینا کے مقتولین کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتے ہوئے ہڑتالیں شروع کر دیں۔ اور ہڑتالیوں کی تعداد تقریباً ۳ لاکھ ہو گئی۔ مزدوروں کی بڑھتی ہوئی تحریکات اور اجتماعی ہڑتالوں نے کسانوں کو بھی حرکت دی اور انہوں نے بھی اس کشمکش میں حصہ لینا شروع کیا۔ مالشویک پروپیگنڈے سے اثر لے کر کسان پھر زمینداروں کے خلاف علانیہ بغاوت ہونے لگے۔ انہوں نے زمینداروں کے محلات اور مالدار کسانوں کے کھلیانوں کو جلانا اور برباد کرنا شروع کیا۔ ۱۹۱۳ء میں ترکستانی افواج نے ایک مسلح بغاوت کر دی۔ سبسٹوپول اور بحیرہ بالٹک کے بیڑے میں بھی باغیانہ تحریکات رونما ہوئیں۔[2]

۱۹۱۲ء کے موسم گرما میں لینن نے پیرس سے گلیشیا کو نقل مکانی کیا تاکہ روس سے نزدیک تر ہو جائے اسی زمانے میں بالشویکوں نے جمہور پر اپنا اثر بڑھانے اور مزدوروں میں نیا جوش اور نئے ولولے پیدا کرنے کے لئے ہفت روزہ "پراودا" جاری کیا جس کے لئے مالی سعی چندہ کے ذریعہ کی گئی۔ اس اخبار کا پہلا پرچہ ۵ اپریل ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا۔ پراودا نے بالشویکوں کی انقلابی جدوجہد میں بڑا حصہ لیا۔ اور عوام کی تائید حاصل کرنے میں بڑی خدمات انجام دیں۔ حکومت نے اس کی اشاعت روکنے کی ہر کوشش کی۔ لیکن جرمانوں اور ضبطیوں کے باوجود اس اخبار نے اپنا کام جاری رکھا۔[3]

چوتھی ڈیوما اور بالشویکوں کی شمولیت

تیسری ڈیوما کے انعقاد اور بے اثر ہونے کے بعد ۱۹۱۲ء میں حکومت نے چوتھی ڈیوما کے لئے انتخابات منعقد کرنے کا اعلان کیا۔ بالشویکوں نے انتخابات میں حصہ لینے کا تصفیہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے اس انتخاب میں منشویکوں کے تعاون کے بغیر خود مختارانہ طور پر کام کیا اور اپنے انتخابی اعلانات میں حکومت کے حامیوں اور دیسائی

[2] ہسٹر آف ایسٹ ۱۹۱۴ء

toobaa-elibrary.blogspot.com

اعتدال پسند عناصر دونوں کو یکساں طور پر تنقید کا نشانہ بناتا۔ کامل جمہوریت کا قیام، آٹھ گھنٹے کا دن۔ زمینداروں کی بڑی بڑی جائدادوں اور جاگیروں کی ضبطی کے مطالبات ان کے انتخابی نعرے تھے۔ ڈیوما کے انعقاد کے بعد اس کی بالشویک نمائندوں نے ڈیوما کے اجلاس میں زار کی مستبدانہ حکومت پر علانیہ تنقیدیں کیں۔ اور اس کے مجرمانہ افعال و حرکات کی پردہ دری کی۔ بالشویکوں نے مزدوروں کے لئے آٹھ گھنٹے کا دن مقرر کرنے کے لئے ڈیوما میں ایک مسودہ قانون بھی پیش کیا۔ اگرچہ یہ مسودہ نامنظور ہوا۔ مگر اس کی وجہ سے بالشویکوں کی مقبولیت بڑھ گئی۔ ڈیوما کی بالشویکی جماعت نے اپنی مرکزی کمیٹی سے گہرا رابطہ قائم رکھا۔ اور اس کی رہنمائی میں اپنی آئینی جدوجہد جاری رکھی یہ زمانہ بالشویک پارٹی کا دور عروج تھا جس میں پارٹی نے خلاف قانون تنظیمات قائم کیں۔ اور مزدوروں میں خفیہ طور پر انقلابی کام کیا۔ اگرچہ ڈیوما میں منشویکوں کے سات نمائندے تھے۔ اور اس کے مقابلے میں بالشویکی نمائندوں کی تعداد صرف چھ تھی۔ لیکن بالشویکی جماعت حقیقتاً مزدوروں کی تین چوتھائی حصے کی نمائندگی کر رہی تھی۔ اس لئے ڈیوما میں بھی بالشویکوں کا اثر غالب رہا۔ ۱۹۱۴ء کے آغاز میں ہڑتالوں کی پھر کثرت ہونے لگی۔ جنوری کے مہینے میں ۱۴ لاکھ مزدوروں نے ہڑتال کر دی۔ یکم مئی کو یہ تعداد ۱۸ لاکھ تک پہنچ گئی۔ ۱۹۱۴ء کے نصف اول میں ہڑتال مزدوروں کی تعداد چودہ لاکھ ۲۵ ہزار تھی۔ اس نوبت پر جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ یہ جنگ انقلابی تحریک کی مستقبل کے لئے بہت اہم تھی۔ زار نے بھی جنگ کے حالات سے فائدہ اٹھا کر بالشویکی تنظیمات کو کچلنے کی پوری کوشش کی۔[1]

جنگِ عظیم اور بالشویکوں کی بین الاقوامیت

جنگِ عظیم میں روس، انگلستان اور فرانس کے ساتھ جرمنی کے خلاف شریک جنگ ہوا۔ مغربی جمہوریتوں کے ساتھ روس کے تحالف کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ ۱۹۱۴ء سے قبل روس کی تمام کلیدی صنعتیں بیرونی سرمایہ داروں اور بالخصوص فرانسیسیوں، انگریزوں اور بلجیم کے سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں تھیں۔ دھات کے کارخانے فرانسیسی سرمایہ سے قائم تھے۔ اسی طرح ڈانٹر ( ) کی وادی میں کوئلہ کی تمام پیداوار بیرونی سرمایہ کی امداد پر موقوف تھی جس کے نصف سے زائد چشمے انگریز اور فرانسیسی سرمایہ داروں کی ملک تھے۔ روسی صنعت کے منافع کا ایک بڑا حصہ انگریزوں اور فرانسیسی سرمایہ داروں کی جیب میں جاتا تھا۔

---

[1] ہسٹری آف دی ریوولیوشن صفحہ ۹۸، ۹۹ تا ۱۰۰ و ۱۰۱ تا ۱۰۲، ۱۰۳ تا ۱۰۴، ۱۰۵ تا ۱۰۶، ۱۰۷ تا ۱۰۸، ۱۰۹ تا ۱۱۰، ۱۱۱ تا ۱۱۲، ۱۱۳ تا ۱۱۴، ۱۱۵ تا ۱۱۶، ۱۱۷ تا ۱۱۸، ۱۱۹ تا ۱۲۰، ۱۲۱ تا ۱۲۲، ۱۲۳ تا ۱۲۴، ۱۲۵ تا ۱۲۶، ۱۲۷ تا ۱۲۸، ۱۲۹ تا ۱۳۰، ۱۳۱ تا ۱۳۲، ۱۳۳ تا ۱۳۴، ۱۳۵ تا ۱۳۶، ۱۳۷ تا ۱۳۸، ۱۳۹ تا ۱۴۰، ۱۴۱ تا ۱۴۲، ۱۴۳ تا ۱۴۴، ۱۴۵ تا ۱۴۶، ۱۴۷ تا ۱۴۸، ۱۴۹ تا ۱۵۰، ۱۵۱ تا ۱۵۲، ۱۵۳ تا ۱۵۴، ۱۵۵ تا ۱۵۶، ۱۵۷ تا ۱۵۸، ۱۵۹ تا ۱۶۰، ۱۶۱ تا ۱۶۲، ۱۶۳ تا ۱۶۴، ۱۶۵ تا ۱۶۶، ۱۶۷ تا ۱۶۸، ۱۶۹ تا ۱۷۰، ۱۷۱ تا ۱۷۲، ۱۷۳ تا ۱۷۴، ۱۷۵ تا ۱۷۶، ۱۷۷ تا ۱۷۸، ۱۷۹ تا ۱۸۰، ۱۸۱ تا ۱۸۲، ۱۸۳ تا ۱۸۴، ۱۸۵ تا ۱۸۶، ۱۸۷ تا ۱۸۸، ۱۸۹ تا ۱۹۰، ۱۹۱ تا ۱۹۲، ۱۹۳ تا ۱۹۴، ۱۹۵ تا ۱۹۶، ۱۹۷ تا ۱۹۸، ۱۹۹ تا ۲۰۰، ۲۰۱ تا ۲۰۲، ۲۰۳ تا ۲۰۴، ۲۰۵ تا ۲۰۶، ۲۰۷ تا ۲۰۸، ۲۰۹ تا ۲۱۰، ۲۱۱ تا ۲۱۲، ۲۱۳ تا ۲۱۴، ۲۱۵ تا ۲۱۶، ۲۱۷ تا ۲۱۸، ۲۱۹ تا ۲۲۰، ۲۲۱ تا ۲۲۲، ۲۲۳ تا ۲۲۴، ۲۲۵ تا ۲۲۶، ۲۲۷ تا ۲۲۸، ۲۲۹ تا ۲۳۰، ۲۳۱ تا ۲۳۲، ۲۳۳ تا ۲۳۴، ۲۳۵ تا ۲۳۶، ۲۳۷ تا ۲۳۸، ۲۳۹ تا ۲۴۰، ۲۴۱ تا ۲۴۲، ۲۴۳ تا ۲۴۴، ۲۴۵ تا ۲۴۶، ۲۴۷ تا ۲۴۸، ۲۴۹ تا ۲۵۰، ۲۵۱ تا ۲۵۲، ۲۵۳ تا ۲۵۴، ۲۵۵ تا ۲۵۶، ۲۵۷ تا ۲۵۸، ۲۵۹ تا ۲۶۰، ۲۶۱ تا ۲۶۲، ۲۶۳ تا ۲۶۴، ۲۶۵ تا ۲۶۶، ۲۶۷ تا ۲۶۸، ۲۶۹ تا ۲۷۰، ۲۷۱ تا ۲۷۲، ۲۷۳ تا ۲۷۴، ۲۷۵ تا ۲۷۶، ۲۷۷ تا ۲۷۸، ۲۷۹ تا ۲۸۰، ۲۸۱ تا ۲۸۲، ۲۸۳ تا ۲۸۴، ۲۸۵ تا ۲۸۶، ۲۸۷ تا ۲۸۸، ۲۸۹ تا ۲۹۰، ۲۹۱ تا ۲۹۲، ۲۹۳ تا ۲۹۴، ۲۹۵ تا ۲۹۶، ۲۹۷ تا ۲۹۸، ۲۹۹ تا ۳۰۰، ۳۰۱ تا ۳۰۲، ۳۰۳ تا ۳۰۴، ۳۰۵ تا ۳۰۶، ۳۰۷ تا ۳۰۸، ۳۰۹ تا ۳۱۰، ۳۱۱ تا ۳۱۲، ۳۱۳ تا ۳۱۴، ۳۱۵ تا ۳۱۶، ۳۱۷ تا ۳۱۸، ۳۱۹ تا ۳۲۰، ۳۲۱ تا ۳۲۲، ۳۲۳ تا ۳۲۴، ۳۲۵ تا ۳۲۶، ۳۲۷ تا ۳۲۸، ۳۲۹ تا ۳۳۰، ۳۳۱ تا ۳۳۲، ۳۳۳ تا ۳۳۴، ۳۳۵ تا ۳۳۶، ۳۳۷ تا ۳۳۸، ۳۳۹ تا ۳۴۰، ۳۴۱ تا ۳۴۲، ۳۴۳ تا ۳۴۴، ۳۴۵ تا ۳۴۶، ۳۴۷ تا ۳۴۸، ۳۴۹ تا ۳۵۰، ۳۵۱ تا ۳۵۲، ۳۵۳ تا ۳۵۴، ۳۵۵ تا ۳۵۶، ۳۵۷ تا ۳۵۸، ۳۵۹ تا ۳۶۰، ۳۶۱ تا ۳۶۲، ۳۶۳ تا ۳۶۴، ۳۶۵ تا ۳۶۶، ۳۶۷ تا ۳۶۸، ۳۶۹ تا ۳۷۰، ۳۷۱ تا ۳۷۲، ۳۷۳ تا ۳۷۴، ۳۷۵ تا ۳۷۶، ۳۷۷ تا ۳۷۸، ۳۷۹ تا ۳۸۰، ۳۸۱ تا ۳۸۲، ۳۸۳ تا ۳۸۴، ۳۸۵ تا ۳۸۶، ۳۸۷ تا ۳۸۸، ۳۸۹ تا ۳۹۰، ۳۹۱ تا ۳۹۲، ۳۹۳ تا ۳۹۴، ۳۹۵ تا ۳۹۶، ۳۹۷ تا ۳۹۸، ۳۹۹ تا ۴۰۰، ۴۰۱ تا ۴۰۲، ۴۰۳ تا ۴۰۴، ۴۰۵ تا ۴۰۶، ۴۰۷ تا ۴۰۸، ۴۰۹ تا ۴۱۰، ۴۱۱ تا ۴۱۲، ۴۱۳ تا ۴۱۴، ۴۱۵ تا ۴۱۶، ۴۱۷ تا ۴۱۸، ۴۱۹ تا ۴۲۰، ۴۲۱ تا ۴۲۲، ۴۲۳ تا ۴۲۴، ۴۲۵ تا ۴۲۶، ۴۲۷ تا ۴۲۸، ۴۲۹ تا ۴۳۰، ۴۳۱ تا ۴۳۲، ۴۳۳ تا ۴۳۴، ۴۳۵ تا ۴۳۶، ۴۳۷ تا ۴۳۸، ۴۳۹ تا ۴۴۰، ۴۴۱ تا ۴۴۲، ۴۴۳ تا ۴۴۴، ۴۴۵ تا ۴۴۶، ۴۴۷ تا ۴۴۸، ۴۴۹ تا ۴۵۰، ۴۵۱ تا ۴۵۲، ۴۵۳ تا ۴۵۴، ۴۵۵ تا ۴۵۶، ۴۵۷ تا ۴۵۸، ۴۵۹ تا ۴۶۰، ۴۶۱ تا ۴۶۲، ۴۶۳ تا ۴۶۴، ۴۶۵ تا ۴۶۶، ۴۶۷ تا ۴۶۸، ۴۶۹ تا ۴۷۰، ۴۷۱ تا ۴۷۲، ۴۷۳ تا ۴۷۴، ۴۷۵ تا ۴۷۶، ۴۷۷ تا ۴۷۸، ۴۷۹ تا ۴۸۰، ۴۸۱ تا ۴۸۲، ۴۸۳ تا ۴۸۴، ۴۸۵ تا ۴۸۶، ۴۸۷ تا ۴۸۸، ۴۸۹ تا ۴۹۰، ۴۹۱ تا ۴۹۲، ۴۹۳ تا ۴۹۴، ۴۹۵ تا ۴۹۶، ۴۹۷ تا ۴۹۸، ۴۹۹ تا ۵۰۰، ۵۰۱ تا ۵۰۲، ۵۰۳ تا ۵۰۴، ۵۰۵ تا ۵۰۶، ۵۰۷ تا ۵۰۸، ۵۰۹ تا ۵۱۰، ۵۱۱ تا ۵۱۲، ۵۱۳ تا ۵۱۴، ۵۱۵ تا ۵۱۶، ۵۱۷ تا ۵۱۸، ۵۱۹ تا ۵۲۰، ۵۲۱ تا ۵۲۲، ۵۲۳ تا ۵۲۴، ۵۲۵ تا ۵۲۶، ۵۲۷ تا ۵۲۸، ۵۲۹ تا ۵۳۰، ۵۳۱ تا ۵۳۲، ۵۳۳ تا ۵۳۴، ۵۳۵ تا ۵۳۶، ۵۳۷ تا ۵۳۸، ۵۳۹ تا ۵۴۰، ۵۴۱ تا ۵۴۲، ۵۴۳ تا ۵۴۴، ۵۴۵ تا ۵۴۶، ۵۴۷ تا ۵۴۸، ۵۴۹ تا ۵۵۰، ۵۵۱ تا ۵۵۲، ۵۵۳ تا ۵۵۴، ۵۵۵ تا ۵۵۶، ۵۵۷ تا ۵۵۸، ۵۵۹ تا ۵۶۰، ۵۶۱ تا ۵۶۲، ۵۶۳ تا ۵۶۴، ۵۶۵ تا ۵۶۶، ۵۶۷ تا ۵۶۸، ۵۶۹ تا ۵۷۰، ۵۷۱ تا ۵۷۲، ۵۷۳ تا ۵۷۴، ۵۷۵ تا ۵۷۶، ۵۷۷ تا ۵۷۸، ۵۷۹ تا ۵۸۰، ۵۸۱ تا ۵۸۲، ۵۸۳ تا ۵۸۴، ۵۸۵ تا ۵۸۶، ۵۸۷ تا ۵۸۸، ۵۸۹ تا ۵۹۰، ۵۹۱ تا ۵۹۲، ۵۹۳ تا ۵۹۴، ۵۹۵ تا ۵۹۶، ۵۹۷ تا ۵۹۸، ۵۹۹ تا ۶۰۰، ۶۰۱ تا ۶۰۲، ۶۰۳ تا ۶۰۴، ۶۰۵ تا ۶۰۶، ۶۰۷ تا ۶۰۸، ۶۰۹ تا ۶۱۰، ۶۱۱ تا ۶۱۲، ۶۱۳ تا ۶۱۴، ۶۱۵ تا ۶۱۶، ۶۱۷ تا ۶۱۸، ۶۱۹ تا ۶۲۰، ۶۲۱ تا ۶۲۲، ۶۲۳ تا ۶۲۴، ۶۲۵ تا ۶۲۶، ۶۲۷ تا ۶۲۸، ۶۲۹ تا ۶۳۰، ۶۳۱ تا ۶۳۲، ۶۳۳ تا ۶۳۴، ۶۳۵ تا ۶۳۶، ۶۳۷ تا ۶۳۸، ۶۳۹ تا ۶۴۰، ۶۴۱ تا ۶۴۲، ۶۴۳ تا ۶۴۴، ۶۴۵ تا ۶۴۶، ۶۴۷ تا ۶۴۸، ۶۴۹ تا ۶۵۰، ۶۵۱ تا ۶۵۲، ۶۵۳ تا ۶۵۴، ۶۵۵ تا ۶۵۶، ۶۵۷ تا ۶۵۸، ۶۵۹ تا ۶۶۰، ۶۶۱ تا ۶۶۲، ۶۶۳ تا ۶۶۴، ۶۶۵ تا ۶۶۶، ۶۶۷ تا ۶۶۸، ۶۶۹ تا ۶۷۰، ۶۷۱ تا ۶۷۲، ۶۷۳ تا ۶۷۴، ۶۷۵ تا ۶۷۶، ۶۷۷ تا ۶۷۸، ۶۷۹ تا ۶۸۰، ۶۸۱ تا ۶۸۲، ۶۸۳ تا ۶۸۴، ۶۸۵ تا ۶۸۶، ۶۸۷ تا ۶۸۸، ۶۸۹ تا ۶۹۰، ۶۹۱ تا ۶۹۲، ۶۹۳ تا ۶۹۴، ۶۹۵ تا ۶۹۶، ۶۹۷ تا ۶۹۸، ۶۹۹ تا ۷۰۰، ۷۰۱ تا ۷۰۲، ۷۰۳ تا ۷۰۴، ۷۰۵ تا ۷۰۶، ۷۰۷ تا ۷۰۸، ۷۰۹ تا ۷۱۰، ۷۱۱ تا ۷۱۲، ۷۱۳ تا ۷۱۴، ۷۱۵ تا ۷۱۶، ۷۱۷ تا ۷۱۸، ۷۱۹ تا ۷۲۰، ۷۲۱ تا ۷۲۲، ۷۲۳ تا ۷۲۴، ۷۲۵ تا ۷۲۶، ۷۲۷ تا ۷۲۸، ۷۲۹ تا ۷۳۰، ۷۳۱ تا ۷۳۲، ۷۳۳ تا ۷۳۴، ۷۳۵ تا ۷۳۶، ۷۳۷ تا ۷۳۸، ۷۳۹ تا ۷۴۰، ۷۴۱ تا ۷۴۲، ۷۴۳ تا ۷۴۴، ۷۴۵ تا ۷۴۶، ۷۴۷ تا ۷۴۸، ۷۴۹ تا ۷۵۰، ۷۵۱ تا ۷۵۲، ۷۵۳ تا ۷۵۴، ۷۵۵ تا ۷۵۶، ۷۵۷ تا ۷۵۸، ۷۵۹ تا ۷۶۰، ۷۶۱ تا ۷۶۲، ۷۶۳ تا ۷۶۴، ۷۶۵ تا ۷۶۶، ۷۶۷ تا ۷۶۸، ۷۶۹ تا ۷۷۰، ۷۷۱ تا ۷۷۲، ۷۷۳ تا ۷۷۴، ۷۷۵ تا ۷۷۶، ۷۷۷ تا ۷۷۸، ۷۷۹ تا ۷۸۰، ۷۸۱ تا ۷۸۲، ۷۸۳ تا ۷۸۴، ۷۸۵ تا ۷۸۶، ۷۸۷ تا ۷۸۸، ۷۸۹ تا ۷۹۰، ۷۹۱ تا ۷۹۲، ۷۹۳ تا ۷۹۴، ۷۹۵ تا ۷۹۶، ۷۹۷ تا ۷۹۸، ۷۹۹ تا ۸۰۰، ۸۰۱ تا ۸۰۲، ۸۰۳ تا ۸۰۴، ۸۰۵ تا ۸۰۶، ۸۰۷ تا ۸۰۸، ۸۰۹ تا ۸۱۰، ۸۱۱ تا ۸۱۲، ۸۱۳ تا ۸۱۴، ۸۱۵ تا ۸۱۶، ۸۱۷ تا ۸۱۸، ۸۱۹ تا ۸۲۰، ۸۲۱ تا ۸۲۲، ۸۲۳ تا ۸۲۴، ۸۲۵ تا ۸۲۶، ۸۲۷ تا ۸۲۸، ۸۲۹ تا ۸۳۰، ۸۳۱ تا ۸۳۲، ۸۳۳ تا ۸۳۴، ۸۳۵ تا ۸۳۶، ۸۳۷ تا ۸۳۸، ۸۳۹ تا ۸۴۰، ۸۴۱ تا ۸۴۲، ۸۴۳ تا ۸۴۴، ۸۴۵ تا ۸۴۶، ۸۴۷ تا ۸۴۸، ۸۴۹ تا ۸۵۰، ۸۵۱ تا ۸۵۲، ۸۵۳ تا ۸۵۴، ۸۵۵ تا ۸۵۶، ۸۵۷ تا ۸۵۸، ۸۵۹ تا ۸۶۰، ۸۶۱ تا ۸۶۲، ۸۶۳ تا ۸۶۴، ۸۶۵ تا ۸۶۶، ۸۶۷ تا ۸۶۸، ۸۶۹ تا ۸۷۰، ۸۷۱ تا ۸۷۲، ۸۷۳ تا ۸۷۴، ۸۷۵ تا ۸۷۶، ۸۷۷ تا ۸۷۸، ۸۷۹ تا ۸۸۰، ۸۸۱ تا ۸۸۲، ۸۸۳ تا ۸۸۴، ۸۸۵ تا ۸۸۶، ۸۸۷ تا ۸۸۸، ۸۸۹ تا ۸۹۰، ۸۹۱ تا ۸۹۲، ۸۹۳ تا ۸۹۴، ۸۹۵ تا ۸۹۶، ۸۹۷ تا ۸۹۸، ۸۹۹ تا ۹۰۰، ۹۰۱ تا ۹۰۲، ۹۰۳ تا ۹۰۴، ۹۰۵ تا ۹۰۶، ۹۰۷ تا ۹۰۸، ۹۰۹ تا ۹۱۰، ۹۱۱ تا ۹۱۲، ۹۱۳ تا ۹۱۴، ۹۱۵ تا ۹۱۶، ۹۱۷ تا ۹۱۸، ۹۱۹ تا ۹۲۰، ۹۲۱ تا ۹۲۲، ۹۲۳ تا ۹۲۴، ۹۲۵ تا ۹۲۶، ۹۲۷ تا ۹۲۸، ۹۲۹ تا ۹۳۰، ۹۳۱ تا ۹۳۲، ۹۳۳ تا ۹۳۴، ۹۳۵ تا ۹۳۶، ۹۳۷ تا ۹۳۸، ۹۳۹ تا ۹۴۰، ۹۴۱ تا ۹۴۲، ۹۴۳ تا ۹۴۴، ۹۴۵ تا ۹۴۶، ۹۴۷ تا ۹۴۸، ۹۴۹ تا ۹۵۰، ۹۵۱ تا ۹۵۲، ۹۵۳ تا ۹۵۴، ۹۵۵ تا ۹۵۶، ۹۵۷ تا ۹۵۸، ۹۵۹ تا ۹۶۰، ۹۶۱ تا ۹۶۲، ۹۶۳ تا ۹۶۴، ۹۶۵ تا ۹۶۶، ۹۶۷ تا ۹۶۸، ۹۶۹ تا ۹۷۰، ۹۷۱ تا ۹۷۲، ۹۷۳ تا ۹۷۴، ۹۷۵ تا ۹۷۶، ۹۷۷ تا ۹۷۸، ۹۷۹ تا ۹۸۰، ۹۸۱ تا ۹۸۲، ۹۸۳ تا ۹۸۴، ۹۸۵ تا ۹۸۶، ۹۸۷ تا ۹۸۸، ۹۸۹ تا ۹۹۰، ۹۹۱ تا ۹۹۲، ۹۹۳ تا ۹۹۴، ۹۹۵ تا ۹۹۶، ۹۹۷ تا ۹۹۸، ۹۹۹ تا ۱۰۰۰

علاوہ ازیں زار روس نے ان ملکوں سے بڑی بڑی رقوم بطور قرض حاصل کی تھیں ان حالات میں روس کی سیاست قدرتی طور پر مغربی یورپ کے مصالح کے تابع تھی۔ علاوہ ازیں زار روس اور اس کی حکومت کے اصل پشت پناہ بڑے بڑے زمیندار اور سرمایہ دار تھے جن کے نمائندے ڈیوما میں اکثریت رکھتے تھے۔ اور خارجی حکومت عملی کے پرجوش حامی تھے۔ روسیانی اعتدال پسند طبقہ کی پارٹی جسے دستوری جمہوری پارٹی کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اگرچہ بظاہر جنگ کی مخالف تھی لیکن درپردہ زار کی بیرونی پالیسی کی حمایت کر رہی تھی۔

آغاز جنگ سے ہی منشویک اور نیچلے درمیانی طبقوں کی پارٹیاں

اشتراکی اصولوں کے پردے میں جنگ کی مؤید تھیں۔ روس کے باہر وہ تمام اشتراکی پارٹیاں جو سیکنڈ انٹرنیشنل کے تحت جرمنی، فرانس اور دیگر ممالک میں قائم تھیں جنگ چھڑنے سے قبل لڑائی کی مخالف تھیں لیکن جب لڑائی شروع ہو گئی تو اپنے ممالک کو جنگی امداد دینے پر آمادہ ہو گئیں۔ اس طرح سیکنڈ انٹرنیشنل کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی۔ اور ہر ملک کی اشتراکی جماعت اپنے ملک کے سرمایہ داروں اور درمیانی طبقوں کا ساتھ دینے لگی۔ صرف بالشویک پارٹی جنگ کی مخالفت کرتے ہوئے اپنی بین الاقوامیت پر ثابت قدم رہی۔ اس نے قومی مفادات اور وطنی احساسات کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ اور تمام ملکوں کے مزدوروں سے مطالبہ کیا کہ وہ جنگی امداد سے ہاتھ اٹھا لیں۔[1]

معاشی بحران اور عوام کا غیظ و غضب

جنگ شروع ہوئے تین سال ہو چکے تھے ہزاروں لاکھوں آدمی موت کے منہ میں جا چکے تھے۔ مزدوروں اور کسانوں کی صفیں ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھیں۔ ملک کی معاشی حالت روز بروز ابتر ہو رہی تھی۔ تقریباً ایک کروڑ چالیس لاکھ آدمیوں کو ان کے معاشی کاروبار سے الگ کر کے فوج میں بھرتی کر لیا گیا تھا۔ زرعی مزدوروں کی کمی کے باعث قابل کاشت زمینیں بیکار ہو گئیں۔ غذائی قلت کی وجہ سے ملک کی عام آبادی فاقہ زدہ ہو رہی تھی اور جہاں کے میدانوں میں لاکھوں افراد کو بہیم شکستیں اٹھانی پڑ رہی تھیں۔ ۱۹۱۶ء تک جرمنی نے پولینڈ اور بالٹک کے بعض صوبوں پر قبضہ کر لیا۔ اس صورت حال نے مزدوروں اور کسانوں اور درمیانی طبقوں کو زار اور اس کی حکومت سے متنفر کر دیا۔ کسان اور مزدور ہی نہیں بلکہ درمیانی طبقہ بھی یہ یقین کرنے لگا تھا کہ زار کی حکومت کامیابی کے ساتھ جنگ نہیں لڑ سکتی۔ جیسے جیسے روسی فوجوں کو شکستیں ہوتی گئیں۔ روس کا معاشی انتشار

---

[1] روس میں مسلمانوں کی تاریخ صفحہ ۱۰۱

toobaa-elibrary.blogspot.com

جنگ جاری تھی۔ جنوری ۱۹۱۷ء میں غذائی صورت حال بہت نازک ہو گئی۔ خام پیداوار اور ایندھن کی فراہمی بالکل مسدود ہو گئی۔ کارخانے بند ہونے لگے جس کی وجہ سے بیروزگاری پھیل گئی۔ ملک کی تمام آبادی یہ محسوس کرنے لگی کہ اس ناقابل برداشت صورت حال سے خلاصی حاصل کرنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ زار کی مستبدانہ حکومت کا خاتمہ کر دیا جائے۔[1]

۸ فروری ۱۹۱۷ء کو پیٹروگراڈ کے ایک کارخانے میں ہڑتال ہوئی۔ ۲۲ فروری کو تمام بڑے بڑے کارخانوں کے مزدوروں نے ہڑتال کر دی۔ ۲۳ فروری کو مرد اور عورتیں بازاروں میں جمع ہو کر بھوک، جنگ اور زار روس کی حکومت کے خلاف مظاہرے کرنے لگے۔ ۲۴ فروری کو اس مظاہرے میں اور شدت پیدا ہو گئی اور ہڑتال کرنے والے مزدوروں کی تعداد تقریباً دو لاکھ ہو گئی۔ پولیس اور مزدوروں کے درمیان جا بجا تصادم ہونے لگے۔ بازاروں میں ہر طرف مزدوروں کے جتھے نظر آتے تھے جن پر یہ نعرے لکھے ہوئے تھے۔

"زار کی حکومت کا تختہ الٹ دو"۔ "جنگ کا خاتمہ کرو"۔ "ہمیں روٹی چاہیے"۔

نوبت یہاں تک پہنچی کہ یہ مظاہرے مسلح بغاوت میں تبدیل ہو گئے۔ مزدوروں نے پولیس سے ہتھیار چھین کر خود کو مسلح کرنا شروع کر دیا۔ ۲۶ فروری کو فوج کے سپاہیوں نے جنہیں مزدوروں پر گولیاں چلانے کا حکم دیا گیا تھا پولیس کے سر بازار پر گولی چلا دی۔ انقلابیوں اور بالخصوص مزدور عورتوں نے فوجی سپاہیوں کو اپنی طرف ملانے کی ایک زبردست مہم شروع کی۔ عورتیں خود سپاہیوں کے پاس جا کر ان سے میل جول بڑھاتیں اور انہیں زار کی حکومت کے خلاف آمادۂ بغاوت کرتی تھیں۔

۲۷ فروری کو پیٹروگراڈ کی مسلح افواج نے مزدوروں پر گولی چلانے سے صاف انکار کر دیا۔ اور انقلابی بغاوت میں عوام کے ساتھ شامل ہو گئیں۔ سپاہیوں اور مزدوروں نے مل کر زار کے وزراء اور قومی جنرلوں کو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ نیز انقلابیوں کو رہا کر دیا جو سرکاری جیل خانوں میں مدت سے قید تھے۔ جب یہ خبر ماسکو اور دوسرے بڑے بڑے شہروں میں پہنچی کہ پیٹروگراڈ (سینٹ پیٹرزبرگ) میں انقلابی جماعت نے زار کی حکومت کا تختہ الٹ دیا ہے تو ہر شہر اور قصبہ میں مزدوروں اور سپاہیوں نے عہدہ داروں کو معزول کرنا شروع کر دیا۔[2]

---

[1] ہاسٹر گیٹ اور نظام ہائے ۱۰۳-۱۰۴

[2] " " " " ۱۰۵-۱۰۶

عارضی حکومت اور بالشویکوں کی کمیٹی کانگریس

۲۰ فروری ۱۹۱۷ء کو چوتھی ڈیوما کے جمہوریت پسند

ڈیوما کے ممبروں نے مشنوں اور ماسکو کی شہری سوویٹ کی ایک عارضی کمیٹی ترتیب دی جس کا صدر ایک شاہ پرست ریسیسلوو تھا۔ چند دن کے بعد اس عارضی کمیٹی نے بالشویکوں سے چھپا کر خفیہ طور پر سوویٹ کے مجلس تنفیذی کے منشویک اور سوشلسٹ انقلابی رہنماؤں کی تائید سے ایک اعتدال پسند عارضی حکومت قائم کی جس کا صدر شہزادہ لووو (۱۸۵۷-۱۹۲۵ء) تھا جسے زار نکولاس دوم جیسا شخص کچھ عرصہ قبل وزیر اعظم بنانے کی فکر میں تھا۔ اس عارضی سوویٹ کی مجلس تنفیذی کے منشویک اور دیگر معتدل پسند لیڈروں نے درمیانی اعتدال پسند طبقوں کے سامنے سپر ڈال دی۔ اور حکومتی اقتدار ان کے حوالے کر دیا۔ بالشویکوں کے احتجاج کے باوجود مزدوروں اور کسانوں کے نمائندوں کے سوویٹ نے کثرت رائے سے اس کارروائی کو منظور کر لیا۔ مزدوروں اور سپاہیوں نے اپنے نمائندوں کو سوویٹوں میں یہ سمجھ کر بھیجا تھا کہ سوویٹ عوام الناس کی مقتدر جماعتیں ہیں۔ اس لئے وہ انقلاب پسند عوام کے جملہ مطالبات کی تکمیل کریں گے۔ لیکن اس توقع میں انہیں مایوسی ہوئی اب روس میں ایک نیا اقتدار وجود پذیر ہوا جس پر درمیانی اعتدال پسند طبقات کا قبضہ تھا۔ لیکن درمیانی اعتدال پسند طبقوں کی حکومت کے علاوہ روس میں ایک اور طاقت بھی کارفرما تھی جس کی تائید و اعانت سے درمیانی طبقوں کو حکومت حاصل ہوئی تھی یہ طاقت مزدوروں اور سپاہیوں کے نمائندوں کے سوویٹوں (Soviet of Workers and Soldiers Deputies) کی تھی۔ سوویٹ درحقیقت اس اتحاد کا مظہر تھے جو مزدوروں اور کسانوں نے زار کی حکومت کے خلاف قائم کیا تھا۔ بالشویکوں کے سامنے اصل کام یہ تھا کہ وہ عارضی حکومت کی ملوکیت پسندی کا پردہ چاک کر کے عوام الناس پر اس کی اصل حقیقت ظاہر کریں۔ نیز انہیں منشویکوں اور سوشلسٹ انقلابیوں کی اس غداری اور بے وفائی سے بھی آگاہ کریں جس کی وجہ سے سوویٹوں میں ان کے نمائندوں نے ملوکیت پسند عارضی حکومت کے قیام پر صاد کیا تھا۔ فروری کے انقلاب کے پانچ دن بعد سے پراودا اخبار پیٹروگراڈ سے شائع ہونے لگا۔ تھوڑے ہی دن گذرے تھے کہ ماسکو میں بھی بالشویکوں کا ایک اخبار نکلنے لگا۔ غرضیکہ بالشویک پھر سے عوام کی تائید حاصل کر رہے تھے۔ کیونکہ عارضی حکومت پر سے عوام کا اعتماد

---

[3] ہاسٹر گیٹ اور نظام ہائے ۱۰۶-۱۰۷

toobaa-elibrary.blogspot.com

اٹھتا جا رہا تھا۔[1]

۱۳ اپریل ۱۹۱۷ء کو لینن روس واپس آیا۔ اور فوراً ہی پوری سرگرمی کے ساتھ اپنا کام شروع کر دیا۔ اس نے اپنے خیالوں پر یہ بات واضح کر دی کہ بالشویک پارٹی اب بھی اقلیت میں ہے۔ اور سوویٹوں پر منشویکوں اور دیگر معاصلحت پسندوں کا قبضہ ہے۔ اس نے یہ بھی صاف صاف بتا دیا کہ ابھی وہ عارضی حکومت کا خاتمہ نہیں کرنا چاہتا بلکہ اس کی پہلی کوشش ہوگی۔ کہ بالشویکوں کو سوویٹوں میں اکثریت حاصل ہو جائے۔ حصول اکثریت کے بعد وہ حکومت کی ترکیب اور پالیسی میں تبدیلی کرنے کی جدوجہد شروع کرے گا۔ لینن نے اس امر پر بھی زور دیا کہ اب بالشویکوں کو اپنی پارٹی کا نام بدلنا چاہیے۔ یعنی معاشرتی جمہوریین کا نام ترک کر کے کمیونسٹ پارٹی کا لقب اختیار کرنا چاہیے۔ لینن نے تھرڈ انٹرنیشنل کے قیام کا بھی مطالبہ کیا۔ کیونکہ سیکنڈ انٹرنیشنل کے تحت جتنی اشتراکی پارٹیاں قائم ہوئی تھیں وہ سب کی سب معاصلحت پسندوں گئی تھیں۔ اور ان میں انقلابی جوش باقی نہیں رہا تھا۔ ادھر بالشویک انقلاب کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ادھر عارضی حکومت خلاف عوام سرگرمیوں میں مصروف تھی۔ ۱۸ اپریل کو حکومت کے وزیر خارجہ نے اعلان کیا کہ ملک تمام بلاشرکت جنگ جاری رکھنا چاہتے ہیں اور عارضی حکومت ان تمام واجبات کی ادائیگی کا ذمہ لیتی ہے جو اس کے حلیفوں نے اس پر عائد کئے ہیں۔ ۱۹ اپریل کو اس اعلان کی خبر مزدوروں اور کسانوں تک پہنچ گئی اور بالشویک پارٹی کی مرکزی کمیٹی سے عوام نے مطالبہ کیا کہ وہ عارضی حکومت کی اس پالیسی کے خلاف مظاہرہ کریں۔ ۲۰ اور ۲۱ اپریل کے مظاہروں میں تقریباً ایک لاکھ مزدوروں نے شرکت کی۔ اسی وقت سے عارضی حکومت ایک نازک صورت حال سے دوچار ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۶ مئی ۱۹۱۷ء کو عوام کے دباؤ سے دو وزیروں کو حکومت سے نکال دیا گیا اور ایک مشترکہ (COALITION) حکومت قائم ہوئی جس میں منشویکوں کے دو نمائندے شامل تھے۔[2]

۲۴ اپریل ۱۹۱۷ء کو بالشویک پارٹی کی چھٹی کانگریس منعقد ہوئی۔ اس کانگریس میں تقریر کرتے ہوئے لینن نے بتایا کہ بالشویکوں کا کام یہ ہے کہ وہ انقلاب کی پہلی منزل سے جس میں اقتدار اعتدال پسند درمیانی طبقوں کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ دوسری منزل کی طرف قدم بڑھائیں جس میں غریب مزدوروں اور کسانوں کو اقتدار ملے۔ کانفرنس میں انقلاب کے مسئلے پر اختلاف رائے بھی پیدا ہوا۔ بعض اراکین نے یہ خیال ظاہر کیا کہ روس ابھی اشتراکی انقلاب

---

[1] تاریخ تحریک روس جلد سوم ص ۱۰۵۷

کے لئے تیار نہیں ہے۔ کانفرنس میں زمین کے مسئلے اور روس کی مختلف قومیتوں کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا۔ زرعی مسئلے کے بارے میں کانفرنس نے یہ قرارداد منظور کی کہ بڑی بڑی جاگیریں ضبط کر کے کسانوں میں تقسیم کی جائیں۔ اور زرعی اراضی کو قومی ملکیت بنا دیا جائے۔ لینن اور ستالن دونوں کی پہلے سے رائے یہ تھی کہ بالشویکوں کو روس کے مظلوم قوموں کی تحریک آزادی کا ساتھ دینا چاہیئے۔ چنانچہ بالشویکوں نے مملکت روس کی مختلف اقوام کی حق خود ارادیت تسلیم کر دیا جس میں یہ حق بھی شامل تھا کہ اگر وہ چاہیں تو روس کی مرکزی حکومت سے الگ ہو کر اپنی جداگانہ مملکتیں قائم کر لیں۔ بالشویکوں کے اس اخلاص کی وجہ سے روس کی تمام مظلوم اقوام ان کے ساتھ ہو گئیں۔[1]

بالشویک ابتلا کے نئے دور میں

اپریل کی پارٹی کانفرنس کے بعد بالشویکوں نے، تاہم ہمت نہ ہاری اور انہوں انقلابی شورش کی تربیت دینے کے لئے ہیں پہنچنے پر کام شروع کیا۔ کارخانوں مزدوروں کی انجمنوں اور سوویٹوں میں کام کرنے کے علاوہ بالشویکوں نے فوج افواج میں بھی اپنا پروپیگنڈا کیا۔ ہر شہر اور ہر قصبہ میں بالشویکوں کی فوجی تنظیمات قائم ہو گئیں۔ مزید برآں انہوں نے محاذ جنگ پر اور ملک کے اندر سپاہیوں کو اپنانے اور انہیں سرگرم انقلابی بنانے کی پوری پوری کوشش کی۔ ۳ جون ۱۹۱۷ء کو تمام ملک کے سوویٹوں کی پہلی کانگریس منعقد ہوئی۔ اس کانگریس میں بالشویک ارکان اقلیت میں تھے۔ سات آٹھ سو منشویکوں اور معاشرتی انقلابیوں کے مقابلے میں بالشویکوں کے صرف سو ڈیڑھ سو تھے۔ لینن نے کانگریس میں تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ صرف سوویٹوں کے حکومت کے قیام سے ملک فاقہ کشی سے بچ سکتا ہے۔ کسانوں کو زمینیں مل سکتی ہیں۔ اور جنگ سے دستبرداری اختیار کی جا سکتی ہے لینن اور بالشویکوں کی مساعی کے باوجود سوویٹوں کی پہلی کانگریس نے عارضی حکومت کی موافقت کی اور اس کی تائید کے لئے سپاہیوں کے نمائندوں نے عارضی حکومت نے انقلابیوں اور فرانسیسیوں کو خوش کرنے کے لئے روسی افواج کو ایک عام اقدام کا حکم دیا۔ روسیالی اعتدال پسند طبقوں کی حکومت کو توقع تھی کہ اس اقدام کامیاب ہو گیا تو عوام کی تائید حاصل ہو جائے گی اور بالشویکوں کی طاقت ٹوٹ جائے گی۔ ناکامی کی صورت میں سارا الزام بالشویکوں کے سر تھوپا جائے گا۔ کہ انہوں نے افواج میں انتشار پیدا کیا۔ بالآخر فوجی اقدام بالکل ناکام رہا۔ جب اس کی خبر پیٹروگراڈ کے مزدوروں اور کسانوں کو ہوئی تو ان میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ بلکہ ہوائی گیریژن پیٹروگراڈ میں حکومت کے خلاف

---

[1] تاریخ تحریک روس جلد سوم ص ۱۰۵۷

toobaa-elibrary.blogspot.com

مظاہرے شروع ہو گئے ان مظاہروں نے بالآخر ایک مسلح مجمع کی صورت اختیار کر لی جس کا مطالبہ یہ تھا کہ سا
حکومتی اختیارات سوویٹوں کو سونپے جائیں۔ بالشویک پارٹی اس موقعہ پر مسلح کارروائیوں کی
مخالف تھی کیونکہ ابھی تک فوج میں اور صوبوں میں کافی انقلابی جوش نہیں پیدا ہوا تھا۔ اگر صرف
دارالسلطنت میں شورش برپا کی جاتی اور صوبوں میں کوئی ہلچل نہ ہوتی تو مخالفین انقلاب کے لئے
شورش کا دبا دینا آسان ہو جاتا۔ لیکن جب بالشویکوں نے دیکھا کہ مجمع کا جوش کسی طرح کم نہیں ہوتا تو وہ بھی
مظاہرے میں شریک ہو گئے تاکہ مجمع کو قابو میں رکھ سکیں۔ باوجودیکہ یہ مظاہرہ بالکل پُرامن تھا لیکن
حکومت نے اس کے خلاف فوج طلب کی اور پیٹروگراڈ کی سڑکوں پر خون کی ندیاں بہا دیں۔ مظاہروں کو کچلنے
کے بعد منشویکوں اور معاشرتی جمہوریین نے جو عارضی حکومت کے رکن رکین تھے بالشویک پارٹی کا قلع قمع
کرنے کی کوشش کی۔ بالشویکی اخباروں کی اشاعت مسدود کر دی گئی۔ ان کے مطابع بند کر دیے گئے۔ بالشویکوں
کو ملک کے ہر گوشہ میں گرفتار کیا جانے لگا۔

۷ جولائی کو عارضی حکومت نے لینن کے نام گرفتاری کا وارنٹ جاری کیا۔ اس طرح عارضی حکومت جس
میں منشویکوں اور معاشرتی جمہوریین جیسے اشتراکی عناصر شامل تھے ملوکیت اور استعماریت کا پورا
مجسمہ بن گئی۔ امن قائم کرنے کی جگہ اس نے جنگ جاری رکھنے کی پالیسی اختیار کی۔ عوام کی آزادیوں کو برقرار رکھنے
کی بجائے اس نے ان آزادیوں کو سلب کرنا شروع کر دیا۔ کسانوں اور مزدوروں کو کچلنے کے لئے تشدد کا
استعمال کیا۔ نتیجۃً وہ دوسرا اقتدار ختم ہو گیا جو حکومت میں سوویٹوں کے منشویک اور معاشرتی انقلابی
نمائندوں کی شرکت کے باعث قائم ہوا تھا۔ حکومت کا اصل اقتدار درمیانی اعتدال پسند طبقات کے ہاتھ میں
آگیا۔ تبدیل شدہ حالات کے لحاظ سے بالشویک پارٹی نے علانیہ طور پر کام کرنے کے بجائے خفیہ طریقہ پر کام کرنا
شروع کیا۔[1]

نئی زندگی نیا کام

بالشویک پارٹی کی ساتویں کانگریس ۲۶ جولائی ۱۹۱۷ء کو مقام پیٹروگراڈ منعقد
ہوئی اجلاسیہ میں صرف کانگریس کے انعقاد کا اعلان کیا گیا تھا۔ اجلاس کا مقام
پوشیدہ رکھا گیا تھا لینن اس کانگریس میں شریک نہ ہو سکا۔ کیونکہ عارضی حکومت نے اس کی گرفتاری کے

---

[1] تحریک انقلاب روس ص ۱۱۰

اپنے کارندے ہر طرف پھیلا رکھے تھے۔ لیکن اس نے اپنے مقام پوشیدگی سے کانگریس کی رہنمائی کی۔ عارضی
حکومت بالشویکوں پر جو مظالم کر رہی تھی اس کی وجہ سے بالشویک پارٹی کی مقبولیت میں اور اضافہ ہو رہا تھا
اور سپاہی منشویکوں اور معاشرتی انقلابیوں کو چھوڑ کر جوق در جوق بالشویک پارٹی میں شرکت کی درخواست
دے رہے تھے۔ عارضی حکومت کے اعتدال پسند عناصر کی روش کے پیش نظر پارلیمانی انقلاب کا امکان ختم ہو گیا اور
ظاہر ہو گیا کہ تشدد اور خوں ریزی کے بغیر انقلاب پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ بالشویکوں کی کانگریس نے اپنے
فیصلوں میں لینن کے اصول پر زور دیا کہ اشتراکی انقلاب کے لئے مزدوروں اور کسانوں کا اتحاد عمل ضروری
ہے۔ کانگریس نے ایک عارضی منشور [illegible] بھی جاری کیا جس میں
مزدوروں، سپاہیوں اور کسانوں کو مسلح بغاوت پر آمادہ ہو جانے اور اعتدال پسند درمیانی طبقوں کے خلاف
قوتیں مجتمع کرنے کی ہدایت دی گئی تھی۔[1]

اعتدال پسند درمیانی طبقوں نے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد اب سوویٹوں کو مٹانے اور
خلاف انقلاب آمریت قائم کرنے کی تیاری شروع کی۔ محاذ جنگ پر جنرل کارنیلوف (KARNILOF)
افواج کا کمانڈر انچیف تھا۔ ان سب سپاہیوں کو موت کی سزا دینے لگا جن کے متعلق اسے انقلابی میلانات
کا شبہ تھا۔ اس نے عارضی حکومت سے مطالبہ کیا کہ مزدوروں اور سپاہیوں کی سوویٹوں کو جڑ سے اکھاڑ
پھینکا جائے۔ متحدین کے نمائندے بھی کارنیلوف پر زور دے رہے تھے کہ انقلابی ہیجان کے خلاف کارروائی کرنے
میں تعویق نہ کی جائے چنانچہ کارنیلوف نے علانیہ طور پر تحریک کو کچلنے کی تیاریاں شروع کیں اور پیٹروگراڈ پر حملہ
کرنے کے لئے فوجیں جمع کیں تاکہ وہاں کے سوویٹوں کو توڑ دیا جائے۔ اور فوجی آمریت قائم کر دی جائے۔ ۱۵ ستمبر
۱۹۱۷ء کو کارنیلوف نے پیٹروگراڈ کے خلاف اپنی افواج کو حرکت دی۔ بالشویکوں کی مرکزی کمیٹی نے
مزدوروں اور کسانوں سے مطالبہ کیا کہ وہ مخالف انقلاب طاقت کا پوری قوت کے ساتھ مسلح ہو کر مقابلہ
کریں۔ چنانچہ مزدوروں نے اپنے آپ کو ہتھیار بند کرنا شروع کیا۔ سرخ محافظ دستے ہر طرف کثیر تعداد میں نظر
آنے لگے۔ مزدوروں کی انجمنوں نے اپنے ارکان کو تیار رہنے کا حکم دے دیا۔ پیٹروگراڈ کے چاروں طرف خندقیں
کھودی جانے لگیں۔ اور ریل کے تمام راستوں کو جو شہر کی طرف جاتے تھے بالکل برباد کر دیا گیا۔ ان سب تدابیر

---

[1] تحریک انقلاب روس ص ۱۱۱

toobaa-elibrary.blogspot.com

کا اثر یہ ہوا کہ کارنیلوف کو اپنی مخالف انقلاب مہم میں ناکامی ہوئی اور اس کی قوت کو کچل دیا گیا۔ کارنیلوف کی شکست نے اس حقیقت پر سے پردہ اٹھا دیا کہ جنگ کو ناقابل برداشت حد تک طوالت دینے سے اور معاشی ابتری کے باعث جو اس طوالت کا لازمی نتیجہ تھا منشویکوں اور معاشرتی انقلابیوں کا اثر عوام پر سے بالکل جاتا رہا۔ نیز یہ امر بھی سب پر عیاں ہو گیا کہ بالشویک پارٹی ایک فیصلہ کن طاقت بن گئی ہے۔ اگرچہ اس پارٹی کو ابھی اقتدار حاصل نہیں ہوا تھا۔ لیکن کارنیلوف کے اقدام کے زمانے میں اس نے حکمران پارٹی کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ کیونکہ مزدور اور سپاہی اس کے احکام و ہدایات پر پوری طرح عمل پیرا تھے۔ کسانوں کا کثیر التعداد حصہ بھی بالشویکوں سے قریب تر آ گیا کیونکہ انہیں یقین ہو گیا کہ صرف بالشویک پارٹی انہیں جنگ کے عذاب سے نجات دلا سکتی ہے اور زمینداروں کی طاقت کو کچل کر انہیں اراضی واپس دلا سکتی ہے۔ ان تمام امور کے پیش نظر یہ ظاہر تھا کہ اب بالشویکوں کی مسلح بغاوت کے لئے حالات سازگار ہو گئے تھے۔[1]

عارضی حکومت کا خاتمہ اور سُرخ انقلاب

۷ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو لینن فن لینڈ سے غیر علانیہ طور پر پیٹروگراڈ آیا۔ ۱۰ اکتوبر کو بالشویکوں کی مرکزی پارٹی کا وہ اجلاس منعقد ہوا جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ چند دنوں میں مسلح بغاوت کا علم بلند کر دیا جائے۔ مرکزی کمیٹی نے اپنے نمائندے ملک کے اطراف و اکناف میں پھیلا دیئے۔ تاکہ وہ پہنچ کر وہ انقلابی یا فیصلہ کارروائیوں کی رہنمائی کریں۔ اسی اثنا میں مخالفین انقلاب بھی اپنی تیاریوں میں مصروف تھے۔ انہوں نے (Military League) کے نام سے ایک مخالف انقلاب تنظیم قائم کی۔ اور افواج کو مجتمع کرنے کے لئے ہر جگہ مستقر قائم کرنے شروع کئے۔

۱۶ اکتوبر کو عارضی حکومت نے لٹویا جنگ سے بعض افواج طلب کیں۔ ۱۸ اکتوبر کو بالشویکوں نے اپنے انقلابی فوجی مجالس کے نمائندوں کو ان تمام فوجی یونٹوں کے پاس رہنمائی کی غرض سے روانہ کیا جو انقلاب کی حامی بن چکی تھیں۔ عارضی حکومت نے ۲۴ اکتوبر کی صبح کو انقلابی تحریک پر اپنا وار کیا۔ اس نے بالشویک پارٹی کے صحافتی ترجمان (Rabochy Put) کی مسدودی کا حکم دے کر اس کی عارضی حالت معطلی

[1] انقلاب اکتوبر جلد ۳ صفحہ ۱۱۳ تا ۱۱۵

کے لئے مسلح فوجی گاڑیاں روانہ کیں۔ لیکن مسرخ محافظ دستوں اور انقلابی افواج نے ان گاڑیوں کو روک کر سڑک پر ایک مزید محافظ فوجی دستہ کھڑا کر دیا۔ اور جنگی اعلانات شائع ہوا جس میں عارضی حکومت کی اطاعت ترک دینے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد عام مسلح بغاوت شروع ہو گئی۔

۲۵ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو مسرخ محافظ دستوں اور انقلابی افواج نے پیٹروگراڈ کے ریلوے سٹیشنوں، ڈاک خانوں، بینکوں، ٹیلی فون مواصلات اور دیگر اسٹریٹجک پوائنٹ پر قبضہ کر لیا۔ پیٹروگراڈ کے مزدوروں نے اپنے عمل سے ثابت کر دکھایا کہ انہوں نے بالشویک پارٹی کی رہنمائی میں بہت اعلیٰ درجہ کی انقلابی تربیت حاصل کر لی ہے۔ فوج کی انقلابی یونٹوں نے بالشویکوں نے مسلح بغاوت کے لئے تیار کیا تھا۔ لیڈروں کی ہدایات پر بغیر کسی دقت کے عمل کر دکھایا۔ اور سرخ محافظ کے ساتھ لڑائی میں شریک رہیں۔ بحریہ نے بھی انقلابی کارروائیوں میں پورا حصہ لیا۔ ۲۵ اکتوبر کو بالشویکوں نے عارضی حکومت کی معزولی کا اعلان کر دیا۔ اسی رات انہوں نے عارضی حکومت کے ارکان کو گرفتار کر لیا۔ اس طرح پیٹروگراڈ کی انقلابی بغاوت پوری طرح کامیاب ہوئی۔ اسی روز سوویٹ کو سوویٹوں کی دوسری کانگریس منعقد ہوئی۔ جس میں بالشویکوں کو بھاری اکثریت حاصل ہوئی۔ منشویکوں اور معاشرتی انقلابیوں نے اقتدار ہاتھ سے جاتے دیکھ کر کانگریس کی کارروائی میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ کانگریس نے باضابطہ طور پر اعلان کیا کہ سارے ملک کی اور حکومتی اختیارات سوویٹوں نے اپنے ہاتھ میں لے لئے ہیں۔ اور عارضی حکومت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اس طرح سے زار شاہی تسلط حکومت کا آخری مینٹ کو بھی دفع کر دیا۔

۲۶ اکتوبر کی شب کو دوسری سوویٹ کانگریس نے متحاربین کو اطلاع دی کہ وہ فوراً تین ماہ کے لئے عارضی صلح کر لیں۔ تاکہ اس دوران میں مستقل صلح کے لئے گفت و شنید کی جا سکے۔ اسی شب کو کانگریس نے زمینی اراضی کے متعلق احکام جاری کئے۔ اور یہ اعلان کیا کہ زمینوں پر سے زمینداروں کا قبضہ بلا معاوضہ ختم کر دیا گیا ہے تمام صدی وسائل جمہور کی مشترکہ ملکیت ہیں دے دیئے گئے ہیں۔[1]

پرولتاری آمریت کا قیام و استحکام

دوسری کانگریس نے سب سے آخری کام یہ کیا کہ پہلی سوویٹ حکومت کی تشکیل کی یعنی جمہور کی مجلس وزراء

[1] انقلاب اکتوبر جلد ۳ صفحہ ۱۱۳ تا ۱۱۵

toobaa-elibrary.blogspot.com

قائم کی جس کا پہلا صدر نشین لینن مقرر ہوا۔ اگرچہ بالشویک پارٹی پیٹروگراڈ میں کامیاب ہو چکی تھی۔ لیکن دو
مقامات پر سوویٹوں کو ملکی اقتدار حاصل کرنے میں دیر لگی۔ بالخصوص ماسکو میں تحت خون ریز کش مکش کے
سوویٹوں کی کامیابی ہوئی۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء اور فروری ۱۹۱۸ء کے درمیان سوویٹ انقلاب کی آگ روس
وسیع ملک کے ہر گوشے میں پھیل گئی۔ اور اکتوبر کا استقلالی انقلاب پورے طور پر کامیاب ہو گیا۔ یہی
کی آرزو تھی۔ اور یہی اس کے پیچے جانشین لینن کی اس طویل جدوجہد کا مقصد تھا۔[1]

اس اقتدار کو مستحکم کرنے کے لئے، متذبذب پیٹی بورژوا درمیانی طبقوں کی معاشی طاقت اور سیاسی اثر
تھا۔ چنانچہ سوویٹ حکومت نے برسر اقتدار آتے ہی جاگیرداری کے آثار و باقیات کو ایک ایک کر کے
شروع کیا۔ اس سلسلے میں نئی حکومت نے پہلا کام یہ کیا کہ تمام جاگیرات ضبط کر لیں۔ مذہب اور قومیت کی
پر جو امتیازات زار کی حکومت میں روا رکھے گئے تھے انہیں اٹھا لیا گیا۔ کلیسا کو ریاست سے اور مدارس
سے الگ کر دیا گیا۔ عورتوں اور مردوں کے درمیان مساوات قائم کر دی گئی۔ درمیانی طبقوں کا معاشی طاقت
توڑنے، اور سوویٹ معیشت کے قیام کی غرض سے بینکوں، ریلوں، بیرونی تجارت اور جملہ بڑی بڑی صنعتوں
کو اجتماعی ملکیت قرار دے دیا گیا۔ بیرونی سرمایہ داروں کے چنگل سے رہائی حاصل کرنے کے لئے سوویٹ
نے اعلان کیا کہ زار کی حکومت اور عارضی حکومت نے بیرونی ممالک سے جو قرضہ جات حاصل کئے تھے سوویٹ
حکومت ان کی ادائیگی کی ذمہ دار نہیں ہے۔ ان تدابیر سے درمیانی طبقوں، مخالف انقلابی عناصر اور رجعت
پسند عناصر کی طاقت پر مہلک ضرب لگائی گئی۔ لیکن جرمنی اور آسٹریا ہنگری سے جنگ جاری تھی
حکومت کو استقلال نصیب ہونا مشکل تھا۔ اس لئے بالشویک پارٹی نے صلح کے لئے سلسلۂ مذا
شروع کی اور تمام متحارب حکومتوں سے مطالبہ کیا کہ وہ فوراً ایک منصفانہ صلح کی گفت و شنید شروع
لیکن فرانس اور انگلستان کی حکومتوں نے انکاری جواب دیا جس کے بعد بالشویکوں نے جرمنی سے صلح
گفت و شنید کا آغاز کیا۔ سوویٹ حکومت چاہتی تھی کہ وہ جرمنی سے منصفانہ اور نامواقف شرائط پر صلح
کیونکہ اسی تدبیر سے وہ اقتدار کو مستحکم کرنے اور ایک نئی فوج (سرخ فوج) منظم اور تیار کرنے کی مہلت حاصل
کر سکتی تھی۔ چنانچہ فروری ۱۹۱۸ء میں بالشویکوں اور جرمنوں کے درمیان برسٹ لٹوسک

---

[1] اشتراکیت اور نظام اسلام صفحہ ۱۱۵، ۱۱۶

طے پائی جس کی رو سے بالٹک کی تمام ریاستوں (ٹیوبا، استھونیا وغیرہ) سے روس کو ہاتھ دھونا پڑے
ین کے صوبے کو بھی جرمنوں نے روس سے خارج کر کے ایک باجگذار ریاست بنا لیا۔ علاوہ ازیں
ت حکومت کو جرمنوں سے تاوان جنگ کی ادائیگی کا وعدہ کرنا پڑا۔ اسی زمانہ میں بالشویک پارٹی
یں کانگریس منعقد ہوئی جس میں طے پایا کہ پارٹی کا نام "روسی کمیونسٹ پارٹی" رکھا جائے[1]

---

[1] اشتراکیت صفحہ ۱۱۵، ۱۱۶

toobaa-elibrary.blogspot.com

باب چہارم

سوشلزم کی چیرہ دستیاں

○

فکری سفر ایک طویل عملی جدوجہد کے بعد بالآخر سوشلزم کے وہ مقام..... اقتدار.. نصیب ہوا جس کے
ں نے اس پروگرام کو عملی جامہ پہنایا تھا جس کی کشش اور جاذبیت نے محنت کشوں کو اپنی طرف مائل
س کی کرشمہ ساز اصول نے ان کو بیحد مسحور اور بے حال کر دیا تھا۔ کہ بلا توقف اور بغیر کسی جھجک کے بڑی
ل سے خاک و خون میں تھڑپ جانے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ یہ پروگرام کیا تھا؟ آزادی اور ہر قسم کی آزادی۔ یعنی جین
یب کی آزادی، تہذیب و تمدن کی آزادی۔ سیاست و معاشرت کی آزادی۔ قومی روایات اور ثقافت کی آزادی
ں اس میں وہ ساری آزادیاں شامل تھیں جس کی امید دلا کر کسی انسان کو دھوکہ دیا جا سکتا ہے۔ اور اس کو اپنی
ب بناری کے لئے آلہ کار کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

مجوزہ پروگرام میں تو بڑی بڑی آزادیاں، اور معاشی مساوات کی دلفریبیاں مگر افسوس! اگر کرسی اقتدار پر
ان ہو جانے کے بعد ان میں سے کوئی چیز بھی سوشلسٹوں کی عملی پالیسی میں جگہ نہ پا سکی۔ آزادیوں کا گلا
ونٹا گیا اور ایسا گھونٹا گیا۔ کہ تاریخ اس کو کوئی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ اور معیشت کا وہ فرق جس کے مٹانے
ے یہ خون ریز انقلاب برپا کیا گیا تھا پہلے سے بھی زیادہ مہیب اور بھیانک شکل میں نمودار ہوا۔ روس میں
مسلمان قوموں کے ملی شیرازے کو بکھیرنے کے لئے اس ظالم و جابر نے کیا کیا مظالم اپنی آہنگنڈے سے استعمال کئے
پنے توسیع پسندانہ عزائم کی تکمیل کے لئے مکاری و عیاری کے کیا کیا نمونے قائم، اور ظلم و ستم کی کیسی
ستانیں قائم کیں۔ اس باب میں انہی حقائق کا بالاختصار بیان ہوگا۔

○

toobaa-elibrary.blogspot.com

قول و فعل کا تضاد

سوشلسٹ انقلاب برپا ہوتے ہی ملک میں خانہ جنگی چھڑ گئی۔ زار کی حامی سفید فوجیں، سرخ انقلابی فوج سے جنگ آزما تھیں۔ کئی محاذوں پر سرخ فوجیں بُری طرح پسپا ہو رہی تھیں۔ سرکشی کرنے کو ملک کی تمام باشوکیوں کے بارے میں تھی، مگر چند ہفتے بعد شہر چھوڑ کر سارا ملک ان کے دائرۂ اقتدار سے باہر تھا۔ ایسی حالت میں انہوں نے روس کے مسلمانوں کی ہمدردیاں جیتنے اور ان کا تعاون حاصل کرنے کے لئے ایک اعلان جاری کیا جو سوشلسٹ روس کی تاریخ میں روسی انقلاب کا اعلان کہلاتا ہے۔ اس پر لینن کے دستخط تھے۔ اس میں کہا گیا تھا۔

• روس کے مسلمانو! وولگا اور کریمیا کے ترکو اور تاتارو ترکستان کے سارتو، قزاقس کرغیز کے ترکو اور تاتارو، اور وہ سب لوگو جن کی مسجدیں اور عبادت گاہیں تباہ کر دی گئیں اور جن کا مذہب روسی زاروں اور ظالم فرمانرواؤں نے پامال کر دیا۔ آج سے تمہارے دین و ایمان، تمہاری روایات، تمہارے قومی اور ثقافتی اداروں کی آزادی اور عزت و تحفظ کا اعلان کیا جاتا ہے۔ اپنی قومی زندگی کی تعمیر آزادی سے اور بے روک ٹوک کرو۔ یہ تمہارا حق ہے۔ سوویٹ یونین تم سے صرف تعاون چاہتی ہے۔ عوامی کمیساروں کی کونسل نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ مختلف قوموں کے متعلق اپنی پالیسی کی بنیاد مندرجہ ذیل اصولوں پر رکھے گی:

۱۔ روسی مسلمانوں کو مساوی حقوق اور حاکمیت حاصل ہوگی۔

روسی قوموں کو حق خود اختیاری حاصل ہوگا۔ نیز انہیں روس سے الگ آزاد ریاستیں قائم کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

قوموں کے حق خود اختیاری اور آزاد قومی ریاست کی مزید تشریح قومیتوں کے عوامی کمیسار Peoples Commissar of the Nationalities سٹالن نے مندرجہ ذیل الفاظ میں کی:۔

• تمام ملکوں کی سوشلسٹ جمہوریت اقوام کے حق خود ارادیت کو تسلیم کرنے کا اعلان کرتی ہے۔ کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی قوم کی رسوم گاہوں اور قوانین کو تباہ کرنے اور اس کے رسم و رواج اور عادات و روایات کو مٹانے کے لئے اس کی زندگی میں مداخلت کرے۔[1]

لینن اور سٹالن کے یہ اعلانات بظاہر بڑے دلفریب، جاندار اور وزن دار معلوم ہوتے ہیں اور ان کو سن کر ان کی نیک نیتی اور انسان دوستی کا یقین ہونے لگتا ہے۔ لیکن عمل کی نوبت میں ان کی عملی کارگذاریوں کا مطالعہ کیا جائے تو قول و فعل کے تضاد کا وہ بدترین نمونہ سامنے آجاتا ہے کہ انسانی عظمت و شرافت دم بخود ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور "ناطقہ سر بگریبان کہ اسے کیا کہئے" والی کیفیت سے دوچار ہو جاتی ہے۔

زار شاہی حکومت کے خاتمہ کے بعد عبوری حکومت کے قائم ہوتے ہی مسلمان علاقوں نے روس کا سامراجی جوا اتار پھینکا اور اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ سوشلسٹ انقلاب کے بعد اشتراکی قائدین نے بیانات ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اپنے حامی دین اسلام ہونے کے دعوے کے ثبوت کے طور پر کچھ عملی قسم کے اقدامات بھی کئے۔ سٹالن نے ۲ دسمبر ۱۹۱۷ء کو قرآن کریم کا ایک نسخہ جو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منسوب تھا اور پیٹرو گراڈ میونسپل لائبریری میں محفوظ تھا، مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ جنوری ۱۹۱۸ء میں قازان کی ایک تاریخی یادگار مینار سوم بیک بھی ایک کمیٹی کی نگرانی میں دے دیا۔

یہ زبانی بیانات اور عملی اقدامات مسلمانوں کو یہ باور کرنے کے لئے کئے جاتے رہے کہ سرخ انقلابی زمرہ یہ کہ دین و مذہب میں عدم مداخلت کی پالیسی کے پابند ہیں بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر وہ تو اسلام اور مسلمانوں کے لئے اپنے دل کے اندر ایک نرم گوشہ بھی رکھتے ہیں اور ان کی خیر خواہی اور ملی نشوونما کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

---

[1] Richard Pipes, the Formation of the Soviet Union Communism and Nationalism (1955) P 155

[2] Agha Shaukat Ali Modernization of Soviet Asia - P 27

toobaa-elibrary.blogspot.com

اگرچہ یہ سب کچھ اشتراکیت کے دکھاوے کے دانت تھے اور مسلمانوں کو زار کی سفید فوجوں کی حمایت و تعاون سے باز رکھنے کی منافقانہ تکنیک تھی تاہم بڑی مؤثر ثابت ہوئی۔ مسلمانوں کی بھاری تعداد ان کے دام فریب میں آگئی اور سوشلسٹ روس کو اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگی۔

سوشلسٹوں کی یہ ظاہرداری اس وقت تک برابر جاری رہی جب تک کہ سفید فوجیں ہی کچھ بھی دم خم باقی تھی لیکن جونہی ان کی قوت مزاحمت کمزور پڑ گئی اور سوشلسٹ حکومت کے پاؤں مضبوطی سے جم گئے تو اس نے "اعلانِ انقلاب کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اس کی فوجیں غاصب فرماں رواؤں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ان نوآزاد ریاستوں پر چڑھ دوڑیں اور انہیں ایک ایک کر کے نگل گئیں۔

سامراجی ہتھکنڈے

نیا سامراج اپنے پیشرو زارشاہی سامراج سے کسی طرح بھی کم نہیں بلکہ اس حیثیت سے تو اس سے بھی بدتر ثابت ہوا کہ زارشاہی استبدادی دور میں روس کی محکوم قوموں کا اپنا اپنا قومی وجود اور تشخص بھی کسی نہ کسی صورت میں باقی اور برقرار رہا۔ اور وہ ایک حد تک اپنی قومی روایات کے پابند بھی رہے۔ لیکن سوشلسٹ روس میں ان کے انفرادی تشخص کو کسی ادنیٰ سے ادنیٰ شکل میں بھی برداشت نہیں کیا گیا۔ یہاں تو تمام لوگوں کو ماسکو کے تراشیدہ ایک ہی الحادی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی جاتی رہی اور اس کے لئے ہر قسم کے حیلے بہانے اختیار کئے جاتے رہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی نہایت سخت جان قوم اپنی دینی جدت کے مقابلے میں دینی یا قومی رجعت و قدامت سے چمٹی رہی اور اپنی قومی زندگی کی حفاظت سے دست بردار ہونے پر راضی نہ ہوئی۔ تو اس کی ہستی تک کو ملیامیٹ اور زیر و زبر کرنے میں بھی کسی تامل کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ اور بلا توقف اس کے سینہ رسیت کو منقطع کرنے کا بندوبست کیا گیا۔

نوآزاد قوموں کو روس کا غلام بنانے کے لئے اشتراکی منصوبہ ساز ایک خاص ترتیب سے سامراجی داؤ پیچ استعمال میں لاتے ہیں۔ ان کے سامراجی ہتھکنڈوں کا استعمال کچھ اس ترتیب سے ہوتا ہے کہ اولاً تو متعلقہ قوم ہی کے چند فریب خوردہ سادہ لوح یا بے حمیت ضمیر فروش آدمیوں سے مقامی سوشلسٹ پارٹی کی ڈولی بھائی اور پھر اس کی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے ہر قسم کی امداد دی جاتی۔ نمائندہ پارٹی کے رہنماؤں اور حامیوں کو مرکزی پارلیمنٹ، زیریں ایوانوں اور حکومت کے انتظامی اداروں میں وہ یا اختیار حاصل آسانیاں دلائی جاتی ہیں

روسی حکومت کی ساری پالیسیاں ان کی صواب دید پر مبنی ہیں

اس مرحلے پر پہنچ کی مقامی حکومت کی بیشتر توانائیاں مقامی لوگوں کی تنسیخ مسخ کرنے اور ان کو ان کے کہنے پر صرف ہوتی ہیں۔ اس اہم میں ہم نہاد مذہبی پیشواؤں کی خدمات بالخصوص حاصل کی جاتی ہیں۔ شاذ ہی کے اس ناپاک قسط کے خلاف حکومت کے اندر یا باہر سے اگر کوئی موثر آواز قومی تحریک اٹھتی تو پہلے حلقوں سے اس کی مزاحمت کرائی جاتی بالصورت دیگر روس نواز اقلیت کی اکثریت اور مظلومیت کی تشہیر و پروپیگنڈا کر کے فوجی اقدام کا جواز پیدا کر لیا جاتا۔ اور پھر ایک لامتناہی جارحیت کے ذریعے پورے علاقے کو نوآبادی میں تبدیل کر لیا جاتا۔

اپنے بالواسطہ یا بلاواسطہ اقتدار کے ابتدائی زمانے میں مذہب اور اہل مذہب کی بابت انتہائی رواداری کا رویہ روسی سوشلسٹوں کا معروف و مشہور تکنیک چلا آرہا ہے۔ جس کو انہوں نے بلا استثناء ہر جگہ روبہ عمل رکھا ہے۔ لیکن جونہی ان کو رسوخ حاصل ہو جاتا ہے بڑی بے جگری سے گلہ آور ہوتے ہیں۔ اور اس وقت تک دم نہیں لیتے جب تک دلوں کا فاتحہ پڑھ نہ لیا جاتا ہے۔

پھر بات یہیں آکر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ مستقبل کے ہر خدشے کا ازالہ کرنے کے لئے مفتوحہ علاقوں کی قبائلی، جغرافیائی بنیادوں پر تقسیم در تقسیم در اس کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کا عمل شروع کیا جاتا ہے تاکہ ان کے ممکنہ مزاحمت کی بالقوت ہی باقی نہ رہے۔

ایران، ترکی، افغانستان، کریمیا، آذربائیجان اور ترکستان کے مسلمان علاقوں کو ہضم کرنے کے لئے موقع محل کی مناسبت سے کم و بیش یہی ہتھکنڈے استعمال کئے گئے۔ اسی طرح سے فنلینڈ اور بلغاریا کو بھی روس کی اسی قسم کی فتوحات میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ جنگِ عظیم دوم کے معاً بعد عیسائی اکثریت والے علاقے، یعنی مشرقی جرمنی، چیکوسلواکیہ، ہنگری، رومانیہ اور بلغاریہ میں قریب قریب یہی عمل دہرایا گیا۔ اور اسی خاطر خواہ نتائج پیدا ہوئے۔

ہم یہاں روس میں مسلمان علاقوں کے انضمام کی مختصر سی تفصیلات بیان کرتے ہیں تاکہ اس کی روشنی میں اس طریقے اور پھیلتے ہوئے سامراج کے عمل خدوخال دیکھے جا سکیں، اور افغانستان اور پاکستان کے مسلم ملک اس کی تازہ ترین پالیسی کے مختلف مراحل کا سنجیدہ مطالعہ کیا جا سکے۔

---

toobaa-elibrary.blogspot.com

ایدل اورال[1]

روس میں بالشویک حکومت قائم ہوتے ہی ماسکو میں کل روسی مسلم کانگریس منعقد ہوئی جس میں تمام روسی مقبوضات کے نمائندے شریک ہوئے۔ کانگریس نے بھاری اکثریت سے مسلمان علاقوں کی خود مختاری کی تجویز منظور کی، اور ایک مفصل منصوبہ تیار کیا۔ روسی حکومت سے مذاکرات اور مسلمانوں کے نقطۂ نظر پیش کرنے کے لئے ملی شوریٰ منتخب کی۔ ملی شوریٰ کا مرکز پیٹروگراڈ قرار پایا۔ اور اس کی صوبائی شاخیں قائم کر دی گئیں۔ اہم ترین شاخیں قازان اور اوفا میں تھیں۔

سوشلسٹ انقلاب کے بعد لینن اور سٹالن نے مسلمانوں کو اپنے ناپاک عزائم کا شکار بنانے کے لئے روز اول ہی سے دام تزویر بچھانا شروع کیا تھا۔ اور جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں انہوں نے نہ صرف پرفریب اعلانات کئے بلکہ عملی قسم کے اقدامات کر کے مسلمانوں کے دل جیتنے کی کوشش بھی کی۔ مسلمانوں کو آزاد پرچم تلے مجتمع ہوتے ہوئے دیکھ کر انہوں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ قومیتوں کے عوامی کمیسار مسٹر سٹالن نے ۱۹۱۷ء میں ملی شوریٰ کے صدر احمد بے زلیکوف سے رابطہ قائم کیا اور اپنی حکومت کو تسلیم حاصل کرنے کے لئے معقول اور مفید شرائط قبول کرنے کی تجویز پیش کی۔ احمد بے نے یہ تجویز ملی شوریٰ کی طلب کردہ مجلس ملت کے جلسے کو دی جس کا اجلاس اوفا میں ہو رہا تھا۔ مجلس نے اس پیشکش کو مسترد کر دیا اور ایدل اورال ریاست اور داخلی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اور دستور ساز اسمبلی بنانے کا فرمان جاری کیا۔ اس تو آزاد ریاست کا سربراہ صدر مقصودی قرار پایا۔

لینن اور سٹالن نے جب دیکھا کہ مسلمان ان کے دام فریب کا آسانی سے شکار ہونے والے نہیں تو خفیہ دل سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔ جنوری ۱۹۱۸ء کو روسی مسلمانوں پر کنٹرول حاصل کرنے کے لئے روسی مسلمانوں کی مرکزی کمیساریٹ قائم کر دی گئی۔ اور قازان سوشلسٹ کمیٹی کے چیئرمین ملا نور وحیدوف کو اس کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ ملا اس کو تاتاریوں میں پھوٹ ڈالنے کا کام سپرد کیا گیا۔ سوشلسٹوں نے مسلمان ملا کے ایک طبقے کو اسلام اور سوشلزم کا قریبی رشتہ ثابت کرنے اور دنیا سے اسلام کو سوشلسٹوں کے حق میں ہموار کرنے کے لئے خوب خوب

---

[1] ایدل ایک دریا ہے۔ اور اورال ایک پہاڑ ہے۔ دریائے ایدل اور کوہ اورال کے درمیانی علاقے کو ایدل اورال کہتے ہیں۔ اب تک یہ علاقہ روس کا حصہ چلا آیا ہے۔ (۱۹۶۷ء)

استعمال کیا۔ ان بے بصیرت روایتی نام نہاد علماء نے سوشلزم کو عین اسلام قرار دیا۔ اسلامی سوشلزم کی اصطلاح پہلی مرتبہ انہی لوگوں نے استعمال کی۔ ان کا لیڈر ایک داعستانی ملا تراخ کو حاجی تھا۔ ایدل اورال میں یہ خدمت رسولوف نامی ملا سے لی گئی۔

ملا نور وحیدوف نے اپنے آقاؤں کا تفویض کردہ کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ مسلم کمیساریٹ قائم ہوتے ہی تاتاریوں کے قومی محاذ میں تشکاف پڑ گیا۔ ان کا ایک گروہ ملا صاحب کی قیادت میں کمیونسٹوں سے جا ملا۔ ۸ فروری ۱۹۱۸ء کو قازان میں دوسری عربی شوریٰ[1] منعقد ہو رہی تھی۔ نور وحیدوف پیٹروگراڈ سے قازان پہنچا۔ اور ترغیب و تحریص اور ریشہ دوانیوں کے ذریعے تاتاریوں کی خاصی بڑی تعداد کو غداری پر آمادہ کر لیا۔ ۱۰ فروری کو غدار تاتاری عربی شوریٰ کے اجلاس سے نکل گئے۔ اور تاتاری فوجیوں پر مشتمل الگ فوج بنالی تاہم اکثریت عربی شوریٰ کے ساتھ تھی۔ اور انہوں نے ایدل اورال کی حکومت کے قیام کی توثیق کر دی۔

مسلمانوں کو چھانٹنے کے بعد کمیونسٹوں نے فوری کارروائی کی۔ قازان کے یورپی حصے میں کمیونسٹ دستے پہلے ہی موجود تھے۔ پیٹروگراڈ سے مزید فوج پہنچ گئی۔ ۱۲ فروری کو قازان میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ عربی شوریٰ کے رہنما اور کارکن گرفتار کر لئے گئے۔ جو بچ نکلے انہوں نے قازان کے مضافات میں پناہ لی۔ اور مورچے جمانے لگے۔ عین وقت پر عربی شوریٰ کے بعض دستوں نے جنہیں غدار ملا نور وحیدوف نے اندر ہی اندر سے ورغلایا تھا، حرکت سے انکار کر دیا۔ تاہم پیچھے کھچے آزاد تاتاری اپنی جانوں پر کھیل گئے۔ زبردست مزاحمت کے بعد کمیونسٹوں نے مورچے توڑ ڈالے۔ اور شہر کے تاتاری علاقے اور مضافات پر قبضہ کر لیا۔ عربی شوریٰ، مجلس ملت ملی شوریٰ اور مسلمانوں کی دوسری تحریکیں خلاف قانون قرار دے دی گئیں۔ اور مسلمان فوجی دستے توڑ دیے گئے۔ مارچ ۱۹۱۸ء میں روسی سوویٹ فیڈریشن کی "تاتار سوویٹ جمہوریہ" کی تشکیل کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ سوویٹ ری پبلک ایدل اورال کی اس آزاد مملکت کی متبادل صورت تھی جس کا خواب شکست کھانے والے قوم پرست تاتاریوں نے دیکھا تھا۔ اب اس پر کمیونسٹوں کی حکومت تھی۔ اس نئی ریاست کی حدود اس طرح متعین کی گئی تھیں کہ روسی آبادی والے وسیع علاقے اس میں شامل کئے گئے تھے۔ کچھ چھوٹے اقلیتی

---

[1] پہلی عربی شوریٰ جنوری ۱۹۱۷ء میں قازان میں منعقد ہوئی تھی۔ عربی شوریٰ اور روسی افواج کے مسلمان جوانوں پر مشتمل فوج بنانے کا فیصلہ دوسری کل روس مسلم کانگریس کے اجلاس میں کیا گیا تھا جو انہی تاریخوں میں قازان ہی میں منعقد ہوا تھا۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

گروپ (چارس اور چیرس) بھی اس کے ساتھ ملا دیے گئے تھے۔ اور اس کی بھوکی آبادی میں تاتاریوں اور باشکیریوں کی کامل اکثریت نہیں تھی۔ چنانچہ ۱۹۱۰ء میں وحیدوف نے اپنی کیسا ریٹ کی صوبائی شاخوں کی ایک کانفرنس طلب کی اور مسلمان کمیونسٹوں کی ایک دوسری جماعت قائم کر دی۔ اس کی اپنی مرکزی کمیٹی تھی اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد روس میں وسیع پیمانے پر خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اس خانہ جنگی میں بیلکو سلاوی فوجوں اور بالشویک دستوں کے مابین خون ریز جھڑپیں ہوئیں۔ وولگا بیلکو سلاوی قومیت میں بالشویکوں کی مخالف قومیت قائم ہو گئی۔ بیلکو سلاوی فوجوں نے قازان پر قبضہ کر لیا۔ جو لوگ پکڑے گئے اس میں وحیدوف بھی تھا اسے پھانسی دے دی گئی۔ اس کے بعد پورے ایک سال تک ایسل اورال کا علاقہ سرخ و سفید روسی فوجوں کے درمیان خانہ جنگی کا منظر پیش کرتا رہا۔ تاتاریوں کو دونوں فوجوں نے بُری طرح تاخت و تاراج کیا اور ان کے مستقبل کے منصوبے عرصۂ تعویق و التوا میں پڑ گئے۔[1]

جو بقیہ مسلمان اورال میں باشکیری آبادی تھے۔ یہ لوگ دراصل تاتاریوں ہی کی شاخ تھے۔ روسی انقلاب ہوا تو باشکیری تاتاریوں اور کمیونسٹوں کی کش مکش سے الگ تھلگ رہے۔ جدیت پسندوں نے اعوزکی دولت کی قیادت میں کل باشکیر کرلتائی (دستور ساز اسمبلی) اورنبرگ کے مقام پر طلب کی۔ اسمبلی نے آزاد باشکیر حکومت قائم کر دی۔ یہاں بھی کمیونسٹوں نے افتراق انگیز ہتھکنڈوں سے کام لیا۔ شریف سلطان اوف نے ملا وحیدوف کا کردار ادا کیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سمیت کمیونسٹوں کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ سلطان نے اس کی پشت پناہی کی۔ اور سنٹرل مسلم کمیسریٹ کا نائب صدر بنا دیا۔ فروری ۱۹۱۸ء میں کمیونسٹ حکومت نے زکی ولیدوف کو گرفتار کر لیا مگر وہ انہیں جُل دے کر نکل گیا۔ وہ باشکیری فوج جمع کر کے امیر البحر کولچک کی سفید فوجوں سے جا ملا۔ کولچک اب بھی زاروں کے توسیع پسندانہ سامراج کا علمبردار تھا اس لئے زکی ولیدوف کو اس کا ساتھ چھوڑنا پڑا۔ اس نے لینن اور سٹالن سے ملاقاتیں کیں۔ اور بعض یقین دہانیوں پر اعتماد کر کے معاہدہ طے کر لیا۔ اور باشکیری دستے سرخ افواج کے ساتھ جا ملے۔ لیکن چند روز بعد بھیڑیئے نے بھیڑ کی وہ کھال اتار پھینکی جو اس نے باشکیری کو اپنی ہوس استعمار کا شکار بنانے کے لئے پہن لی تھی۔ پہلے ان لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ جنہیں کمیونسٹوں پر اعتماد تھا اور جو ولیدوف کے پالیسی کے بھی مخالف تھے۔ پھر ولیدوف کے اپنے ساتھی یکے بعد دیگرے غائب ہونے لگے۔ خود زکی ولیدوف نے بھاگ کر اپنی جان بچائی اور

[1] روس میں اسلام، لوئیس

بسماچی تحریک میں شامل ہو گیا۔ ۲۲ مارچ ۱۹۱۹ء کو باشکیریہ سوویٹ جمہوریہ قائم کر دی گئی۔

باشکیری تاتاری نسلی اور ثقافتی اعتبار سے تاتاریوں ہی کا ایک حصہ تھے۔ ان کی زبان بھی ایک تھی۔ لیکن اس [illegible] ریاست کے قیام سے کمیونسٹوں نے سیاسی فوائد حاصل کئے۔ تاتاریوں کی اس قوت کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا جو ایک ریاست کی صورت میں وجود پذیر ہو سکتی تھی۔ اس طرح ایک طرف جمہوریہ باشکیریہ اور دوسری طرف جمہوریہ تاتاریہ میں روسی آبادی کو جو ملک کی سیاسی اور معاشی زندگی پر چھائی ہوئی تھی تعداد کے لحاظ سے بھی برتری حاصل ہو گئی۔ تاتاری دونوں ریاستوں میں اقلیت بن گئے۔

تاتاری محکوم روسی مسلمانوں میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ تھے۔ افسری و سیاسی رہنمائی ان کے ہاتھ میں تھی ان کی اس قوت کو اس طرح غیر مؤثر کرنے کے بعد ان کی ثقافتی، فکری اور علمی اداروں پر ضرب کاری لگائی گئی۔ [illegible] سائبیریا۔ یوکرین، قفقاز اور اورال میں تاتاری اخبارات، درسگاہیں اور دوسرے علمی اور ثقافتی ادارے بند کر دیے گئے۔ اس طرح روسی مسلمانوں کو سیاسی، فکری، تہذیبی اور ثقافتی رہنمائی سے محروم کر دیا گیا۔ اس اقدام سے تاتاری خود بھی بحیثیت قوم متاثر ہوئے۔ ان کی آبادیاں روس کے طول و عرض میں جا بجا پھیلی ہوئی تھیں۔ ان آبادیوں کا باہمی رابطہ تاتاری اخبارات اور درس گاہوں کے ذریعے قائم تھا۔ اب روسی آبادی کے وسیع سمندر میں منتشر جزیرے بن کر رہ گئیں۔ جن کا آپس میں کوئی تعلق نہ تھا۔ اور اس سمندر میں اٹھنے والا ہر جھاگ جنہیں ہر لمحہ اپنی لپیٹ میں لیتا جا رہا تھا۔

کمیونسٹوں نے تاتاریوں کو صرف ٹکڑوں ہی میں تقسیم کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کے اندر مزید تفرقہ

---

[1] [illegible] شکست کے بعد کولچک پسپا ہوتا ہوا اومسک پہنچا جہاں حریت پسند گیارہ ماہ تک اس کو روکے رہے۔ کمیونسٹ مسلمانوں کو اس جدوجہد آزادی کو بسماچی تحریک کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ بسماچی روسی زبان کا لفظ ہے۔ یہ ترکی لفظ باسمق سے نکلا ہے۔ جس کے معنی ہیں دبانا، پامال کرنا۔ حملہ کرنا۔ حریت پسندوں کے لئے یہ نام [illegible] کمیونسٹوں کے مقابلے میں روسی زاروں کے زمانے میں بھی حریت پسندوں نے پرچم آزادی بلند کیا تھا اسی طرح [illegible] اس تحریک کا ذکر بڑے شاندار الفاظ میں کرتے ہیں۔ اس تحریک کا آغاز فرغانہ سے ہوا۔ اور جلد ہی سارے وسط ایشیا میں پھیل گئی۔ [illegible] کی تحریک میں جاں بحق ہونے والے تمام قبائل نے حصہ لیا۔

(روس میں اسلام، لوئیس ۱۹۱۹ء)

toobaa-elibrary.blogspot.com

پیدا کی۔ جمہوریہ تاتاریہ میں تاتاری مسلمانوں کے دو قبیلوں مشار اور تفتیار کو باقاعدہ نسلی گروہ تسلیم کر کے جداگانہ قومیت کا درجہ دے دیا۔ ان کے علاوہ کریشان اور نجیک قبائل کو بھی آئندہ حیثیت بخش دی۔ یہ دونوں گروہ نسلاً تاتاری تھے اور ان کے اجداد کو روسی زاروں نے عیسائی بنا لیا تھا۔ اس طرح مذہب دشمن نظام میں نسل کی بنیاد پر تاتاریوں میں اس لئے تفریق پیدا کی گئی کہ وہ نسلی بنیادوں پر مجتمع ہو کر جمہوریہ تاتاریہ کی تقویت کا سبب نہ بنیں۔

تاتاریوں کو پھاڑنے کا مقصد جب پورا ہو گیا، ہر گروہ اپنی اپنی جگہ ایک مکمل یونٹ بن گیا سیاسی، نظام اور معاشی زندگی پر روسیوں کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ اور وہ غالب ترین عنصر کی حیثیت سے ہر وحدت میں پاور ی اجتماعی زندگی پر چھا گئے۔ تو روس میں ۱۹۳۰ء میں ان گروہوں کا جداگانہ وجود مٹا ڈالا سرکاری کاغذات میں انہیں پھر سے تاتاری شمار کیا جانے لگا۔ اس طرح جداگانہ تشخص کا احساس و عصبیت مستقلاً پیدا کر کے اپنے خلاف متحدہ قومی موقف اختیار کرنے کے امکانات ختم کر دیئے گئے۔[1]

ان دونوں جمہوریتوں (تاتاریہ و باشکیریا) کی حدود سے باہر بھی کوئی دس لاکھ تاتاری و باشکیری مسلمان رہتے تھے اور ان کی آبادیوں میں ہزاروں مسجدیں موجود تھیں۔ مگر اب نہ وہ مسجدیں باقی ہیں اور نہ نمازی۔ رسالہ "بیراق شوق" نے ان مسلم آبادیوں کے اعداد و شمار یوں پیش کئے ہیں:[2]

نام علاقہ	مسلمانوں کی تعداد
اوفا	۱۷۴۵۸۱۳
قازان	۹۹۹۷۷۵
سمرسک	۱۱۶۳۴۳
ویٹکا	۱۳۶۶۴۵
سیارا	۲۴۴۲۴۱
اورنبرگ	۴۴۹۹۲۵

[1] روس میں مسلمانوں کی تعداد ۱۹۱۷ء میں ۱۷۴۱۰۰۰۰ تھی۔ رسالہ بیراق شوق اشاعت شمارہ ۳-۱۰ بابت ۱۹۲۱ء

[2] مضمون نگار قاری نیاز "رسالہ" قزل تاتارستان "قازان، شمارہ بابت فروری ۱۹۲۱ء بحوالہ سرخ انقلاب میں ص ۱۵۲

بیرم ۷۶۸۵۴

سیرنی گورگورود ۱۶۰۰۰۰

ان کے علاوہ متعدد ایسے علاقے ہیں مثلاً استراخان اور ماسکو وغیرہ جن کے باشندوں کے اعداد و شمار نہیں ملتے [illegible] علاقوں میں تاتاری اور باشکیری مسلمانوں کی مجموعی تعداد جو سرکاری رجسٹروں میں درج ہے ۲۹ لاکھ ۳۹ ہزار [illegible] تھی۔[1] مگر اب ان میں کہیں اذان کی آواز سنائی نہیں دیتی۔

شمالی قفقاز

قفقاز سے مراد وہ علاقہ ہے جسے قدیم مؤرخین نے ماورائے قفقاز لکھا ہے اور مروجہ تاریخوں میں اسے [illegible] یا اور کوہ قاف کہا جاتا ہے۔ یہ بہت بڑا علاقہ ہے۔ اس کا جنوبی حصہ جمہوریہ آذربائیجان پر مشتمل [illegible] ہے۔ اس کا شمالی علاقہ مسلمانوں کا اکثریتی علاقہ ہے۔ جو موجودہ جمہوریہ داغستان (جو جمہوریہ روسیا کا ایک [illegible] ہے) اور بلاد چرکس (جو براہ راست ماسکو کے تحت ہے) پر مشتمل ہے۔ اس میں چرکس، گگن، انگوش، [illegible] داغستانی۔ نوگر۔ قوچہ اور بالقر قبائل بستے ہیں۔ شمالی قفقاز کا رقبہ ایک لاکھ ۶۲ ہزار ایک سو ۷ مربع میل ہے۔ اور آبادی ۱۹۵۹ء کی رپورٹ کے مطابق ایک کروڑ ۱۰ لاکھ ۲۰ ہزار ہے۔[2]

شمالی قفقاز نے زار شاہی روس کے سامراجی عزائم کی سب سے زیادہ مزاحمت کی تھی۔ امام شامل کی ناکامی کے بعد یہ علاقہ انقلابات اور جنگوں کی آماجگاہ بنا رہا۔ ۱۸۶۰ء، ۱۸۷۷ء اور ۱۹۰۸ء میں تو بڑے پیمانے پر نام [illegible] بغاوتیں بھی ہوئیں۔ ۱۹۱۷ء میں روس میں انقلاب آیا تو یہاں کے حریت پسندوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اگرچہ [illegible] مقتدر مساجد تعلیم یافتہ طبقہ روسی سلطنت کے اندر رہتے ہوئے خود مختاری کا قائل تھا۔ تاہم اس کے اثرات [illegible] نہایت محدود تھے۔ اصل قوت نقشبندی اسلامی تحریک کے ہاتھ میں تھی اور وہ روسی تسلط سے مطلقاً [illegible] کر اسلامی حکومت قائم کرنے کی علمبردار تھی۔ شیخ منصور سے امام شامل کی عظیم جدوجہد تک اس تحریک نے اسی مقصد کے لئے عظیم قربانیاں دی تھیں۔ ۱۹۱۷ء میں قفقاز کے قوم پرست رہنماؤں نے وفاقی کانگریس کے انعقاد پر بھی کانگریس منعقد کی جس میں روس کی عبوری حکومت کی حمایت میں قرارداد میں منظور کی گئیں۔ طے پایا

[1] مضمون نگار قاری نیاز بحوالہ سرخ انقلاب میں ص ۱۵۳ [2] سرخ انقلاب میں ص ۳۴

toobaa-elibrary.blogspot.com

کو دوسری کانگریس داغستان میں منعقد ہوئی۔ لیکن علما کے مخالفین نے اس سے اختلاف کیا چنانچہ اس
کانگریس بھی وادی کذکاز ہی میں ہوئی۔ کوہستانی عوام کی یونین قائم کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ اعلان میں
کی گئی تھی کہ کوہستانی یونین روس ہی کا حصہ رہے گی۔ داغستان اور شیشان کے مسلم عوام نے اس جو
کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے شیخ نجم الدین گورنسکی کو اپنا امام منتخب کیا اور اسلامی ریاست
قیام کا اعلان کر دیا۔ شیخ اوزدن حاجی اس ریاست کے نائب امام منتخب کئے گئے۔ داغستان کی حکومت
ترکی اور جرمنی سے تعلقات استوار کرنے کے لیے اپنے وفود استنبول اور جرمنی بھیجے۔ لیکن حکومتیں جنگ
میں شکست کھانے کے بعد خود افراتفری کا شکار ہو رہی تھیں اس لئے کوئی فیصلہ نہ کر سکیں۔[1]

ادھر کمیونسٹ حکومت نے جو عبوری حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد خانہ جنگی سے دوچار ہو چکی تھیں سنبھالا لیا اور داغستانی مسلمانوں کی مدد کی جیتنے کے لئے اس آئی داسلامی مملکت کو تسلیم کر لیا۔ مئی ۱۹۱۹ء میں
دینکن کی کمان میں سفید فوجوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ اہل داغستان غلبا اپنے زعماء کی قیادت میں حملہ آوروں کا سخت
مقابلہ کیا۔ اسی اثنا میں سرخ افواج بھی بن بلائے مدد کو آ پہنچیں۔ سفید فوجیں تو شکست کھا گئیں مگر داغستان
اب سوشلسٹوں کے چنگل میں گرفتار ہو چکا تھا۔ سوویٹ فوج نے کچھ عرصے تک وادی کذکاز کی قوم پرست
حکومت اور داغستان کی اسلامی حکومت کا وجود گوارا کیا۔ جونہی خانہ جنگی کا زور ٹوٹا اور کمیونسٹ قابض ہو
ابھرے ان دونوں حکومتوں کی بساط لپیٹ کر رکھ دی۔ وادی کذکاز کی حکومت نے تو ہتھیار ڈال دیے
داغستان نے شدید مقاومت کی۔ لیکن آخر کار شکست کھائی۔ بے شمار داغستانی کمیونسٹوں کے ساتھ لڑتے
ہوئے شہید ہو گئے۔ بقیہ السیف گرفتار کر لئے گئے۔ آزاد حکومت کے بعض ارکان جان بچا کر بھاگ نکلنے میں
اور ترکی پہنچ گئے۔[2]

داغستان اور شیشان کے مسلمان عوام کو ملا کی قیادت سے بدظن کرنے اور ان کے اندر افتراق پیدا کرنے
میں شیشانی ملا سلطان کمیونسٹوں کا آلہ کار رہا۔ اس نے دشمن کے خلاف قائم کردہ محاذ میں شگاف ڈالنے
اور مسلمانوں کو سوشلسٹ حکومت کے متعلق انتہائی خطرناک خوش فہمیوں میں مبتلا کیا۔

شمالی قفقاز کی آبادی بیس لاکھ تھی اور مختلف قبائل پر مشتمل تھی۔ شیشان۔ انگوش۔ کراشائی اور

---

[1] Islam in the Soviet Union P 73, 74, 97,

[2] ... 97 -

کاربردیا کے رہنے والے تھے اور خانہ بدوشوں کی طرح گھومتے پھرتے یہاں آباد ہو گئے تھے۔ ان سب کا تاریخی پس
منظر یکساں تھا۔ داغستان کے آوار زبان نسلاً الگ تھے۔ تاہم ان سب کو اسلام نے ملکی وحدت میں منسلک
کر دیا تھا۔ بعض قبائل کی مقامی بولیاں بھی تھیں مگر بھاری اکثریت کی زبان عربی تھی جس نے ان سب کو لسانی
وحدت میں پرو رکھا تھا۔ یہ قبائل آپس میں لڑتے جھگڑتے بھی تھے مگر جب بھی دینی سطح پر کوئی قائد ابھرا
اس کے پرچم تلے ایک دینی و تہذیبی وحدت بن گئے۔ مرید یہ تحریک نے ان قبائل کو عصبیتوں سے پاک کیا اور
سب مل کر عرصہ دراز تک دشمن کے مقابلے میں سینہ سپر رہے۔ امام شامل کے پرچم قیادت تلے تو سب لوگ
ایک زبردست سیاسی وحدت بن کر نمودار ہوئے اپنی اس دینی تہذیبی اور سیاسی وحدت کے بل بوتے انہوں نے روسی
شہنشاہ کے خلاف تاریخ کی طویل ترین جنگ لڑی۔ کمیونسٹوں نے ان کے اس وحدت کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔

ابتدا میں قفقاز کو دو گورنریوں میں تقسیم کیا۔ ۲۰ جنوری ۱۹۱۹ء کو کوہستانی خود مختار جمہوریہ قائم کی گئی جس
میں سات قبائل شامل تھے۔ کبردا شیشان۔ انگوش۔ شرکاسی۔ آوچی۔ بلکار اور کراشائی[1]

اسی سال نومبر میں جمہوریہ داغستان وجود میں آئی۔ کوہستانی جمہوریہ ابتدا میں تجدد پسند دانشوروں کو مطمئن
اور ان کا تعاون حاصل کرنے کے لئے قائم کی گئی تھی جونہی اس علاقے پر کمیونسٹوں کی گرفت مضبوط ہوئی انہوں
نے جمہوریہ کا تیا پانچا کر دیا۔ اس کی جگہ زبانوں کی بنیاد پر سات چھوٹی چھوٹی انتظامی وحدتیں قائم کیں۔ یہ زبانیں
وہ تھیں جن کا حقیقت کی دنیا میں کوئی وجود نہ تھا اور جنہیں ۱۹۲۷ء اور ۱۹۳۸ء کے درمیان جنم دیا گیا[2]

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد شمالی قفقاز مندرجہ ذیل پانچ وحدتوں میں تقسیم کر دیا گیا

۱۔ داغستان

۲۔ شمالی اوسیتیا

۳۔ کبردین

۴۔ شرکس

۵۔ آوچی

اس طرح قفقاز کے باقی ماندہ علاقے کو پہلے تین مکڑوں آذربائیجان، آرمینیا اور جارجیہ میں تقسیم کیا، پھر آذربائیجان

---

[1] حوالہ سابق ص ۳۵۵

[2] ایضاً

toobaa-elibrary.blogspot.com

میں ایک نئی خود مختار ری پبلک تخیشوان اور ایک خود مختار صوبہ ٹنور نوکا رائج قائم کر دیا۔ شمالی قفقاز کے بعض علاقے بھاری جرمانے میں شامل کر دیے گئے۔[1]

۱۹۲۵ء میں کمیونسٹ لیڈروں کی طرف سے مذہب پر حملوں کا آغاز ہوا۔ اسی دوران ملحدین کی یونین کی تنظیم عمل میں لائی گئی جس نے مذہبی گروہ بندی کے خلاف موثر پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ اہل دین کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا اور کئی بزرگوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا گیا جن میں سے حاجی محمد، حاجی علی بشمات جیری، شیخ محمد امین، شیخ شیخ اور حاجی بلیال خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

شمالی قفقاز میں اسلام کی راہ کئی کی ہم کئی تدریسی مراحل پر مشتمل تھی یہ تدریسی مراحل اختیار کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ہم کے دوران عام باشندوں کے ساتھ تصادم کی صورت پیدا نہ ہونے پائے۔

خلیل احمد حامدی نامور قفقازی مصنف کے اسلامیت کے مقالے "اسلام اور مسلمان" سے ان مراحل کا خلاصہ یوں پیش کرتے ہیں:

پہلا مرحلہ۔ دینی کتابیں چھاپنے والے تمام مطابع ضبط کر لئے گئے اور دینی لٹریچر کی تقسیم ممنوع قرار دے دی گئی۔ عربی رسم الخط کو لاطینی رسم الخط میں تبدیل کر دیا گیا۔ وہ تمام لوگ جو دینی امور سرانجام دیتے تھے انہیں نا قابل اعتماد قرار دے کر ان سے شہری حقوق چھین لئے مزید برآں ان کو اقتصادی سزائیں دی گئیں۔

دوسرا مرحلہ۔ روس کی خفیہ پولیس نے ملا کر یہ بیانات دینے پر مجبور کیا۔ کہ مذہب ایک افیون ہے جس سے عوام کو بیوقوف بنانا مقصود ہے اور ہم اعلان کرتے ہیں کہ آج کے بعد ہم مذہب کی خدمت نہیں کریں گے اور ہم خدا کے قائل نہیں رہیں گے۔ ان بیانات پر چند علماء کے سوا جنہیں غیر معمولی تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا کسی عالم نے دستخط نہیں کئے۔ چنانچہ خفیہ پولیس نے جس کے پاس غیر معمولی اختیارات تھے ان تمام اور علماء و مشائخ کو دور دراز مقامات میں جلاوطن کر دیا۔ جنہوں نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسجدیں علماء سے

---

[1] سوویت انسائیکلوپیڈیا کلاں ۱۹۴۰ء ماسکو سوویت روس کی پریس ایجنسیں۔

خالی ہو گئیں اور دینی مدرسے معلمین اور اساتذہ سے یکسر محروم ہو گئے اور ان کی بجائے ایسے لوگ یہ کام سونپے گئے جو ان سے نابلد تھے اور آخر کار خود انہیں بھی اسی انجام سے دوچار ہونا پڑا۔

تیسرا مرحلہ سوویٹ گورنمنٹ نے تمام مساجد اور مذہبی مدرسوں کو ضبط کر لیا۔ اور انہیں دوسرے کاموں کے سپرد کر دیا۔[1]

۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء کے دو سال اشتراکی جبر و ستم کے مشہور سال ہیں اشتراکی لیڈر نیزوف نے ان دو سالوں کے اندر بے پناہ خون ریزی کی اور عوامی کارروائیوں کے نام سے عوام کے دشمنوں کا خاتمہ کیا۔ ان کارروائیوں کے نتیجے میں شمالی قفقاز ایک لاکھ ۲۰ ہزار مردوں اور عورتوں سے محروم ہو گیا۔[2] ایک قفقازی مصنف کا بیان ہے کہ روسی حکومت نے کارا شی، شاشانی اور انگوشی اقوام کو فنا کرنے کے لئے ہر وہ ہتھیار استعمال کیا۔ تقریباً دس لاکھ مسلمان فنا کے گھاٹ اتر گئے۔

جزیرہ نمائے قرم (کریمیا)

یہ سرسبز و شاداب علاقہ جزیرہ نما ترکی کے شمال میں بحر اسود میں واقع ہے مغرب اور جنوب میں اسے بحر اسود گھیرے ہوئے ہے۔ اس کے مشرق میں کیرچ اور بحر زوف ہے۔ جس سے نوقاز سے جدا کرتا ہے اور شمال میں اس کی سرحدیں پرکوپ سے ملتی ہیں۔ جزیرہ نمائے قرم کا رقبہ ۲۴ ہزار کیلومیٹر ہے۔ قرم کو انگریزی زبان میں کریمیا کہتے ہیں۔[3]

روس میں بلشویک حکومت قائم ہوتے ہی کریمیا کے تاتاریوں نے ۲۵ مارچ ۱۹۱۷ء کو سمفروپول کے مقام پر قومی کانگریس منعقد کی جس میں مسلم مجلس عامہ منتخب کی گئی۔ اسی روز مختلف مسلم سپاہی گروہوں نے مل کر ایک قومی حکومت "ملی فرقہ" تشکیل دی۔ اس میں دائیں اور بائیں دونوں بازوؤں کے لوگ شریک تھے۔ دائیں بازو میں خالص مسلم پرست بھی تھے اور کمرہ دین پسند بھی۔ بائیں بازو میں قوم پرست، سوشلسٹ اور بالشویک (کمیونسٹ) بھی تھے۔ اکتوبر میں بالشویکوں نے عبوری حکومت کا تختہ الٹ کر اپنی حکومت قائم کی تو کریمیا کے بالشویکوں نے

---

[1] سلسلہ مذہب اسلام شائع شدہ بلغاریہ میونخ شمارہ ۱۰ بابت اکتوبر ۱۹۵۱ء [2] اخبار روس شمارہ ۴۱ بابت ۱۹۶۱ء

[3] سرخ جزیروں میں ص ۳۸

toobaa-elibrary.blogspot.com

ے ملی فرقہ سے علیحدگی اختیار کرلی۔ اسی مہینے، یعنی ساری میں تاتاری قوم پرستوں نے کورلتائی طلب کی
نومبر، ۱۹ میں جمہوریہ کریمیا وجود میں آگئی جس کے صدر کریمیا کے مفتی اعظم چلپی مقرر ہوئے۔ اور
پریسیڈنٹ اور کریمیا کے درمیان سفارتی سطح پر رابطہ قائم ہو گئے لیکن دوسری حکومتوں نے بھی اسے تسلیم
لیکن آزاد کریمیا کی زندگی نہایت مختصر تھی۔ ۱۳۰ر جنوری ۱۹۱۸ء کو بحر اسود میں متعین بحری بیڑے کے تیس
سپاہی آزاد حکومت کے دارالحکومت سمفروپول کی طرف بڑھے۔ سیواستوپول کے روسی مزدوروں نے
ساتھ دیا۔ سودان نامی ایک گاؤں کے قریب مختصر سی تاتاری فوج نے مردانہ وار مقابلہ کیا۔ زبردست جنگ
بعد تاتاروں کو شکست ہوئی۔ ۱۴ر جنوری کو سرخ فوجوں نے سمفروپول فتح کر لیا۔ آزاد کریمیا کی اسمبلی کو
توڑ دی گئی اکثر قوم پرست بندرگاہ بھاگ کر پہاڑوں میں پہنچ گئے جہاں انہوں نے کش مکش جاری رکھی۔ آزاد
کے سربراہ گرفتار کر لئے گئے۔ اور روسی کمیونسٹوں نے انہیں قتل کر دیا۔[1]

بالشویکوں نے قرم کے ایک اشتراکیت نواز لیڈر ولی ابراہیم کو قرم کا گورنر مقرر کیا۔ مسلمان نے قرم
مسلمانوں کو کمزور کرنے کے لئے یہ تجویز کی کہ جزیرہ سے مسلمانوں کو نکال کر دوسرے علاقوں میں آباد کر دیا جائے
ولی ابراہیم نے اس تجویز کی بڑی مخالفت کی چنانچہ ۱۹۲۱ء میں عملاً قرض الزمات لگا کر تختہ دار پر لٹکا دیا
ولی ابراہیم نے تختہ دار پر چڑھ کر جلادوں سے کہا:

"جب ریچھ اپنے بچے کو پھاڑ کر کھانا چاہتا ہے تو اسے خوف میں آلودہ کر دیتا ہے تاکہ وہ یہ سمجھے کہ یہ
بچہ نہیں ہے"[2]

ولی ابراہیم کے ساتھ کریمیا کی تین سرکردہ پانچ سو نمایاں ترکمانی شخصیتوں کو بھی موت، نظر بندی اور جلاوطنی
کی سزائیں دی گئیں۔ ان سب کے خلاف الزام یہ تھا کہ ان کے اندر وہ میلانِ طبع کے وطن پرستانہ رجحانات
جاتے ہیں[3]

مذہب کے بارے میں کمیونسٹوں نے یہاں جو رویہ اختیار کیا اسے ہم دو مرحلوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلے مرحلے
میں جو ۱۹۲۱ء کے موسم خزاں سے شروع ہوتا ہے۔ اور ۱۹۲۸ء کے موسم بہار پر ختم ہوتا ہے۔ کمیونسٹوں نے اسلام

---

[1] P 66, 67

[2] سرخ اندھیروں میں ص ۳۵، ۱۳۶

[3] بلشویک اور روس میگزین شمارہ ۲۔ ۱۹۶۶ء مصنف جیرارڈ ڈے قرم میں اسلام کی سرگزشت۔

قرم کو روسیوں کا علاقہ بنایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اصل آبادی کو اکھاڑنے اور روسی اقوام کو اس کی جگہ آباد
کی اسکیم نافذ کی۔ اس مرحلے میں کمیونسٹوں نے اپنے سیاسی مخالفین کی سرکوبی کی۔ مگر مذہب کے بارے میں سخت
پالیسی اختیار نہیں کی مسلمان اپنے مذہبی فرائض کو حسب منشا انجام دیتے تھے۔ مسجدیں اور عبادت گاہیں
تھیں شہروں اور بستیوں میں مذہبی جماعتیں موجود تھیں۔ کریمیا کے مرکزی شہر سمفروپول میں ادارہ اسلامی
علماء کی تنخواہیں اور دوسرے مصارف عوام الناس خود برداشت کرتے تھے۔ ترکی اور تاتاری آبادیوں
جلد مسجدیں اور دینی مدے موجود تھے۔ نکاح و طلاق اور شخصی قوانین کے دوسرے تمام شعبے مسلمان
شریعت کے مطابق سرانجام دیتے تھے۔ بچوں کو ایمان اور اخلاق اور معاشرتی زندگی سے متعلق اسلامی احکام و
کی تعلیم دی جاتی تھی۔ جمعہ کے دن عام تعطیل کا دن تھا۔ مسلمانوں کو یہ خصوصی رعایت حاصل تھی کہ وہ روسی
کے دوران سر سے قلباق (کھال کی ٹوپی جسے ترکمانی مسلمان اوڑھا کرتے تھے) اتارنے کے پابند نہیں حالاں کہ
ترکی اقوام پر لازم تھا وہ جب روسی تراز گایا جاتا ہو تو وہ سر پوش اتار دیں۔ اور ننگے سر کھڑے ہوں مسلمانوں
خصوصی رعایت دینے کی وجہ یہ بتائی گئی کہ مسلمان نماز کے دوران بھی سر سے ٹوپی نہیں اتارتے۔ حالاں کہ نماز
مسلمانوں کا سب سے اہم مقدس اور قابلِ احترام فعل ہے[1]

دوسرا مرحلہ اس وقت شروع ہوا جب ۱۹۲۹ء میں بالشویکوں نے قرمی آبادی کے انخلاء کا فیصلہ کیا۔ اور قرم
مقامی کمیونسٹوں نے اس کی مخالفت کی۔ بالشویکوں نے پہلے مقامی کمیونسٹوں کو ختم کیا۔ اور پھر خود ہی اسلام کے
ہی طور پر سیام کر دیا۔ کمیونسٹوں نے ترکمانی قوم کے ملی اور قومی حقوق منسوخ کر دئے مذہبی مراسم کے بارے
عدم روا دیا گیا کہ یہ کام دراصل طبقہ کی قوت کا بہت اور سرخ انقلاب کے منافی ہے۔ اور نہ صرف پروپیگنڈے
ذریعے سے مذہب کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی گئی بلکہ حکومت کے تمام وسائل، کمیونسٹ پارٹی کی پوری
قوت حتیہ پولیس کو مذہب کے خاتمے کے لئے وقف کر دیا گیا۔ لوگوں کو کھلم کھلا ترک مذہب پر مجبور کیا گیا۔ علماء اور
نظر بند کئے کے ساتھ تشدد اور سخت گیری کا برتاؤ کیا گیا[2]

مذہب پر حملہ شروع ہوا تو سب سے پہلے مسجدیں اس کا نشانہ بنیں چنانچہ سوچی کمیونسٹ اسکیم کے تحت علاقے کی

---

[1] سرخ اندھیروں میں ص ۱۳۰، ۱۳۸ [2] بلشویک کی یول شمارہ ۱۱ بابت ۱۹۳۰ء مضمون "روس میں مذہبی استحصال کے خلاف
جدوجہد"۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

مسجدوں کو منہدم کر دیا گیا۔ اور کلیسوں یا گوداموں کے مصرف میں لایا گیا۔ حتیٰ کہ بعض مساجد سے سینما گھروں کا کام لیا گیا۔ ۱۹۳۲ء میں شکست و ریخت کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ شہروں اور قصبوں کے اندر چند ایک عبادت گاہوں کو چھوڑ کر کوئی مسجد باقی نہ رہی سوائے ۱۴ کلیسا نما عمارتوں کے۔

ایک روسی مصنف بروف لکھتا ہے :-

"پاکیشاری مسلمانوں کا مذہبی گڑھ تھا ۱۹۳۵ء میں اس شہر کی ۳۲ مسجدوں میں سے صرف تین مسجدیں باقی رہ گئیں"

آذربائیجان

آذربائیجان کے مشرق میں بحر خزر (بحر قزوین) ہے۔ شمال میں قوقاز کا پہاڑی سلسلہ اور جارجیا ہے۔ مغرب میں آرمینیا، ترکی اور عراق ہیں۔ جنوب میں ایران سے سرحدیں ملتی ہیں۔ آذربائیجان کا مجموعی رقبہ ۸۶ ہزار مربع کلومیٹر ہے۔ اس کا شمالی حصہ سوویٹ وفاق میں شامل ہے اور جنوبی حصہ ایران کے اندر واقع ہے۔ شمالی آذربائیجان جو روسی حصہ کہلاتا ہے کا رقبہ ۸۶ ہزار مربع کلومیٹر ہے۔ اور اس کی آبادی ۴۰ لاکھ ہے جس میں مسلمانوں کی تعداد ۸۰ فیصد ہے اور بقیہ ۲۰ فیصد روسی اقوام ہیں۔ ایرانی ترکی اور آذربائیجان کے درمیان نسل، تاریخ، زبان اور تہذیب و ثقافت کے گہرے رشتے پائے جاتے ہیں۔[1]

۱۹۰۵ء تک روس اور روس کے مقبوضہ ممالک میں سیاسی جماعتیں قائم کرنے کی اجازت نہ تھی۔ ۱۹۰۵ء کے ناکام انقلاب کا ایک ثمرہ یہ تھا کہ زار نے سیاسی جماعتیں قائم کرنے اور سیاسی کام کھلے عام کرنے کی اجازت دے دی۔ ۱۹۱۱ء میں مجلس شوریٰ نے مغرب مسلمانوں کی تشکیل کی۔ مارچ ۱۹۱۷ء کی عبوری حکومت کے بعد حریت مساوات نے تحریک آزادی شروع کر دی۔ باکو (آذربائیجان کا دارالحکومت) کی آبادی روسیوں پر مشتمل تھی انہوں نے ایک کمیونسٹ انقلابی کونسل قائم کی جس کا سربراہ ایک آرمینی سیپشین شاہان تھا۔

حریت پسندوں کا نعرہ کو اپنا دارالحکومت بنایا ۲۷ ستمبر ۱۹۱۷ء کو جمہوریہ آذربائیجان نے اور اسے وفاقی جمہوریہ میں شمولیت اختیار کر لی۔ مگر نو مہینے بعد اختلافات کی بنا پر الگ ہو گئی۔ اور آزادی کا اعلان کر دیا۔ ۲۰ جون ۱۹۱۸ء کو ترکی کے ساتھ معاہدہ امن طے ہوا پھر ترکی اور آذربائیجان کی مشترکہ فوجوں نے نوری پاشا

---

[1] مجلہ اسلام روس سنہ جزیرہ نمائے قرم کی گوئیڈ بک صفحہ ۱۳۵ / ۱۳۶ سنہ مسروف اندھیروں میں ص ۳۰، ۳۱

[illegible] میں باکو پر یلغار کی۔ ادھر برطانوی فوج جنرل ڈنسٹرویل کی کمان میں عشق آباد کی طرف سے بڑھیں۔ [illegible] اگست ۱۹۱۸ء کو باکو روسی فوجوں سے چھین لیا۔ تین دن بعد فتح علی خان خوئی کی سربراہی میں آذربائیجانی [illegible] حکومت قائم ہو گئی۔ ۷ دسمبر ۱۹۱۸ء کو بالغ رائے دہی کی بنیاد پر دستور ساز اسمبلی کے لئے عام انتخابات ہوئے [illegible] میں سے ۸۴ نشستوں پر حزب مساوات کامیاب ہوئی۔ علی مردان توپچی باشی اسمبلی کا سپیکر منتخب ہوا۔ [illegible] رفیب از بک نے نئی حکومت بنائی۔ جسے اتحادی طاقتوں نے تسلیم کر لیا۔ ۲۷ اپریل ۱۹۲۰ء کو آذربائیجان [illegible] سرخ افواج نے حملہ بول دیا۔ کہا گیا کہ یہ اقدام آذربائیجان کی مجلس انقلاب کی استدعا پر کیا گیا۔ لیکن در [illegible] حقیقت یہ کھلی سامراجی جارحیت تھی جس کا ارتکاب کمیونسٹوں نے تیل کے چشموں پر قبضہ کرنے کے لئے کیا۔

باکو میں مارچ ہی سے مسلمانوں اور کمیونسٹوں کے درمیان تصادم شروع ہو گئے تھے۔ کمیونسٹوں کے ساتھ سوشلسٹ انقلابی، آرمینی طیشیا اور چند مسلمان جو کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ سرخ افواج انہی کی سازش سے حملہ آور ہوئی تھیں۔ ہولناک جنگ کے بعد مسلمانوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ باکو میں تین دن تک مسلمانوں کا قتل عام ہوتا رہا جس میں تیس ہزار سے زائد مسلمان مارے گئے۔ اور آذربائیجان کی آزاد زندگی کا چراغ گل ہو گیا۔ اور سوویٹ جمہوریہ وجود میں آ گئی۔[1]

آذربائیجان پر قبضہ کرنے کے بعد کمیونسٹوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اوقاف کو ضبط کر لیا۔ اس طرح [illegible] اسلامی مالی محاذ سے بند بس ہو کر رہ گیا۔ اور سے وہ تاریخی روایتی مدرسے بند کرنے پڑے جو صدیوں سے اس علاقہ میں دینی تعلیم کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ شرعی قانون کو یک قلم منسوخ کر دیا گیا۔ محلقین پر یہاں تک پابندی لگا دی گئی کہ وہ بچوں کو اسلام کی مبادیات کی تعلیم بھی نہیں دے سکتے تھے۔ علماء و نمایاں مذہبی شخصیتوں۔ مفتوں، خطیبوں اور مبلغین کو شہری حقوق سے محروم کر دیا گیا۔ مساجد کو بلدیاتی محکموں کے تابع کر دیا گیا۔ اور بلدیاتی محکموں پر یہ قانون نافذ کیا گیا کہ وہ منظم مذہبی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لے سکتے۔ امامت اور خطابت کو غیر محنت کش طبقہ قرار دے کر ان پر بھاری ٹیکس عائد کر دیے جن کی ادائیگی ان کی ہمت سے باہر تھی۔[2]

---

[1] P. 81, 86, 93, 97

[2] مجلہ اسلام روس سنہ شمارہ ۴ ۱۹۹۰ء

toobaa-elibrary.blogspot.com

اسلام پر حملے کا آغاز اس اقدام سے کیا گیا کہ آذربائیجان میں عربی رسم الخط کا استعمال ممنوع قرار دے دیا گیا حالاں کہ یہ رسم الخط قدیم زمانے سے آذربائیجان میں رائج چلا آرہا تھا۔ عربی رسم الخط پر پابندی لگا دینے کا نتیجہ یہ ہوا، کہ موجودہ نسل کا تعلق اپنے ماضی سے منقطع ہو گیا۔ اور وہ اپنے قدیم مذہبی اور ملی سرمائے سے نا آشنا ہو گئی چنانچہ خلاف اسلام نظریات اور غیر دینی سرگرمیوں کو پھیلنے کا موقعہ فراہم ہو گیا تعلیمی میدان میں تطہیر کی مہم چلائی گئی۔ علماء اور دینیات کے اساتذہ کو چن چن کر نکالا گیا۔[1]

جدید اقتصادی پالیسی کے نفاذ پر آذربائیجان کے پریس نے علماء کے خلاف پروپیگنڈہ کا طوفان برپا کر دیا اس کے خلاف نہایت بھدے مضامین لکھے گئے۔ اسٹیجوں پر ان کی تضحیک کی گئی۔ تصویروں اور کارٹونوں میں ان کی پگڑی اچھالی گئی۔ انہیں فیضلی، مفت خورے اور انقلاب دشمن کہا گیا۔ تقریروں میں ان کے خلاف ڈرامے سٹیج کئے گئے۔ مزدور یونینوں کی طرف سے یہ قراردادیں پاس کرائی گئیں کہ مسجدیں بند کر دی جائیں اور انقلاب دشمن سرگرمیوں کو بے نقاب کیا جائے۔ ۱۹۲۴ء سے پہلے دین کے خلاف پروپیگنڈہ اہم غیر مستقل تھی ۱۹۲۴ء کے بعد اسے منظم کیا گیا۔ اسی عرصے میں الحادی انجمن بھی ظہور پذیر ہو گئی۔ اخبار باکسکی رابوچی کے بیان کے مطابق اس انجمن کے مقاصد یہ تھے۔ مزدوروں اور کسانوں کو الحادی پرچم کے نیچے جمع کرنا۔ محنت کش طبقے کو مذہب کی افیون سے نجات دلانا۔ طبیعات کی بنیادوں پر مادی عقائد کی تعمیر کرنا۔[2]

آذربائیجان کی تاریخ میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ روسی لیڈ میروف کے عہد استبداد (۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۰ء) کے دوران صرف آذربائیجان میں ایک لاکھ میں ہزار صرف تعلیم یافتہ اشخاص قتل کئے گئے۔[3]

قازاقستان

قازاقستان ترکستان ہی کا ایک حصہ تھا۔ لیکن زار شاہی روس نے اسے ترکستان سے فکری و تہذیبی طور پر کاٹ دینے کی سر توڑ تدبیر کی۔ جتنی کہ خود روس کے دوسرے مقبوضہ مسلمان علاقوں میں ممنوع اور بغاوت کے مترادف تھے یہاں ان کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ تاہم روس کی یہ پالیسی بڑی حد تک کامیاب رہی۔

---

[1] روزنامہ باکسکی رابوچی ۱۰ ستمبر ۱۹۲۶ء [2] ایضاً ۱۲ اپریل ۱۹۲۵ء

[3] دیکھئے کتاب "سٹالن کے جیل خانوں سے" تالیف ابراہیم ادیب حیدر، ص ۱۱۷ تا ۱۲۱، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰ مطبوعہ کراچی

ترکستان کے دانشور ابتدا ہی سے فکری، سیاسی تحریکوں سے منسلک رہے جو روس سے مقبوضہ علاقوں میں چل رہی تھیں۔ تاہم ۱۹۱۶ء میں قازاقوں کی بغاوت نے جو جبری فوجی بھرتی کی وجہ سے شروع ہوئی تھی صورت حال بدل دی۔ قومی احساسات نے ایک نیا اور شدید رنگ اختیار کر لیا۔

مارچ ۱۹۱۷ء میں الش اوردہ (Horde of Alash) نامی ایک سیاسی جماعت وجود میں آگئی۔ یہ لوگ روس کی سیاسی جماعت علی الترتیب کے برعکس تمام بلاوں سے تعلق رکھتے تھے تاہم دین و سیاست کی تفریق کے قائل تھے۔ انہوں نے اپنا زمینی اور اقتصادی پروگرام پانچ زمینی جماعتوں سے اخذ کیا تھا۔ جولائی ۱۹۱۷ء میں الش اوردہ نے خود مختار وفاقی ریاست قائم کرنے کا اعلان کر دیا۔ جلد ہی ایک اور سیاسی جماعت پرلک ہوئی (Flag of Union) میدان میں آگئی یہ جماعت دین پسند اور پین الاسلامی تحریک اتحاد (Pan Islamism) کی علمبردار تھی۔ اس کا زور ترکستان سے متصل صوبہ سیمیرچیا میں تھا۔ جو دین پسند ترکی قبائل کا مسکن تھا۔ دوسری جماعت الش ڈوز (The thre Hordes) تھی یہ بھی مذہبی ذہن رکھنے والوں پر مشتمل تھی اور پان اسلامزم کی حامی تھی۔ آگے چل کر اس جماعت کے رہنما کیمونسٹوں کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہو کر ان کا آلہ کار بن گئے۔ روسی مسلمانوں کی سیاسی زندگی کا ایک افسوسناک پہلو ہے۔ کہ ان کی مختلف جماعتیں ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے لئے ہر وقت تیار رہتی تھیں اور اغیار پر اعتماد کرتی تھیں خصوصاً بعض ہم مذہب رہنماؤں سے غلیظ کردار ادا کیا جو ہمارے ان اسلام اور سوشلزم کی کھلی کشمکش میں بعض ہم مذہب علماء نے ان کی۔ الش ڈوز کے مذہب پسند رہنما الش اوردہ کے اس لئے مخالف تھے کہ وہ آزاد خیال تھے۔ لیکن کیمونسٹوں سے جو خدا اور رسول کے کھلے منکر اور نسلاً یہودی تھے۔ رشتہ اتحاد استوار کرنے میں ان کی ذہنی عبرت ذرا بھی آڑے نہ آئی جنوری ۱۹۱۸ء میں سرخ فوجوں نے ایدل اور سائبیریا کی طرف سے حملہ کر دیا۔ الش ڈوز کے علاؤں نے اندر سے نقب لگائی یکے بعد دیگرے تمام شہروں پر سرخ الواج قابض ہو گئیں ۱۹۲۰ء تک قازاقستان ان کے چنگل میں گرفتار ہو چکا تھا۔

ترکستان

ترکستان کا خطہ عظیم اس وقت روسوں میں بٹ چکا ہے مغربی حصہ جسے روسی ترکستان بھی کہا جاتا ہے اور مغربی ترکستان بھی، روس کے اندر شامل ہے اور مشرقی حصہ جسے چینی ترکستان کا نام بھی دیا جاتا ہے

toobaa-elibrary.blogspot.com

اور سنکیانگ بھی چین کے قبضے میں ہے۔ روسی ترکستان دراصل ثقافت، تاریخ، مذہب اور جغرافیائی حیثیت کے لحاظ سے ایک ہی خطہ تھا جس میں ترک قومیں آباد تھیں۔ مؤرخین اسلام نے اسے ترکستان بھی لکھا ہے اور ماوراء النہر بھی۔ آموداریا (دریائے جیحوں) کے اس پار کا علاقہ ماوراء النہر ہی کہلاتا ہے۔ مسلمانوں کے تاریخی مراکز بخارا، سمرقند، خیوا اور فرغانہ اسی دوآبے میں واقع ہیں۔ ائمہ اسلام بخاری، ترمذی، زمخشری، سرخسی اور علامہ فارابی وابن سینا وغیرہ اسی علاقے کے اندر محو خواب ہیں۔[1]

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں موجودہ ترکستان کا پورا علاقہ زار شاہی روس میں داخل ہو چکا ہے۔ زاروں نے انتظامی اور سیاسی اعتبار سے ترکستان کو دو حصوں میں تقسیم کیا ایک وہ جو براہ راست روس کے زیر انتظام تھا اور دیگر استعماری مقبوضات کی طرح روس کا ایک داخلی صوبہ سمجھا جاتا تھا۔ تاشقند اس صوبے کا دارالحکومت تھا۔ دوسرا وہ جو بخارا اور خیوا کی ریاستوں پر مشتمل تھا جہاں ہمیر حکمرانی کرتے تھے۔

مارچ ۱۹۱۷ء میں روس میں عبوری حکومت قائم ہوئی تو ترکستان میں فرقہ تفری کی کیفیت تھی۔ روسی حکمرانوں نے گزشتہ ستر برس سے ترکستان میں قحط بچا رکھی تھی اب ان قانونی بندشوں سے بھی آزاد ہو گئے جو روسی حکومت نے ان پر عائد کر رکھی تھیں۔ اب عوامی حکومت کا دور دورہ تھا۔ کسانوں، مزدوروں اور فوجی سپاہیوں نے ہر جگہ سوویٹ قائم کر لئے تھے اور روسیوں کو مختلف بہانوں سے لوٹ رہے تھے۔

مسلمانوں میں کئی جماعتیں سرگرم عمل تھیں۔ ایک تو ترکستان ملی کمیٹی تھی دوسری شوریٰ اسلامیہ اور تیسری نوجوان ترکستان یا جدید پارٹی تھی جو ترکستان کی سیاسی خود مختاری، بخارا اور خیوا کی ریاستوں کے خاتمے اور اسلام کو جدید رنگ میں رنگنے کی علمبردار تھی۔ یہ سب جماعتیں ایک دوسرے سے متصادم تھیں۔

مصطفےٰ چوکائی لکھتے ہیں:

"اس وقت ہم میں کئی پارٹیاں موجود تھیں۔ ہر پارٹی اپنے آپ کو مستقل حیثیت کا مالک اور ترکستان کی واحد نمائندہ اور ترجمان سمجھتی تھی۔ یہ پارٹیاں مختلف سیاسی رجحانات

---

[1] سرخ اندھیروں میں ص ۱۴۵

پروگرام اور نامزد عمل کی بنیاد پر نہیں بلکہ شخصیتوں کی بنیاد پر وجود میں آئی تھیں۔

یہ صورت حال سے لیکسی طرح بھی خوش آئند نتائج اپنے دامن میں نہ رکھتی تھی:

اس انتشار کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاشقند کا نمائندہ کانفرنس (منعقدہ ۱۰ اپریل ۱۹۱۷ء) میں مسلمان کوئی متفقہ موقف اختیار کرنے سے قاصر رہا۔ تاشقند سوویٹ جو سب کی سب روسیوں پر مشتمل تھی اور ان روسیوں کی اکثریت سوشل انقلابی پارٹی سے تعلق رکھتی تھی ترکستانی مسلمانوں کو کسی حکومت میں حصہ دار بنانے کے لئے بالکل آمادہ نہ تھی۔ اس کے ایک نمائندے نے تاشقند میں اعلان کیا۔

"انقلاب روسی مزدور اور فوج لائے ہیں۔ اس لئے انقلاب کی رہنمائی بھی وہی کریں گے۔ ترکستانیوں کو وہ جو کچھ دیں گے اس پر انہیں قناعت کرنا ہوگی۔"

یہ سوشلسٹ انقلابیوں ہی کا نقطہ نظر تھا۔ کسی بھی روسیوں کا انداز فکر یہی تھا۔ مصطفےٰ چوکائی کے الفاظ میں:

"کانفرنس میں آئے ہوئے روسی خواہ وہ کسی بھی فرقے سے تعلق رکھتے تھے سب کی باتوں سے اس اعلان کی تائید ہوتی تھی لیکن وہ انقلابی فتوحات کے پیش نظر اپنے مافی الضمیر کو بڑی احتیاط کے ساتھ ادا کرتے تھے۔"

روس کی اس روش کے نتیجے میں مسلمانوں میں اشتراکیت بیزاری کا احساس پیدا ہوا۔ تاشقند ہی میں کل ترکستان مسلم کانگریس منعقد ہوئی جس نے روس میں وفاقی نظام قائم کرنے اور روسی آبادکاروں کو ملک کے حقیقی باشندوں کی زمینوں سے بے دخل کرنے کی قراردادیں منظور کیں۔ اور مسلمانوں کے تمام گروہ ملی شوریٰ میں ضم ہو گئے۔ ہر صوبے میں اس کی شاخیں وجود میں آگئیں۔ مرکزی ملی شوریٰ کے لئے ہر صوبے سے ایک ایک نمائندہ لیا گیا صوبے چوکائی صدر منتخب ہوئے۔ اس طرح مسلمانوں کی متحدہ قوت ابھر کر سامنے آگئی۔

روس کی عبوری حکومت میں شامل یوں تو سبھی جماعتیں مسلمانوں کے مطالبات کی شدید مخالف تھیں مگر سوشل انقلابیوں کا رویہ سخت معاندانہ تھا۔ اس صورت حال سے کیوسٹوں نے فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے مسلمانوں کے مطالبات کے ساتھ ہمدردانہ رویہ اختیار کیا اور اس ہمدردی کے پردے میں اپنے افکار و تصورات کے بیج ان کے اندر پھیلائے۔ چنانچہ مختلف مقامات پر مزدوروں اور محنت کشوں میں اپنے چھوٹے چھوٹے گروپ وجود میں لانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان گروپوں سے آگے چل کر انہوں نے ترکستان کو اپنے عزائم کا شکار بنانے میں بڑا کام لیا۔[1]

[1] Islam in the Soviet Union OP Cit. P. 72

toobaa-elibrary.blogspot.com

خوقند کی آزاد ریاست کا خاتمہ

سوویٹ حکومت نے اعلان انقلاب جاری کیا تو دسمبر ۱۹۱۷ء میں مرکزی علی شوریٰ نے خوقند میں قومی کانفرنس منعقد کی جس میں دو سو سے زیادہ مندوبین شریک ہوئے۔ کانفرنس کا ایک چھوٹا گروپ مکمل آزادی کا اعلان کر دیا جائے۔ دوسرے گروپ کی رائے تھی کہ ہمیں روسیوں کے ساتھ معاملات میں تدبر اور احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ کانفرنس نے طے کیا کہ تاشقند سوویٹ سے ترکستان کی خود مختیاری منوانے کے لئے مذاکرات کئے جائیں۔ تاشقند سوویٹ کی اکثریت سوشل انقلابیوں پر مشتمل تھی۔ جو ترکستان کو خود مختاری دینے کے سخت مخالف تھے۔ بایں ہمہ ۱۱ دسمبر کو خوقند کانفرنس نے ترکستان کی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اور خوقند والا حکومت قرار پایا۔ پہلے دانش بے ولی سربراہ مملکت منتخب ہوئے۔ جنوری ۱۹۱۸ء میں اقتصادی بحران پیدا ہوا تو انہوں نے استعفیٰ دے دیا۔ اور مصطفےٰ چوقائی صدر بنے۔

۱۳ دسمبر ۱۹۱۷ء کو مسلمانان تاشقند نے آزادی کا اعلان کر دیا۔ تاشقند کی سوویٹ حکومت کے خلاف مظاہرہ کیا۔ مسلمانوں کے جذبات بہت شدید تھے اور توقع تھی کہ تاشقند حکومت کا تختہ الٹ جائے گا۔ مگر سلاہریں محض جوش و جذبہ کا اظہار کر کے منتشر ہو گئے۔

۳۰ جنوری کو خوقند نے ترکستان دستور ساز اسمبلی طلب کرنے کا فیصلہ کیا۔ جس میں ترکستان کے ہر صلع کو نمائندگی دینے کا اعلان کیا۔ تمام عوام کی مساوات کی بنیاد پر سوویٹ حکومت نے مسلمانوں کو نمائندگی اور مساوات دینے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن خوقند کی حکومت نے غیر مسلم آبادی کے لئے دستور ساز اسمبلی میں ایک تہائی نشستیں مختص کر دیں۔ اور وعدہ کیا کہ اسمبلی قوانین بناتے وقت اقلیتوں اور محنت کش عوام کے حقوق کا پوری طرح خیال رکھے گی۔[1]

اسی مہینے ترکستان کے مزدوروں اور کسانوں کی کانگریس خوقند میں منعقد ہوئی جس نے ترکستان کی خود مختاری کی تائید و حمایت کا اعلان کر دیا۔ اس موقع پر ایک بار پھر پیپلز گارڈز (جنہیں اب کمیونسٹ برسر اقتدار آ گئے تھے) سے درخواست کی گئی کہ وہ خود مختار ترکستان کی عبوری حکومت کو تسلیم کرے اور تاشقند سوویٹ کو ختم کر دیں۔ جو مقامی باشندوں کے ساتھ غیر ملکی باشندوں پر اعتماد کرتی ہے۔ اور انقلاب اکتوبر کے اعلان کی تصریح کر دہ اصول حق خود اختیاری کی خلاف ورزی پر قائم کی گئی ہے۔ پیپلز گارڈز کا رویہ نہ صرف عجیب و غریب تھا

---

[1] (Svobodry Turkestan January 24 (1918)

بلکہ ترکستان سوویٹ حکومت کی سامراجی روح کی غمازی بھی کرتا تھا۔ معاملہ ماننے کی بجائے اس نے خوقند کی آزاد حکومت کو تاشقند سوویٹ سے ٹکرانے اور اس طرح خوقند حکومت کے خلاف لشکر کشی کا جواز پیدا کرنے کی کوشش کی۔ سوویٹ حکومت کی طرف سے قومیتوں کے کمیسار سٹالن نے لکھا۔

"علاقائی سوویٹ حکومتیں، اپنے داخلی معاملات میں خود مختار ہیں، اور اپنی حقیقی طاقت پر انحصار کر کے اپنے فرائض سرانجام دیتی ہیں۔ اس لئے ترکستان کے ملکی پرولتاریوں کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ مرکزی حکومت کو درخواست بھیجیں، اور عوامی کمیساریٹ کی ترکستانی نوعیت کو توڑ دینے کی اپیل کریں۔ جو ان کی رائے میں غیر مسلم فوجی عناصر پر اعتماد کر رہی ہے۔ بلکہ اگر ملکی پرولتاریوں اور کسانوں کے پاس طاقت ہے تو انہیں چاہیے کہ وہ اس حکومت کو بزور تیغ ختم کر دیں۔"[1]

ماسکو کی کمیونسٹ حکومت نے خوقند کے حق خود اختیاری کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا۔ خوقند کو اپنی زندگی برقرار رکھنے کے لئے تاجروں اور فوج کی ضرورت تھی۔ فوج روپے سے قائم ہو سکتی تھی۔ جنوری ۱۹۱۸ء میں حکومت نے ٹیکس جاری کیا۔ قرضہ پانچ دن کے اندر اندر دیا لیکن ہتھیار دینے پر کوئی آمادہ نہ ہوا۔ تاشقند کی کمیونسٹ پارٹی نے خوقند کے خلاف ماسکو سے مدد طلب کی۔ تاشقند سے کوئی صوف فوج نے کر نکلا۔ ادھر اور ہر گ محاذ سے سرخ افواج شاہ پسند افواج کی قوت توڑ کر خوقند کی طرف بڑھیں۔ خوقند کے سفید گارڈ بھی ان کے ساتھ مل گئے۔ ۱۷ فروری ۱۹۱۸ء کو دارالحکومت کا محاصرہ کر لیا گیا۔

خوقند کی فوج اگرچہ تھوڑی اور بے سروسامان تھی تاہم اس نے جان توڑ مقابلہ کیا۔ آخر شدید جنگ کے بعد سرخ افواج نے خوقند پر قبضہ کر لیا۔ کمیونسٹوں نے تین دن تک شہر میں قتل و غارت، لوٹ مار کا بازار گرم رکھا۔ اس قتل عام میں کتنے لوگ مارے گئے آج تک صحیح جواب نہیں مل سکا۔ ایک اندازے کے مطابق چودہ ہزار آدمی مارے گئے۔[2]

---

[1] Vadim Chaikan. K Istorii Rossus Kot Revolvtsii, Vol I Kazn Bakinskikh Kommissarov Moscow (199) P 139

[2] Colonel P.T Elberton in the Heart of Asia London (1925) P 154

toobaa-elibrary.blogspot.com

کمیونسٹوں نے قتل و غارت ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ پورے علاقے میں غلے کی ضرورت کے نام پر خوراک کے ذخ
بھی ضبط کر لئے۔ اور غلے کی درآمد پر پابندی لگا دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارا علاقہ قحط کی لپیٹ میں آ گیا۔ اور پچیس
پچاس فیصد تک آبادی ہلاک ہو گئی۔ چینی ترکستان میں متعین برطانوی کونسل کرنل پی۔ ٹی۔ ایتھرٹن نے لکھا

"دو لاکھ کاشتکار اس قحط کا شکار ہو گئے اور ہزاروں نے بھاگ کر چینی ترکستان میں
پناہ لی ہوئی"

رچرڈ پائپس (Richard Pipes) اپنی کتاب میں لکھتا ہے۔

"انقلاب سے پہلے خوقند کی آبادی ایک لاکھ بیس ہزار تھی۔ جو ۱۹۲۶ء میں صرف ۹۱ ہزار
تین سو رہ گئی تھی"[1]

خیوا خوارزم کی سرنگونی

خونریز جنگ کے بعد آزاد خوقند کے صدر مصطفےٰ چوقائی بچے کھچے ساتھی سمیت بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے
علماء اور حریت پسند ترکستانی مسلمان اندرون کے پہاڑی علاقے میں پھیل گئے۔ اور گوریلا جنگ لڑنے لگے

۱۹۱۸ء کے موسم گرما تک ایلی اوول، وادی فرغانہ، آذربائیجان، خوقند اور قازاقستان ہر جگہ آزادی کی تحریک ہوئی تھی دم توڑ گئی۔ اب خیوا بخارا کی ریاستیں باقی رہ گئیں۔ اب گویا یہ روسی مسلمانوں کی آزادوں اور امنگوں کی پناہ گاہیں بھی تھیں اور ناامیدی کی اڈے تھے پھیلتے ہوئے اندھیروں میں امید کی موہوم اور دم توڑتی ہوئی لوؤں کا سرچشمہ بھی۔ مسلم علاقہ مسلمانوں نے میدانوں میں شکست کھانے کے بعد فرغانہ اور تاجکستان کے پہاڑوں میں تتبع ہو کر اور یا جنگ جاری کر دی تھی۔ ان ریاستوں سے نہ صرف انہیں فنوی قوت فراہم ہوتی تھی بلکہ یہیں سے وہ غیر ملک سے اسلحہ حاصل کرنے کے لئے مذاکرات بھی کر رہے تھے کمیونسٹ سے کمیونسٹ برداشت کر سکتے تھے۔ چنانچہ سرخ افواج نے خیوا کی طرف بڑھیں۔

خیوا داخلی افتراق و تشتت کے ہاتھوں بھانکنی کے عالم میں تھا۔ ازبکوں اور ترکمانوں کے درمیان کئی سال سے بڑی شدید کشمکش برپا تھی۔ ترکمان محمد قربان، جنید خان نے ۱۹۱۰ء کے بعد پیدا ہونے والے افراتفری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ریاست خیوا پر قبضہ کر لیا۔ خیوا کا خان سید عبداللہ اس کے ہاتھ میں محض کٹھ پتلی بن

---

[1] In the Heart of Asia OP Cit, P 171

[2] 176

گیا۔ ازبک آبادی جنید خان کی سخت مخالف تھی۔ اور وہ اس مخالفت کو جبر و تشدد کے ہتھیاروں سے کچلنے میں مصروف تھا۔ دوسرے مسلمان علاقوں کی طرح یہاں بھی آزادی خیالی کی رو چل رہی تھی۔ کمیونسٹ پارٹی یہاں ۱۹۱۹ء میں نیسگی ارگنج کے مقام پر قائم ہوئی۔ جمعیۃ نیاز مسلمان مزدا اس کا سرخیل تھا۔ اس سلطان مراد نے تمام نہاد سوویٹ جمہوریہ ترکستان کے ساتھ ساز باز کی۔ اور آزاد خیال جدیدیوں[1] نے جنید خان سے نجات پانے کے لئے اس سے مدد مانگی۔ ۱۹۱۹ء کے اواخر تک جنید خان اور ازبک عوام کی کشمکش نقطۂ عروج پر پہنچ گئی اور بغاوت کی سی کیفیت نظر آنے لگی۔ ہر طرف بدامنی اور انتشار کا دور دورہ تھا۔ نومبر ۱۹۱۹ء کے اواخر میں سرخ افواج فرنز (Frunze) اور کوبی شیف (Kuibv Shb) کی کمان میں خیوا کی طرف بڑھیں۔ تورت کل (Tort Kul) پہنچ کر دو حصوں میں بٹ گئی ایک حصہ خوجیلی کی طرف بڑھا جہاں جنید خان فوج نے کر پہنچ چکا تھا۔ دوسرے نے نیسگی ارگنج کا رخ کیا کمیونسٹوں کے زمین پہلے ہی ہموار کر رکھی تھی۔ ایک دن کی لڑائی کے بعد ۹ دسمبر کو جنگ ختم ہو گیا۔ جنید خان نے پیچھے ہٹ کر پھر مزاحمت کی۔ لیکن عام آبادی کی تائید و حمایت سے محروم ہونے کی بنا پر اس کے قدم کہیں بھی جمنے نہ پائے۔ یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو خیوا سرخوں کا ہو گیا۔ جنید خان نے بھاگ کر قراقم میں پناہ لی۔ جہاں وہ عرصے تک ترکمان صفر کے ساتھ مل کر سرخ افواج سے لڑتا رہا۔ خیوا کا خان سید عبداللہ جو محض برائے نام حکمران تھا حکومت سے دست بردار ہو گیا۔ اس کی جگہ جدیدیوں اور کمیونسٹوں پر مشتمل انقلابی کمیٹی نے لے لی۔ اسی روز خیوا عوامی جمہوریہ کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔

بخارا کا سقوط

اب بخارا باقی رہ گیا تھا۔ اس کی مثال اس کشتی کی سی تھی جو ہولناک طوفان میں گھر چکی ہو۔ اور موجوں کے تھپیڑوں سے اس کا ایک ایک بند اور تختہ ڈھیلا پڑ رہا ہو۔ بادبان پھٹ گئے ہوں اور رسیاں ٹوٹے ہوئے ہوں۔ روس میں بولشوی حکومت قائم ہوئی تو امیر بخارا نے

---

[1] جدیدی در اصل اصلاح پسندی کے طریقے کے وہ لوگ تھے جو ایک طرف تو اسلامی تہذیب و ثقافت کے امین تھے اور دوسری طرف مسلمانوں کو جدید یورپی ثقافت کے رنگ میں رنگنے اور آزادی نسواں اور مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں مغربی طرز کے اصلاحات کے نقیب بھی تھے۔ اسماعیل گریمیا کے آزادی مانشوریا میں آخری شخص تھے جو جدیدیت اسلامیت اور مغربیت کو ہم آہنگ بنانے کی کوشش کی۔ یہ اسلامی اور ترکی تعاون کے علمبردار بھی تھے۔ اور روس کے ساتھ مل کر چلنے کے حامی بھی

toobaa-elibrary.blogspot.com

اس سے تعلقات استوار کرلئے۔ بلشویک حکومت کا ایک وزیر بخارا پہنچا۔ دونوں سلطنتوں کے درمیان جو معاہدے ماضی میں ہوئے تھے ان کی از سرِ نو توثیق و تجدید کی اور بخارا کی آزادی تسلیم کرلی۔ آزاد ہوتے ہی بخارا نے افغانستان کے ساتھ بھی بنیادوں پر سابق استوار کئے سفیروں کا تبادلہ ہوا۔ اور اسپنا ایک نمائندہ سفیر برطانوی سفیر متعینہ مشہد کے پاس بھیجا اور ہرزار کا تختہ الٹنے کی جدوجہد لئے مرحلے میں داخل ہوگئی۔ ابتک جدیدی نوجوان ترکوں[1] ہی سے متاثر تھے مذہب کی گرفت ذہن و کردار پر ڈھیلی پڑ چکی تھی توان کے اندر ہر طرح کے نظریات قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی ایک گروہ روس کے بالشویک انقلابیوں سے بھی متاثر ہوا۔ اور آگے چل کر سوشلزم کی طرف مائل ہوا۔ اس کا سرغنہ بنا امیر لکھتا ہے

اسی اثنا میں مملکت بخارا کے اندر بھی اصلاح میں مصروف رہا لیکن بالشویک جماعت نے اپنی غیر قانونی اہلیت، اپنے بالکل متقدد اور ناپاک مسلک کا پول بھی جرا کیا۔ تو رفتہ رفتہ جتنے دن گذرتے گئے ان کا فعل شنیع دولت مقدس بخارا میں بھی سرایت کرتا چلا گیا۔ بعض جاہل اور بے علم لوگ جو بے اصل اور رُوسیاہ تھے اور جو بالشویکوں کو اپنے قلب میں جگہ دیئے ہوئے تھے اور بالشویزم کو عام کردینے کی کوششوں میں مصروف تھے ایسے پورے، انہوں کا ثبوت دینے لگے:

قریب قریب ایک سو سترہ آدمیوں نے سمرقند و تاشقند والوں کے ساتھ اتحاد اور تعاون کرکے اپنے دو ساتھیوں کو جس کا نام خواجہ فیض اللہ (خواجہ سیف، اور مرزا محی الدین منصور تھا۔ رہنما بنالیا چونکہ ان لوگوں کا مقصد بھی بالشویکوں کے مقصد کی طرح تھا اس لئے انہوں نے بالشویکوں سے مدد چاہی۔ بالشویک جماعت نے بھی جدید مفسدوں کی مدد کی[2]

بخارا کی جدید پارٹی میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ دائیں بازو کے جدیدی بخارا کے امیر کو ختم کرنے کے تو حامی تھے مگر وہ آزادی پسند بھی تھے اور جمہوری اور قومی نقطہ نظر بھی رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی تنظیم کی قانونی حیثیت کے لئے امیر سے مذاکرات کا فیصلہ کیا۔ اس پر کمیونسٹ اور بائیں بازو کے جدیدی پارٹی سے الگ ہوگئے اور "نوجوان بخارا" کے نام سے اپنی الگ جماعت قائم کی۔ فیض اللہ خواجہ سیف ان کا لیڈر تھا انہوں نے ایک الگ

---

[1] اس سے مراد نوجوان ترکوں کی نوری تحریک ہے جس کے بانی ابراہیم شیخ سمی اور اسحاق کمال وغیرہ تھے۔ بخارا کے انقلابیوں نے

[illegible] سے سب سے باز تنزع کردی۔ دوسری طرف مزدوروں اور امیر کی فوج میں گھسنے لگے۔ بخارا سے باہر [illegible] کمیونسٹ پارٹی پہلے ہی سے کام کررہی تھی۔ اس کی بنیاد ۱۹۱۸ء میں رکھی گئی تھی اور اس کے ارکان کی بھاری [illegible] مملکت بخارا میں رہنے والے روسیوں پر مشتمل تھی۔ "نوجوان بخارا" کے جدیدی امیر کی گرفت سے بچنے [illegible] تاشقند پہنچے تو ان کی سرگرمیاں تیز تر ہوگئیں۔

[illegible] فیض اللہ خواجہ سیف کے ساتھ تخت و تاج کے نتیجے میں جنرل کولیسوف یکم اپریل ۱۹۱۸ء کو دو سو خدام [illegible] اور پچاس سرخ فوجیوں پر مشتمل جدید ترین ہتھیاروں، بکتر بند گاڑیوں اور بھاری بھی توپوں سے مسلح فوج [illegible] اور بخارا کا محاصرہ کرلیا۔ امیر کو پیغام بھیجا کہ وہ اس سے کانگرس جدید بخارا میں آکر ملے امیر نے [illegible] سے انکار کردیا۔ البتہ وزیر اعظم اور قاضی بخارا کو بھیجا کولیسوف نے ایک منشور نہیں دیا اور [illegible] کیا۔ "جس پر بے چون و چرا دستخط کرے۔ منشور میں کہا گیا تھا کہ امیر تحریر و تقریر کی آزادی دینے، [illegible] کو معاف کرے نوجوان بخارا پارٹی کے ارکان مقرر کرے، سزائے موت اور جسمانی تعذیب کی تنسیخ اور [illegible] کرے۔ امیر نے منشور پر دستخط کرنے سے انکار کردیا۔ چنانچہ اس نے الٹی میٹم دے دیا جس [illegible] بخارا پارٹی کے صدر فیض اللہ خواجہ سیف کے دستخط تھے کہ اگر سوف کے پہلے بیان کے مطابق منصوبہ [illegible] امیر کو مذاکرات کی دعوت دی جائے اگر کوئی کولی سوف کے مطالبات ماننے سے انکار کردے تو نوجوان [illegible] کے قتل میں بغاوت کرکے امیر کو تخت سے اتار دیں منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں مشکل پیدا ہو تو [illegible] فوج خود ان کی مدد کو پہنچ جائے۔ لیکن امیر سے متوقع ملاقات سے ایک دن پہلے منام کے مقام پر منصوبہ [illegible] گیا۔ منصوبے کے مطابق طے پایا تھا کہ امیر سے مذاکرات ناکام ہوجائیں تو نوجوان بخارا ایک ڈپٹیچمنٹ [illegible] فوج کی مدد سے بخارا پر یلغار دے گا ٹھیک اس وقت قلعہ کے اندر بغاوت ہوجائے گی اس دوران [illegible] کو امیر مملکت کے دوسرے حصوں سے فوج طلب کرکے۔ قلعہ کرکی اور چارجوئی کے اضلاع میں بغاوت [illegible] کرنی ہوگی[1]

یہ وہ زمانہ تھا جب لکھنؤ میں ایک ملاقات خفیہ طور سے ہوئی تھی جو کہ تھے تو دوسری طرف، اشک آبادیں آزادی [illegible] عام ہوچکی تھی۔ اور کمیونسٹ بلشویک کے گہرے اثرات رہے تھے۔ ادھر جنرل ڈیوٹوف نے اورنبرگ

---

[1] Bolshevism in Turkestan OP Cit P. 25 FN 44

toobaa-elibrary.blogspot.com

پر قبضہ کر کے ترکستان کو پیٹرو گراڈ سے کاٹ دیا تھا۔ بخارا کے مسلمان بے سروسامانی کے باوجود بڑی بہا
لا سے کوئی سودے سے جب دیکھا کہ بخار نرم چارہ نہیں ہے اور پیٹرو گراڈ سے ملک پہنچنے کی کوئی صورت ن
تو صلح کی بساط بچھائی۔

بخارا کی زندگی کے ابھی دو سال باقی تھے۔ ماس اوران میں رنج حالات کیمونسٹوں کے حق میں بدل گیا۔ جر
ڈیوٹوف شکست کھا کر اور سر گرگ چھوڑنے اور مغربی ترکستان کی طرف پسپا ہونے پر مجبور ہو گیا۔ اس طرح
اور پیٹرو گراڈ کے درمیان سپلائی لائن برقرار ہو گئی۔ ابھی دنوں افغانستان کا حکمران حبیب اللہ خان قتل
وہ انگریزوں کا حامی تھا اور بنی داس کی وساطت سے انگریزوں سے امداد حاصل کرتا رہا تھا۔
حبیب اللہ خان کے چھوٹے بیٹے امان اللہ خان نے اپنے بڑے بھائی عنایت اللہ اور چچا نصر اللہ خان کو اپنے
قتل کا ذمہ دار ٹھہرا کر گرفتار کر لیا۔ امان اللہ خان نے تخت پر بیٹھتے ہی انگریزوں سے جنگ چھیڑ دی۔
انگریزوں نے وسط ایشیا سے صرف نظر کر کے اپنی ساری توجہات برصغیر پاک و ہند کی شمال مغربی سرحدوں کے
تحفظ پر مرکوز کر دیں۔

۱؎ امیر حبیب اللہ خان والی افغانستان کے قتل کی اصل وجہ اس کی انگریز نوازی بتائی جاتی ہے اس کے قتل کے متعلق کئی نظریے
کیا تھے اور قاتل کون تھا۔ اس بارے میں وثوق سے صحیح اور دو ٹوک بات آج بھی نہیں کہی جا سکتی۔ روسیوں نے حبیب
کا قاتل مصطفےٰ صغیر کو قرار دیا جو برطانوی حکومت کا تنخواہ دار ایجنٹ تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ امان اللہ خان نے بھی یہ
الزام عائد کیا کہ قاتل برطانوی ایجنٹ تھا۔ یہ الزام عام معلوم ہوتا ہے۔ امیر حبیب اللہ خان انگریزوں کا گہرا دوست تھا۔ اس نے
گرانے سے برطانیہ کو نقصان ہی پہنچ سکتا تھا۔ اس لئے واقعات کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے سے یہ بات عنایت اللہ خان اور نصر اللہ خان
حبیب اللہ خان کی انگریز نواز پالیسی کے حامی تھے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ امیر حبیب اللہ خان کی سازش قتل کا سرغنہ
محمود طرزی تھا اس کی بیٹی غازی امان اللہ خان کی بیوی تھی۔ امان اللہ خان تخت کے دونوں دعوے داروں کو پیچھے رہتے ہوئے تخت نشین ہوا تو محمود طرزی نے خود وزارت خارجہ کا قلمدان سنبھالا۔

اس زمانے میں کابل کیمونسٹ ایجنٹوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ان کا سرغنہ میخائل برائن تھا جو زار کا ٹرپوسیٹ رہ چکا
تھا۔ اور اسکیموسلوں کے پرانے سوچ کی پرستش کرتے لگا تھا۔ ان ایجنٹوں کا سنڈیکیٹ کی آزادی پسندوں سے ہوا
میں مقیم تھے گہرا رابطہ تھا۔ میخائل ایک خطرناک برطانوی ایجنٹ تھا جس کے ہاتھ میں اس سے بالشویک حکومت بھی

کے بعد چیچرین نے مکریدسے مشرقی کو لکھا تھا۔ کہ کابل میں مقیم ہندوستانی انقلابیوں کے ساتھ گہرے روابط
کرنے میں خاصی کامیابی ہو رہی ہے (دیکھئے ازنظر لٹویر کی کتاب
تاریخی بیلارڈ میں ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ محمود طرزی یا امان اللہ خان کے روابط ان کیمونسٹ ایجنٹوں سے تھے
لوجہ تخت اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد روسیوں کے ساتھ عہد و پیمان استوار کرنے کی شہادتیں ملتی ہیں۔ بالکل ابتدائی
برطانوی انٹیلی جنس کے ہاتھوں دو مراسلے لگے۔ ایک امان اللہ خان کا حبیب کے نام اور دوسرا محمود طرزی کا بالشویک
ے نام۔ دونوں خطوط سے ارنسٹ ٹیلیجر کے بقول بالشویک حکومت کے ساتھ اخلاص اور تپاک کا اظہار ہوتا تھا
وزی اور امان اللہ خان امیر حبیب اللہ خان کے آخری دور حکومت میں افغانستان کی داخلی سیاست میں سرگرمی سے
ے رہے تھے اس کے پیش نظر یہ بات ناقابل تصور ہے کہ ان کی روس دشمن برطانوی حکومت کی مخالف قوتوں کے علیہ
کے ساتھ نہ ہو گی۔ روسی حکومت اور امان اللہ خان دونوں کا برطانوی بالشویک کو امیر کے قتل کا ذمہ دار ٹھہرانا کیا معنی تعلق
سی حکومت نے قاتل کا نام بتا دیا اور یہ دعوے ہے کہ مصطفےٰ صغیر ہی قاتل ہے تو کیا یہ امکان نہیں کہ وہ دوہرا کام
پولیس ایک وقت وہ برطانیہ کا ایجنٹ ہو اور دوسری طرف کیمونسٹ روس کا۔ انٹیلی جنس کی تاریخ میں ایسے
یشوں کی مثالیں ملتی ہیں جو بیک وقت دو مخالف طاقتوں کے ایجنٹ ہوتے ہیں۔ سوویٹ روس نے تو اکثر ایسے
سے کام لیا ہے۔ سر ہال ٹیک اس رائے میں ہے جب کہ انگریز وسط ایشیا کی بدلتی ہوئی سیاست میں گہری دلچسپی لے
تھے۔ امیر کا قتل اس شبہ کو تقویت پہنچاتا ہے کہ اس کے پیچھے کیمونسٹوں کا ہاتھ تھا۔ جب نہیں کہ انہوں نے محمود طرزی
ے سازباز کر کے مصطفےٰ صغیر سے اس قتل کا پہلا ہو قتل کی ذمہ داری آسانی سے برطانیہ پر ڈالی جا سکے (واللہ اعلم بالصواب)

حبیب بھی ہے کہ بولشوی مورخین امان اللہ خان اصلاحات سے بھرے ہاتھ پاکستان کی موجودہ فوجی (باقی صد پر)

toobaa-elibrary.blogspot.com

امان اللہ خان نے رشید شیخ جلال الدین افغانی کو ۱۹۲۰ء میں کمیونزم کی پذیرائی مہیا کرنے
بھیجا حقیقت میں کچھ بھی ہو بخارا پر تباہی آگئی۔ سیاسی مشکلات کے علاوہ اسے معاشی و اقتصادی پریشا
نے بھی آلیا تھا۔ بخارا کے اپنے وسائل منتشر و پسماندہ تھے کہ پوری آبادی کے لئے کافی ہوتے۔ اس
کا بڑا حصہ ترکستان اور روس سے آتا تھا۔ بیونسٹوں نے گندم وغیرہ کی ہمسائی منقطع کر دی تھی۔ ادھر سو
ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں سوکی بلاک ہو چکے تھے۔ ین کی کاشت پوری طرح نہیں ہو
پوری مملکت میں قحط کی سی صورت پیدا ہو گئی۔ عوام اس اقتصادی اور معاشی بحران سے سخت پریشا
مضطرب تھے۔ سوشلسٹ ایسی صورت حال کو کیپیٹلائٹ کرنے میں بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ ا
پروپیگنڈے کی مہم شروع کر دی۔ چنانچہ کسانوں کی بھاری تعداد اس پروپیگنڈے سے متاثر ہو
سوویٹ جمہوریہ کی طرف چل کھڑی ہوئی اور بخارا میں پھیلی ہوئی افراتفری اور سراسیمگی میں م
اس افراتفری میں کمیونزم بخارا کی طرف بڑھا۔ اس تدریج سے کہ آگے آگے کمیونسٹ پروپیگ
مسحور کرتا جا رہا تھا اور پیچھے پیچھے سرخ فوجیں رین ہو معصوم، ہر شہر اور قریہ میں مار آستینوں کو
زیادہ تر سرکاری ملازم، درباری، حتیٰ کہ وہ طبقہ جو دل فرش رہ سے سرخ افواج کی تعداد کا منتظر تھا۔ جونہی
قریب وجوار میں نمودار ہوتی یہ مار آستینیں اس سے جا ملتے۔ اس طرح پندرہ سے زیادہ شہر کمیونسٹ
پکے ہوئے سیبوں کی طرح کمیونسٹوں کی جھولی میں گر گئے۔ شہر پر شہر بغیر کسی مزاحمت کے
بخارا کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے برطانوی سفیر سے ملاقات کی۔ سفیر برطانیہ سر صفیر کی شمال مغربی
اپنی مشکلات میں گرفتار تھا۔ بعد اس نے امیر کا خزانہ بحفاظت تمام منتقل کرنے کی ذمہ داری

۲۰ اگست ۱۹۲۰ء کو سرخ افواج بخارا کی فصیل تک پہنچ گئیں۔ اور انہوں نے شہر کا محاصرہ
مسلمان مکمل دفاعی انتظام کر چکے تھے۔ فصیل کے چاروں طرف گہری خندق کھود دی گئی تھی
لائن کی حفاظت کے لئے بخاری افواج متعین کی جا چکی تھیں۔ مسلمانوں کو چاق و چوبند دیکھ کر لیڈر

بقیہ صفحہ ۱۱۷ حکومت بھی ہندوستان اور خود پاکستان کے معاملے میں اسی سامراجی کے خلاف
حزم و احتیاط سے کام لے رہی ہے۔ لیکن حالات کے تقاضے میں صاف دلائل دے رہا ہے اس طرح ان حضرات
کو بھی پاکستان کی مخالفت اور ہندوستان کی حمایت سے باز آجانا چاہیئے۔ ورنہ جس طرح موجودہ حکومت کی غلط پالیسی پر پاکستان کو بچانے میں ان

پھر مذاکرات و تدبیر سے کام لینے کا فیصلہ کر لیا۔ امیر بخارا لکھتا ہے:-

"بالشویکوں نے اس موقعہ پر چاپلوسی دکھائی اور سابقہ روابط اور دوستی کا اعادہ چاہا۔ ایک شخص سیرانوف نامی وزیر خارجہ کو وزیر مختار بنا کر تاشقند سے بھیجا۔ یہ شخص بخارا آیا اور مجھ سے بندہ عاجز سے ملاقی ہوا۔ عذر خواہی کر کے اس نے پھر گفت و شنید کی اور معاہدہ کیا۔ اس نے عرض کیا کہ دولت روس نے ۵۵ سال تک دولت بخارا سے دوستی اور صلح رکھی ہے اور اس وقت بھی ہماری حکومت کو سلطنت بخارا سے فائدہ ہی فائدہ رہا ہے۔ اور کوئی نقصان یا شکایت جانبین میں پیدا نہیں ہوئی۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ چند دن کے اندر پھر دونوں حکومتوں میں دوستی اور آشنائی کا ظہور ہو جائے تو مناسب ہے تاکہ آپ کی سلطنت سے ہم اعانت و منفعت حاصل کریں اور ہماری دولت جمہوری سے جو بھی خدمت ممکن ہو سکے ہم آپ کی سلطنت کو پہنچائیں۔

لیکن اس نے استدعا کی کہ ہماری لے فتاوی دور کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ اپنی فوجوں کو ریلوے اسٹیشنوں سے ہٹا لیں۔ ہماری فوجیں وحشی اور نادان سپاہیوں سے بھری ہوئی ہیں۔ مبادا یہ حادثہ پیش آئے کہ آپ کے لشکر کو دیکھ کر ان کا مقابلہ کر بیٹھیں اور ذات شاہانہ کے سامنے ہمیں شرمسار ہونا پڑے۔"[1]

اسی اثنا میں ذہیب میں آگیا۔ مذاکرات کے بعد معاہدے کی تجدید ہوئی اور روسی سفیر اپنے وطن چلا گیا۔ امیر نے اسے بڑے اعزاز کے ساتھ رخصت کیا۔ چند خاص خاص بطور سپاہ اس کے ساتھ کئے۔ روسی سفیر نے رخصت ہوتے وقت امیر کو یقین دلایا کہ

"ہر معاملے میں جو آپ کی خواہش اور رضامندی ہوگی ہم بروقت طے کر لیں گے۔"

امیر نے مختلف اسٹیشنوں اور ریلوے لائن سے چند مختصر دستوں کے سوا ساری فوج تین میل پیچھے ہٹا لی۔ سادہ لوحی یا بے بسی ملاحظہ فرمایئے۔

---

[1] بخارا کا آخری فرمانروا صفحہ ۲۲۰، ۲۲۱ [2] عبرت سانحہ ص ۲۳

toobaa-elibrary.blogspot.com

"سوچا یہ کہ شاید اسی طرح ان مخصوص دشمنوں کے ظلم سے بندگانِ عاجز رہائی پائیں۔"[1]

اس فریب کا پردہ اس وقت چاک ہوا جب ۲ اگست ۱۹۲۰ء (۱۵ ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ) کو آدھی رات کے وقت سرخ افواج نے بخارا پر یلغار کر دی۔[2] اس بات کا پورا اہتمام رہتا گیا کہ دشمن کو خبر نہ ہونے پائے۔[3]

حملے کا سارا منصوبہ انتہائی رازمیں رکھا گیا۔ سرخ افواج زبردست توپوں، بکتر بند گاڑیوں اور ٹینکوں کے ساتھ دو سمت سے بخارا کی طرف بڑھیں۔ ایک فوج کو کان (جدید بخارا) کی جانب سے اور دوسری ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ راستے میں کہیں بھی مزاحمت نہ ہوئی۔ امیر اپنی افواج پہلے ہی پیچھے ہٹا چکا تھا جو مختصر سے گروپ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ مختلف مقامات پر متعین تھے اور ان کی مجموعی تعداد ۱۵۰ فوجی جوانوں سے زیادہ نہ تھی۔ انہیں کمیونسٹوں نے غفلت اور بے خبری میں آلیا اور گولی چلائے بغیر گرفتار کر لیا۔ ٹھیک ۴ بجے جب کہ اہل بخارا نمازِ صبح کے لئے بیدار ہو رہے تھے توپ نے پہلا گولہ بخارا پر پھینکا جلد ہی گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ بخارا نے بے سروسامانی کے باوجود شدید مزاحمت کی مسلمانوں نے روسی فوجوں کا جس شجاعت اور مردانگی کے ساتھ مقابلہ کیا اس کا حال خود ہی کو لی سیمنوف روسی فوجوں کے کمانڈر انچیف کے رفیق خاص خدیو کی زبان سے سنئے:۔

"قلعہ کے محصور غازی ملا اپنی بے سروسامانی کے باوجود نہایت دلیری کے ساتھ لڑے ان کے ہاتھ میں صرف چاقو، کلہاڑے اور رائفلیں کی گولیاں تھیں۔ میں نے خود ایک مسلمان کو دیکھا جس کے ہاتھ میں ایک سونٹا تھا دانتوں میں تلوار دبائے وہ بے جھجک مشین گن کی طرف بڑھا اور مشین گن چلانے والے کو مار دیا۔"

---

[1] کیونزم کے بانی نے ہر جگہ مسلمانوں نے یہ غلطی کی (یعنی مصالحت پسندی کا رویہ اختیار کرنا) اور کر رہے ہیں۔ اگر محض خدا کو جبر و تشدد سے کلیۃً آزاد کرنے والی سوشلزم کے خلاف یہ رعایت کی سکت باقی نہیں تو کیا یہ بھی ممکن نہیں کہ کم از کم مداہنت کے لئے تو سر جھکا کی بازی لگا دی جائے اور ہوا ہو تو یہ مومن کی صورت ہو جائے۔

[2] بخارا کا تجزیہ انقلاب ص ۲۴ [3] ایضاً

[4] جیمز سمر قند ص ۱۴۱ اردو ترجمہ مطبوعہ فرید بک ڈپو دہلی کشمیر مقدمہ تالیف جوشا کوسٹر (۱۹۲۱ء) ص ۱۰

بالآخر امیر کی فوج کمیونسٹوں کے حملے کی تاب نہ لا کر بخارا قدیم کی طرف ہٹ گئی۔ بہت سا اسلحہ اور فوجی سازوسامان کے ہاتھ لگے۔ کان اور بخارا قدیم میں کچھ زیادہ فاصلہ نہیں۔ دوپہر کے قریب سرخ افواج کے چند دستے بخارا قدیم کے مضافات میں پہنچ چکے تھے۔

بخارا کی فوج اور عام شہری اپنی جانوں پر کھیل گئے مگر آتش و آہن کا سیلاب روکنا ان بے سروسامان بہادروں کے ہاتھ میں نہ تھا۔ پرانی موتھ کی توپیں اور گیارہ طیارے دن رات گولہ باری میں مصروف رہے۔ سیر بخارا کے اطراف میں اس بمباری سے آدھا شہر تباہ ہو گیا۔ لیکن اس کے باوجود بخارا چار دن تک لوہا لیتا رہا۔

بعض مواقع ایسے بھی آئے کہ سرخ فوج کے قدم اکھڑنے لگے لیکن فوراً ہی انہیں تازہ دم کمک پہنچ گئی کمیونسٹ سامراجی ہر قیمت پر وسط ایشیا[1] میں مسلمانوں کے اس آخری حصار کو فتح کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ مصیبت بالائے مصیبت یہ کہ غداروں اور مارکسیتوں کے ایک گروہ بخارا کے اندر موجود تھا جس کا نہ صرف حملہ آور فوج کے ساتھ رابطہ قائم تھا بلکہ خود مسلمانوں کے حوصلے پست کرنے کے لئے گمنام افواہیں پھیلا رہا تھا۔ اس طرح باہر سے سرخ سامراجی افواج اپنی پوری قوت سے حملہ آور تھیں۔ اور دن رات آگ برسا رہی تھیں۔ اور اندر سے ملک و ملت کے غدار نقب لگا رہے تھے کسی قوم کی سب سے بڑی بدبختی یہ ہے کہ اس کے اندر غداروں کا گروہ نہ صرف موجود اور سرگرم کار ہو بلکہ اسے برداشت کیا جائے گذشتہ دو تین صدیوں میں مسلمانوں نے اپنے ملکوں میں جہاں کہیں مغربی اور مشرقی سامراجیوں کے ہاتھوں شکست کھائی تاریخ گواہ ہے کہ اس کا ایک اہم ترین سبب ان کے درمیان پائے جانے والے غدار اور مارکسیتین تھے۔[2]

بخارا زبردست مزاحمت کے بعد سرنگوں ہو گیا۔ امیر اور اس کے ساتھیوں نے جب دیکھا کہ جنگ ہر محاذ پر ہے تو کمیونسٹ فوجوں کے شہر میں داخل ہونے سے پہلے نکل گئے۔[3]

کے ساتھ افغانی سفیر اور افغانی علما کرام کے قاضی کے علاوہ اپنے اعلیٰ افسر بخاری افواج کا استقبال

---

[1] موجودہ روسی جمہوریہ ازبکستان کو ترکستان ہی نہیں بلکہ وسط ایشیا کہتے ہیں ترکی کا لفظ مسلم کے ہم معنی ہے اسی لئے روسی حکومت نے لفظ ترکی کو ہر جگہ خارج کرنے کی کوشش کی ہے سرخ انقلاب میں ص ۱۰۱ [2] روس میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ ص ۱۴ [3] بخارا کا تجزیہ انقلاب ص ۲۵، ۲۶

toobaa-elibrary.blogspot.com

افغانی فوج و جو امیر حبیب اللہ خان نے اپنے زمانے میں بطور امداد بھیجی تھی، کل تقریباً ۲۵ ہزار افراد تھے [illegible] کی ہجرت کی خبر پھیلی تو عامۃ المسلمین میں ہیجان اور اضطراب پھیل گیا اور تقریباً دس ہزار آدمی محمد [illegible] پہنچ گئے۔ امیر بخارا سے بدھ کے روز روانہ ہوا جمعرات کو مجذوان پہنچا وہاں سے مشرقی بخارا [illegible] کیا۔ آٹھ دن کے بعد خورتان پہنچا۔ جو بخارا کا ایک صوبہ تھا۔ وہاں گیارہ دن قیام کیا اور عین اس وقت جب کہ یہ قافلہ دریائے عجذوان عبور کر رہا تھا دشمن کی بکتر بند گاڑیاں اور ٹینک سامنے سے نمودار [illegible] راستہ مسدود پاکر امیر دو روز بعد پہنچا۔ اسی دوران امیر نے صوبہ حصار سے فوج بھرتی کی اور بندیں کو [illegible] ہزار دستہ چھوڑا اور خود پیچھے ہٹ کر اور حصار مشرق کو مرکز بنا کر جنگ چھیڑ دی۔ چھ مہینے تک [illegible] قدم پر روسی افواج کی مزاحمت کی گئی۔ سخت جاں بخاریوں کی شدید مزاحمت سے عہدہ برآ ہونے [illegible] لئے ماسکو سے تازہ دم افواج اور سامان جنگ پہنچ گیا۔ امیر نے امداد و اعانت کے لئے ہاتھ پاؤں [illegible] مگر کہیں سے کوئی مدد نہ ملی۔ دس روز تک سخت جنگ کے بعد امیر بخارا کمیونسٹ ماسکو کے معاہدے [illegible] کی طرف فرار ہو گیا۔ لیکن خود امیر بخارا کا بیان ہے کہ وہ اپنے فوجی افسروں کے مشورے پر فوجی مدد لینے [illegible] کابل گیا۔[1]

ترکستان کی نئی تقسیم اور مذہب کے ساتھ بالشویکوں کے تین رویے

ترکستان پر مکمل قبضہ کرنے کے بعد بالشویک نے اس کو پانچ جمہوریتوں میں تقسیم کیا

۱۔ ازبکستان ۲۔ تاجکستان
۳۔ ترکمانستان ۴۔ قرغیزستان
۵۔ قازقستان

ان پانچ جمہوریتوں کے نام بھی قبائلی عصبیتوں سے اخذ کئے گئے اور ہر جمہوریہ کا نام [illegible] نسلی بنیاد پر رکھا گیا۔ تاکہ ان کے درمیان قومی اور نسلی عصبیت کی آگ ہمیشہ کے لئے دہکتی رہے۔ اور وہ کبھی بھی سوشلزم کے مقابلے میں متحد نہ ہو سکیں۔[2]

---

[1] بخارا کا جمہوری انقلاب ص ۲۹، ۲۸ [2] سرخ اندھیریاں ص ۱۵، ۱۶

بالشویکوں نے ترکستان میں مذہب کو ختم کرنے کے لئے تدریج سے کام لیا۔ پہلے مرحلے میں منافقت کا [illegible] یہ مرحلہ ۱۹۱۷ء یعنی انقلاب کی تاریخ سے شروع ہوتا ہے۔ اور ۱۹۲۹ء پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ بارہ [illegible] روس کے اندر خانہ جنگی کے سال کہلاتے ہیں۔ ایک طرف عالمی جنگ کے اثرات باقی تھے اور دوسری طرف [illegible] ۱۱ رمیاز طبقہ، اعتدال پسند اور معاشقی جمہورین کا اثر تھا۔ اس دور استقرار کی وجہ سے بالشویکوں [illegible] مذہب کو کھلم کھلا قطع قمع کرنے کی بجائے منافقت ریاکاری اور پروپیگنڈے کا رستہ اختیار کیا۔ انہوں [illegible] سے یہ پروپیگنڈہ کیا کہ سوشلزم اور اسلام کے درمیان کوئی تضاد نہیں۔ اور قرآنی آیات سے یہ ثابت [illegible] کوشش کی گئی کہ کمیونزم اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک پلیٹ فارم پر جمع کئے جا سکتے ہیں۔ [illegible] کے اخبارات نے بھی یکایک یہ مبالغہ آمیز مضامین چھاپنے شروع کر دیئے کہ اسلام کے اندر جمہوریت [illegible] روح نیز معمولی حد تک پائی جاتی ہے۔ اور علمائے حق بڑے جمہوریت پسند اور عوام کے غمخوار ہیں۔ ۱۰ افغانستان [illegible] اندر کمیونسٹوں نے مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لئے "عوامی شرعی انجمنیں" بھی قائم کر دی۔

دوسرا مرحلہ ۱۹۳۰ء سے شروع ہوا اور ۱۹۴۱ء تک جاری رہا۔ اس دور میں بالشویکوں نے یک بارگی دین پر [illegible] شروع کر دیا اور مسلمانوں کو تہ تیغ کرنا شروع کر دیا۔ مسلمانوں کے مذہبی مراکز اور مسجدوں کو بیوند خاک کر دیا۔ تیسرا مرحلہ موقع پرستی کا مرحلہ کہا جا سکتا ہے۔ اس دور میں دوسری عالمگیر جنگ چھڑ چکی تھی اور بالشویک [illegible] حکومت نے دنیا کی مسلمان حکومتوں کے ساتھ تعلقات پیدا کرنے شروع کر دیئے تھے۔ اس دور میں تشدد اور [illegible] سخت گیری کی پالیسی میں تبدیلیاں کی گئیں۔ خانہ سیاست میں پروپیگنڈے کا رنگ غالب آگیا اور باہر کے [illegible] مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لئے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کئے گئے۔ اور ملک کے اندر سائنس [illegible] بنیادوں پر الحاد اور دہریت کو فروغ دینے کی مہم جاری کر دی گئی۔

[illegible] ملاحظہ ہو علامہ "ریویو آف ریلیجنز" شمارہ ۳، جلد ۱۳ ص ۲۰۴ اور بعد جلد مطبوعہ ماسکو [illegible] سرخ اندھیریاں ص ۱۵

toobaa-elibrary.blogspot.com

باب پنجم

سوشلزم کی مذہب اور اخلاق دشمنی

○

مذہب و اخلاق وہ بنیادی قوتیں ہیں جن سے انسانی معاشرے نہ صرف مادہ پرستی سے محفوظ رہتے ہیں بلکہ ان سے زندگی اور فروغ پاتے ہیں۔ یہی قوتیں ہی کے اندر اپنی قومی زندگی اور قومی تہذیب و ثقافت کی حفاظت و دفاع کا جذبہ پیدا کرتی ہیں اور انہیں کارزار حیات میں زندہ رہنے کا اہل بناتی ہیں۔ یہ سرچشمۂ زندگی اور اس سے حاصل ہونے والا تہذیبی و ثقافتی سرمایہ محفوظ رہے تو سب سیاسی غلامی کی رات کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو جائے آزادی کی صبح طلوع ہو کر رہتی ہے لیکن اگر کسی قوم کو اس سرمایۂ حیات سے محروم کر دیا جائے تو وہ نہ صرف سیاسی طور پر ہمیشہ کے لئے غلام بنا کر رکھی جا سکتی ہے بلکہ اس کے جداگانہ قومی تشخص کو بھی موت کے گھاٹ اتارا جا سکتا ہے۔ چونکہ مارکسی سوشلزم سامراجیت ہی کا دوسرا نام ہے جو قوموں کی جداگانہ ہستیوں کو توڑ مروڑ کر اور مثل تمثال ریزہ ریزہ کرنے اور جہز و بدن بنانے کی سعی و جہد کرتی ہے۔ اسی بنا پر وہ مذہب و اخلاق کو اپنی راہ کا سب سے بڑا پتھر سمجھتا ہے۔ وہ اس پتھر کو راستہ سے ہٹانے اور پاش پاش کرنے پر سب سے زیادہ زور دیتا ہے۔ اور اسے اپنی عہد کا اہم ترین ہدف قرار دیتا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے وہ علمی اور عملی دونوں میدانوں میں مذہب و اخلاق کے خلاف شدید معاندانہ فضا پیدا کرتا ہے۔ سوشلزم کے مارکسی مکتب فکر اور اس کے علمبرداروں نے سوشلزم کو ایک تحریک کی حیثیت دی۔ روس اور چین میں اسے عملاً نافذ کیا اور جب بھی سوشلزم کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے اس سے مراد یہی سائنٹیفک سوشلزم ہوتا ہے[1]

---

[1] مدرس ایران اسلام قوتیں ص ۱۸۶

toobaa-elibrary.blogspot.com

اصولی طور پر تو مارکس کے مادی نظریۂ تاریخ سے مذہبی تصورات اور اخلاقی قدروں کی بے ثباتی اور [illegible] کا اندازہ ہو ہی گیا کہ جب افکار و خیالات جدلی عمل کے تحت بدلتے ہوئے خارجی حالات کا قدرتی نتیجہ [illegible] تو کوئی بھی عقیدہ ابدی صداقت نہ رہا اور اس کے اختیار کرنے میں انسان آزاد نہ رہا۔ آج کا عقیدہ [illegible] خارجی حالات کا لازمہ ہے۔ آج اس کو چھوڑا نہیں جا سکتا، اور کل کے نئے حالات میں اس کو کسی طرح [illegible] رکھا نہیں جا سکتا۔ چنانچہ نہ تو خدا ۔ کائنات کے حاکمِ اعلیٰ ۔۔ اور رسول ۔ خالق و مخلوق کے درمیان [illegible] کے وہ مفہومات قابلِ تسلیم ہیں جو اہلِ مذہب نے متعین کئے ہیں، اور نہ ہی خارجی حالات سے [illegible] ماتھوں مجبور و بے بس انسان کی اپنے اعمال و اقوال کے لئے کسی کے سامنے جواب دہی کا وہ تصور [illegible] جس کے لئے قیامت ۔۔ دوسری زندگی ۔ کو ناگزیر قرار دیا جاتا ہے۔ اور جب امر واقعہ یہ ہے تو [illegible] اخلاقی قدروں کی بھی کوئی قدر و قیمت نہ رہی، جو ان جیسے مذہبی تصورات سے ماخوذ اور ان کی شان [illegible] اور تاثیر کو قائم رکھتے ہیں۔ لیکن مارکسیت اپنی اس انقلابی تحقیق کی اس سرسری تعلیم اور ضمنی تفہیم پر [illegible] نہیں ہوتی، بلکہ وہ مذہبی احساسات کو ایک ایک کر کے تحقیر و تضحیک کا نشانہ بناتی ہے۔ اور اس [illegible] علمبردار افراد و اداروں کی سرکوبی اپنا اولین فرض سمجھتی ہے۔

مذہب کی تحقیر

سائنٹیفک سوشلزم کا بانی کارل مارکس کہتا ہے: "مذہب عوام کے حق میں افیون کا اثر رکھتا ہے"[1]

پہلی سوشلسٹ ریاست کا بانی اور مارکسزم کا عملی و فکری شارح لینن مذہب سے جنگ کرنا کمیونسٹ پارٹی کا فرضِ عین قرار دیتا ہے۔ وہ مارکس کے قول "مذہب افیون ہے" کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"مذہب کے متعلق مارکس کا یہ قول تمام مارکسی نظائر کا گویا بنیادی پتھر ہے۔ مارکسیت کے نزدیک مذہب، کلیسا، عبادت گاہیں اور تمام مذہبی تنظیمیں محنت کش طبقے کے استحصال کے لئے رجعت پسند طبقہ اور سرمایہ کے ہاتھ میں ہتھیار کا کام دیتی ہیں۔ مذہب سے جنگ کرنا ہمارا فرض ہے یہی مادی اصولوں کی الف ب ہے۔"[2]

---

[1] مارکس نے یہ فقرہ ہیگل کے فلسفے پر تنقید کرتے ہوئے لکھا

[2] Engles Historical Materialism P. 115

Lenin On Religion ', H

[illegible] ایک اور مقام پر لکھتا ہے۔

"مارکسیت مادیت کا دوسرا نام ہے اور اس اعتبار سے یہ مذہب کی کٹر دشمن ہے مارکسیت کی اساس یہ ہے کہ انسان کو مذہب سے لڑنا چاہئے مگر مارکسیت چھوٹی موٹی مادیت نہیں کہ صرف الف ب پڑھا کر بیٹھ جائے یہ اس سے آگے قدم بڑھاتی ہے اور کہتی ہے کہ مادیت کو مذہب کے خلاف لڑنا ہی نہیں اپنے آپ کو اس لڑائی کا اہل بھی بنانا ہے۔"[1]

ایک اور موقع پر کہتا ہے:

"مذہب کے خلاف ہماری جنگ محض عقائد کی تبلیغ تک محدود نہیں رہنی چاہئے۔ اس جنگ کا محنت کش طبقات کی تحریک کے ساتھ مربوط ہونا ضروری ہے تبھی اس کا مقصد مذہب کا قلع قمع ہونا چاہئے۔"[2]

[illegible] ایک اور موقع پر کہتا ہے:

"مذہب ایک روحانی لوٹ کھسوٹ کا طریقہ ہے جو ہر جگہ لوگوں پر ایک بھاری بوجھ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان لوگوں پر جو قبل ازیں دوسروں کی خاطر کام کرنے کے بوجھ سے دبے ہوئے ہیں اور جو محتاج ہیں اور کیسے ہی معلوم طبقے کی بے بسی انہیں آخرت پر یقین دلاتی ہے۔ وہ لوگ جو محنت شاقہ کرتے ہیں اور پھر بھی ان کی ضروریات کماحقہ پوری نہیں ہوتیں۔ انہیں مذہب یہ سکھاتا ہے کہ وہ تابعدار اور شکر گزار رہیں جب تک وہ اس دنیا میں ہیں اور آسمانی انعام پر اپنی امیدیں باندھ رکھیں اس کے برعکس جو دوسروں کی کمائی اڑاتے ہیں انہیں مذہب یہ سکھاتا ہے کہ جب تک وہ زمین پر خیرات کرتے رہیں اور اس طرح سے اپنا وجود بطور رحمدل بنے رہنے کے قائم رکھے گا یہ بہت ہی سستا طریقہ بتاتا ہے۔ اور بہایت ہی خفیف قیمت پر جنت کے ٹکٹ فروخت کر دیتا ہے۔"[3]

---

[1] Lenin On Religion, P. 21

[2] V I. Lenin on Religion, P. 17

toobaa-elibrary.blogspot.com

اس کے بعد وہ کہتا ہے :-

"سمجھ جائے گا وہ کارکن جسے طبقاتی اختلافات کا علم ہے اور جو فیکٹریوں میں کام کرنے کے تجربہ سے روشن بصیر ہو چکا ہے۔ وہ نہایت ہی نفرت سے مذہبی عقائد کو رد پھینکتا ہے جنت کی خوشیاں پادریوں اور سرمایہ داروں کے حوالے کرتا ہے اور وہ اپنے لئے یہاں اسی زمین پر اچھی زندگی پانے کی جدوجہد کرتا ہے۔"[1]

جمہوریت کی قدردانی اور انسانیت کی واقعی اور سب سے زیادہ بہی خواہی کی دعویدار نام نہاد یورپی روشن خیالی بھی ابتدائی دائرے میں مذہب کی مخالف ہے تاہم وہ اسے کم از کم فرد کا نجی اور شخصی معاملہ قرار دینے کو روا دار ہے اور اپنی ذات کی حد تک کوئی بھی سمت راہ متعین کرنے اور اس پر کاربند رہنے میں اس کو تقریباً آزاد سمجھتی ہے مگر یہ رجحان کو شخصی دائرے میں محصور رہنے پر بھی خوش نہیں وہ الحاد کے ہیرو پھیریں مدت کو محنت کشوں کا سب سے بڑا دشمن مقابل ٹھہرا کر ان کو اس سے خبردار ہونے کی تلقین کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

"جمہوریت کی جدوجہد میں غریب طبقہ کی بنیادی ضروریات میں سے ایک ضرورت یہ ہے کہ ضمیر آزاد ہو۔ مذہب ریاست سے الگ ہو جہاں تک ریاست کا تعلق ہے مذہب کو کسی شخص کا نجی معاملہ قرار دیا جائے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ غریب طبقہ صرف مذہب سے بے اعتنائی برتے بلکہ مذہب غریب طبقے کا نجی معاملہ بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ غریب طبقے کی سائنسی اور بنیادی نظریئے کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ مذہب کے خلاف ایک اقابل مفاہمت اور مسلسل نظریاتی جنگ کرے۔"[2]

اسی سلسلے میں مارکسزم کے "راسخ العقیدہ" اینگلز کا ایک بیان پڑھئے۔ وہ کہتا ہے کہ :-

"پرولتاری سوشلسٹ پارٹی کے لئے مذہب کوئی خانگی معاملہ نہیں ہماری پارٹی طبقہ وارانہ شعور رکھتی ہے۔ اور مزدوروں کی آزادی کے لئے جدوجہد کرتی ہے ایسی جماعت مذہبی اعتقادات کی پیدا کردہ جہالت سے غفلت نہیں برت سکتی ہماری پارٹی کا ایک بنیادی مقصد یہ بھی ہے کہ مزدوروں کی مذہبی فریب خوردگی

---

[1] V.I. Lenin on Religion P. 8.

[2] P. 9.

دور کی جائے۔"[1]

لینن کے بعد سٹالن کو سوشلسٹ دنیا میں تقریباً ۳۰ برس تک بلند ترین مقام حاصل رہا۔ وہ مذہب کے بارے میں سوشلزم اور کمیونسٹ پارٹی کا موقف مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کرتا ہے :-

"جہاں تک پارٹی کے نقطہ نظر کا تعلق ہے مذہب کے بارے میں اس کے لئے غیر جانبدارانہ موقف اختیار کرنا ممکن نہیں اس کا فرض ہے کہ وہ مذہب اور ہر طرح کی مذہبی خرافات کے خلاف پروپیگنڈہ کرے اس لئے کہ سوشلزم علم کو فعال قوت بناتا ہے جب کہ مذہبی خرافات علم کے منافی ہیں۔ بنابریں ہر مذہب علم کے متناقض ہے۔"[2]

سوویٹ روس کے انسائیکلوپیڈیا کا بیان ہے۔

"پارٹی کے منشور کی دفعہ ۱۳ میں کہا گیا ہے کہ پارٹی کے لئے یہی کافی نہیں کہ وہ مذہب کو ریاست سے اور مذہب کو تعلیم سے الگ کرنے کی قرارداد منظور کرے بلکہ اس پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ مذہبی اداروں کو نیست و نابود کر دینے کے لئے عملاً جدوجہد کرے۔"

سوقہ شناسی اور مصلحت بینی

بایں ہمہ کہ سوشلزم بلا استثنا تمام مذاہب کا جانی دشمن ہے۔ وہ مذہب دشمنی میں حکمت و مصلحت سے کام لینا نہیں بھولتا۔ وہ حالات کی مساعدت اور نامساعدت کا خیال رکھتا ہے۔ سازگار ماحول میں بھرپور وار کرتا ہے لیکن ناسازگار فضا میں نہ صرف اپنی عداوت کو چھپاتا ہے بلکہ خیر خواہی کا لبادہ اوڑھ کر دوستی کی پینگیں بڑھاتا ہے

اینگلز کے خیال کے مطابق

"مذہب کے خلاف علی الاعلان جنگ کرنا بے وقوفی ہے کیونکہ اس قسم کی جنگ کا اعلان مذہب کو زندہ کر دے گا اور فی الحقیقت اسے ختم ہونے سے بچا لے گا۔ مذہب ختم کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ مزدوروں کی تنظیم کی جائے۔ اور انہیں تعلیم دی جائے جس کا نتیجہ

---

[1] Engles : Historical Materialism, P. 113

[2] Stalin's Works (4th Edition) 1953. Vol. 13 P. 99 ;

[3] مقالہ :- کمیونسٹ اور مذہب، لیننگراڈ، ۱۹۳۷ء، کالم (۴۸)

toobaa-elibrary.blogspot.com

یہ ہرگز مذہب مر جائے گا۔"[1]

لینن کے اس قول کے باوجود کہ طبقاتی جنگ کے ساتھ ساتھ مذہب کے خلاف بھرپور جنگ بھی جاری رہنی چاہئے اور معاشرے کے اندر مذہب کی جڑوں کو اکھاڑ پھینکنے کی پوری کوشش کرنی چاہیئے،[2] وہ کبھی بھی مذہبی رواداری کا مظاہرہ بھی کرتا ہے۔ اس کی وجہ خود لینن کی اس قرارداد میں، جو اس کی لکھی ہے جو اپریل ۱۹۱۷ء میں کمیونسٹ پارٹی کی آٹھویں کانفرنس میں اس نے منظور کرائی تھی ترکستان، اور قوقاز کی اقلیتوں کے بارے میں عوام احتیاط کا پہلو برتنے کی نصیحت کرتے ہوئے قرار دیں لہٰذا کیں

"ہمیں انتظار کرنا چاہیئے یہاں تک کہ اقلیتی علاقوں کی تبدیلی مکمل اور پختہ ہو جائے اور عوام اور میانہ طبقہ کا بوجھ کند ذہنوں سے اتار پھینکیں۔ بیشک اس بوجھ سے وہ مستقبل میں نجات پائیں گے۔"[3]

مذہب پر بیمارانہ حملے چھوڑنا تو درکنار ضرورت کے وقت بعض سوشلسٹ پکے دیندار اور متدین بن جاتے ہیں اور دینداروں کے ساتھ دینی شعائر اور اعمال تک میں مشارکت کا بڑی باقاعدگی سے اہتمام کرتے ہیں۔ اس اشتراکی مصنف لکھتا ہے:

"سوویٹ ایشیا میں بے شمار مسلمان ایسے تھے جو اپنی ذاتی زندگی میں پکے اور سچے اعتقاد مسلمان تھے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ کمیونسٹ پارٹی کے رکن بھی تھے اور اشتراکی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں سرگرم حصہ لے رہے تھے۔"[4]

ایک اشتراکی سیاح نے جب اس بات پر تعجب کیا کہ بعض کمیونسٹ ابھی تک اسلامی شعار کے پابند ہیں تو مرکزی کمیونسٹ پارٹی کے نمائندے سوچک نے جسے تاجکستان بطور نگران بھیجا گیا تھا، جواب دیا:

"یہ بات ہمارے لئے ذرا بھی تشویشناک نہیں۔ مسلمان پسماندہ علاقوں میں ہمارا اولین مقصد یہ ہے کہ کیا کوئی شخص زمیندار سے زمین چھیننے کی مہم میں ہمارے ساتھ ہے۔ اجتماعی زراعت اور صنعتانے (Industrialization) کے سلسلے میں ہمارا

---

[1] V I Lenin On Religion, P 18 [2] طبع ماسکو لینن ایڈیشن ۱۹۵۲ء، جلد ۱۰ ص ۳۰۴

[3] ایضاً ایڈیشن ۱۹۵۰ء جلد ۲۹ ص ۵۱، بحوالہ اسکوئیتھ Wilfred Smith Religion in the U.S.S.R. P 21

ہاتھ بٹاتا ہے اور ہمارے لائحہ عمل کی خاطر لڑنے کو تیار ہے، اگر جواب اثبات میں ہو تو ہم سے پارٹی کی رکنیت کا اہل قرار دیتے ہیں۔ آپ کو یہ بات لازماً پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ عوام کو اپنے ساتھ لانے کے لئے ہمیں اپنے اندر لچک پیدا کرنی ہوگی۔ ہم پر ایک پورے معاشرے کی تعمیر نو کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ہم فرقہ پرستی کی علانیہ کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ہمارے ہاں پارٹی کی رکنیت کے لئے مارکس اور لینن کے مادہ پرستانہ افکار پر ایمان لانا شرط نہیں۔ تاہم جب کوئی مقامی شخص پارٹی میں آجاتا ہے تو اس میں ہماری تعلیم اور اس کے اثرات سے اثر پذیر ہونے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ وہ بتدریج ہمارے خیالات اپنا لیتا ہے۔ ہم ایک عبوری دور سے گزر رہے ہیں اس لئے اگر آپ کا سامنا عجیب رنگ کے کمیونسٹ سے ہوتا ہے تو فطری بات ہے۔"[5]

خدا کا انکار

لینن کہتا ہے

"عملی طور پر خدا کا تصور سرمایہ داروں کی مدد کرتا ہے تاکہ وہ لوگوں کو غلام بنائے رکھیں اور حقیقت خدا کے تصور کو حسین بنانے کا مقصد ان زنجیروں کو خوشنما بنانا ہوتا ہے جن سے سرمایہ دار جاہل مزدوروں اور کسانوں کو بیگار غلامی میں جکڑ کر رکھتے ہیں۔ خدا کے تصور نے ہمیشہ معاشرے کے احساسات کو دبایا ہے۔ چونکہ خدا کا تصور غلامی کا تصور ہے جو بدترین اور مایوس کن غلامی ہے اس لئے زندہ احساسات کی بجائے مردہ حسیتیں ہی لایا ہے۔ خدا کے تصور نے کبھی بھی ایک فرد کو معاشرے سے نہیں ملایا بلکہ اس نے ہمیشہ مظلوم طبقے کو ظالم طبقے کے تقدس کے ساتھ باندھ دیا ہے۔"[6]

---

[5] Down over Bukhara OP Cit. P. 242

[6] V.I. Lenin on Religion. P 43

toobaa-elibrary.blogspot.com

لینن کا قول ہے کہ ہر شوشلسٹ اصولی طور پر دہریہ ہوتا ہے[1]۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ:

"خدا کی ہستی کے مسئلے میں ہمارا کہنا یہ ہے کہ ہم خدا پر یقین نہیں رکھتے اور ہمیں یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ مذہبی پیشواؤں نے، جمیعت خداداں اور سرمایہ داروں نے خدا کا تصور پیدا کیا ہے تاکہ وہ بالور ہوتے کھسوٹنے والوں کے اپنے مفاد کا تحفظ کر سکیں"[2]

میکسم گورکی (MAXIM GORKY) نے ایک اخبار میں مضمون لکھا کہ

"خدا کی تلاش فی الحال بند کر دینی چاہیئے، یہ ایک بیکار مشغلہ ہے جہاں کسی چیز کے بارے میں سوال پیدا نہیں ہوتا، وہاں تلاش بے سود ہے جب تک کوئی چیز بوجھی نہ جائے کا شنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ تم نے ابھی تک کوئی خدا بنایا ہی نہیں ہے خداؤں کو تلاش نہیں کیا جاتا۔ خدا بنائے جاتے ہیں۔ تم زندگی کی تشکیل نہیں تخلیق کرتے ہو"[3]

یہ مضمون جب لینن کی نظر سے گزرا تو وہ سخت برہم ہوا اور صاحب مضمون کو لکھا

"تم خدا کی تلاش کے مخالف ہو صرف اس لئے کہ اس کے بجائے خدا بنانا چاہتے ہو۔ خدا کی تلاش یا خدا کے بنانے کا کام ایک ہی چیز ہے اور ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے جیسا کہ ایک شیطان دوسرے شیطان سے مختلف نہیں ہوتا۔ خدا کی پوجا مردے کی پوجا (Necrophilia) سے چاہے وہ جس قدر لطیف انداز اور روحانی ہو"[4]

پھر آگے چل کر اس نے لکھا:

خدا کا تصور ایک شرمناک مندی بیماری ہے۔ لاکھوں طبعی گناہوں، مذموم حرکتوں اور تشدد کے افعال کو بوگ معلوم کر سکتے ہیں اس لئے وہ زیادہ خطرناک نہیں ہوتے بہ نسبت ایک نازک اور روحانی خدا کے تصور کے جسے ایک دلکش نظریاتی لبادہ پہنا دیا جاتا ہے۔ ایک کیتھولک پادری جو نوجوان لڑکیوں کی عصمت دری کرتا ہے وہ کم خطرناک ہے بہ نسبت اس بورژوائی کے پادری کے جو خدا کے تصور کا پرچار کرتا ہے"[5]

---

[1] V.I. Lenin on Religion, P. 8

[2] V.I. Lenin Selected Works V 6 P. 46

[3] V.I. Lenin on Religion P. 36 [4] V.I. Lenin on Religion, P. 37

۱۹۲۶ء کے آس پاس زمانے میں ایک جرمن نومسلم محمد اسد ایک صحافی کی حیثیت سے سوویٹ یونین کا دورہ کر رہے تھے۔ اپنی کتاب (THE ROAD TO MECCA) میں اس دورے کے مشاہدات و تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سوویٹ روس کے بارے میں میرا سب سے پہلا اور دیرپا تاثر وہ ہے جو ماسکو کے ریلوے سٹیشن پر میرے ذہن میں مرتسم ہوا۔ یہ ایک بہت بڑا پوسٹر تھا جس میں مزدوروں کے یونیفارم میں ایک نوجوان کی تصویر تھی۔ نوجوان ایک سفید ریش اور عجائبات میں ملبوس شخص کو (جسے برائی اور آسمان سے نکلتے دکھایا گیا تھا) ٹھوکریں مار رہا تھا۔ اس تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا: "سوویٹ یونین کے مزدوروں نے اسی طرح خدا کو اس کی بلندی سے اتار پھینکا ہے"۔ یہ اشتہار سوویٹ یونین کی لادینی انجمن کی طرف سے لگایا گیا تھا"[1]

اس طرح کے اشتہارات (اعلانات جو حکومت کی اجازت کے بعد چھپ سکتے ہیں، ہر جگہ نظر آتے تھے۔ پبلک مقامات پر اسٹرکوں پر چرچوں کو بند اوقات عبادت گاہوں سے متصل چسپاں رہتے تھے۔ ترکستان میں مسجدیں زیادہ ہیں، وہ نہیں کے ساتھ یہ اشتہار نہیں ہوتی۔ نوٹ کر چہ باقاعدہ منظور نہیں تھی لیکن لوگوں کو اس سے باز رکھنے کے لئے حکومت ہر ممکن تدبیر عمل میں لاتی تھی۔ بخارا اور تاشقند میں لوگوں نے مجھے بتایا کہ خفیہ پولیس کے آدمی مسجد میں آنے والے ہر شخص کا نام بلیک لسٹ میں لکھتے ہیں"[2]

مارچ ۱۹۲۸ء میں جب اس نے پہلی مرتبہ اپنا معمولی سا رہائشی مکان چھوڑا تھا تو خود شیخ نے بیان دیا تھا، "ہمیں آسمان کے اوپر کہیں خدا کا سراغ نہیں ملا۔" خود شیخ کے اس الحاد کی مزید فضاحت سوویٹ سائنسز اکیڈمی کے چیف ایڈیٹر نے ماسکو ریڈیو سے ایک تقریر نشر کرتے ہوئے کی۔ مصر کی نامور دینی یونیورسٹی کے آرگن مجلہ "الازہر" کے مرحوم ایڈیٹر احمد حسن زیات نے "سرخ الحاد" کے عنوان سے اپنے مقالہ میں ماسکو ریڈیو کے حوالے سے دیگر باتوں کے سوویٹ سائنسز کے چیف ایڈیٹر کے الفاظ حرف بحرف نقل کئے ہیں ان کا اردو ترجمہ یہ ہے:-

---

[1] THE ROAD TO MECCA P. 199

[2] THE ROAD TO MECCA P. 199

toobaa-elibrary.blogspot.com

اسلام کے خلاف معاندانہ مہم

لینن کی بن یاہی بیوی کرپسکایا اپنی تصنیف (Memories of Lenin) ... کے صفحہ ۳ پر لکھتی ہے لینن کا جیسا تھا کہ کوئی مذہب جس قدر خلامانہ ذہنیت اور فضول رسوم سے پاک ہوگا اسی قدر وہ عوام کے حق میں مہلک اور خطرناک ہوگا۔ اس لئے کہ اچھے مذاہب کے اثبات عوام پر بہت زیادہ گہرے ہوتے ہیں لینن کے اس خیال کے تحت مجموعہ مذاہب بالخصوص اسلام کے خلاف ان کا انتہائی سخت اور معاندانہ رویہ قابل فہم ہو جاتا ہے۔ مذاہب میں اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو انسان کو ایسی حریت کا درس دیتا ہے جس سے یہ مادی اور دنیاوی شادمانی بھی حاصل ہوتا۔ علاوہ ازیں وہ فضول رسوم سے یکسر پاک ہے اس کے دامن میں عالمگیریت اور سکون و اطمینان کی بے دریغ دولت پنہاں ہے اس کی کشش لوگوں کو کشاں کشاں اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور جو کوئی بھی حلاوت ایمانی کی لذت کو پا لیتا ہے اسلام سے ناقابل انقطاع وابستگی اختیار کر لیتا ہے۔

سیونسٹ اسلام کی اخلاقی و روحانی تاثیر کو ختم کرنے کے لئے اس پر مسلسل سوقیانہ حملے کرتے رہتے ہیں اور اس کو بدنام کرنے کے لئے کسی قسم کی دروغ بافی سے نہیں چوکتے۔ انہوں نے مسلمانوں پر اپنا جو اسلط قائم کرنے کے بعد اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کی مہم شروع کر دی۔ وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کی ساری قوت کا سرچشمہ ان کے اسلامی افکار و عقائد ہیں۔ ضروری ہے کہ انہیں اس سرچشمے سے محروم کر دیا جائے۔ اگست ۱۹۲۲ء میں سوویٹ کمیونسٹ پارٹی نے بارہویں اجلاس میں مذہب دشمن پروپیگنڈہ وسیع اور منظم بنیادوں پر شروع کرنے کی قرارداد منظور کی۔ اس حکم پر عمل پیرا ہو کر کمیونسٹ پارٹی، اسکولوں کے اساتذہ اور کمسومول (نوجوانوں کی کمیونسٹ تحریک) کے لاکھوں نے بڑے منظم طریقے سے اسلام کے خلاف اپنا کام شروع کر دیا۔ ۱۹۲۵ء میں سوشلسٹ روس میں جمعیت مجاہدین الحاد (Union of Godless Zealots) قائم کی گئی[1] مسلمان ملکوں میں اللہ سیزلر، دین سیزلر اور خدا سیزلر کے ناموں سے اس کی شاخیں وجود میں آگئیں اور رفتہ رفتہ اس کے ممبران کی تعداد بڑھنے لگی۔ سارے ملک میں اشاعت و ترویج الحاد کی ایک زبردست مہم جاری ہوئی

---

[1] Julius F. Hecker Religion under the Soviet, P. 93

رہنما کا مصنوعی سیارہ جو حال ہی میں خلا میں چھوڑا گیا ہے اور جو ایسے نازک آلات سے لیس ہے جن میں دیکھنے سننے اور جائزہ لینے کی پوری طاقت موجود ہے اس نے جو خبریں بھیجی ہیں ان میں کوئی ایسی خبر نہیں ہے جس سے مختلف مذہبوں کے اس دعوے کا ثبوت ملا ہو کہ آسمان پر کوئی برتر بادشاہ موجود ہے جو تخت خدائی پر براجمان ہو اور اس کے ارد گرد فرشتے گھیرا باندھے کھڑے ہوں اور اس کے آستانوں کا پیغمبر طواف کر رہے ہوں۔ اور اس کے گوشوں میں جنت اور دوزخ بپا ہوں اور اس کی عدالت سے قضا و قدر کے فیصلے صادر ہو رہے ہوں گویا یہ تصورات محض وہم تھے اور جہالت نے لوگوں کی عقلوں کے اندر اتار رکھے ہیں۔ یا یہ ایک ڈھکوسلا ہیں جسے دنیاوی اقتدار کے حریص بطور حربہ استعمال کرتے ہیں[1]

جمہوریہ کارا کے ایک سابق ملا عباس جمعہ ملا کا مضمون تاشقند کے ایک اخبار میں شائع ہوا جس کا مرکزی خیال تھا: "میں نے اسلام کیوں چھوڑا" یہ مضمون کمیونسٹ دیدہ دلیری کا شاہکار تھا اس کے آخر میں ملا مذکور نے لکھا

"خدا کا کوئی وجود نہیں ہے، ابتدا استحصال پسندوں کے لئے اس کا وجود ضروری ہے"[2]

مذہب اور خدا کے بارے میں کارل مارکس، لینن، سٹالن اور خروشچیف کا جو موقف رہا ہے۔ کمیونسٹ لٹریچر اور وہی تعلیم کاروں کی زبان جو تازہ تحریرات سے برابر اس کا اعادہ کیا جا رہا ہے۔ کریمیر کے کمیونسٹ نیتا سیمیونوف کا ایک مضمون کریمیر سچی کے ایک اخبار میں ۱۷ اپریل ۱۹۶۰ء کو شائع ہوا جس میں مضمون نگار نے خدا پر ایمان کو محض ایک دھوکہ قرار دیا۔

"خدا پر ایمان اور پر مسرت زندگی کا آپس میں کوئی میل نہیں ہے اس لئے خدا پر ایمان نہ لاؤ۔ خدا کا کوئی وجود نہیں یہ محض ایک دھوکہ ہے اس واہمہ کو خیرباد کہو اور نئی پر مسرت زندگی تعمیر کرنے والے باشعور لوگوں کی صف میں شامل ہو جاؤ"[3]

باکو کے جریدہ "کمسکی رابوچی" ۱۲ اکتوبر ۱۹۵۹ء میں ایک مضمون نگار نے لکھا۔

"ایک خدا کا تصور ظالم بادشاہوں کے ہاتھ میں مضبوط ہتھیار دے دیتا ہے اگر مشرق میں کوئی بادشاہ نہیں ہوتا تو ایک خدا بھی نہیں ہو سکتا"[4]

---

[1] مجلہ الازہر قاہرہ شمارہ اپریل ۱۹۶۰ء [2] پراودا اوستکا ۱۲ جولائی ۱۹۵۹ء بحوالہ اسلام ص ۱۳۵
[3] نوستر کا تاشقند ۱۷ جولائی ۱۹۵۹ء بحوالہ اسلام ص ۱۳۵ [4] ایضاً

toobaa-elibrary.blogspot.com

مرد، عورتیں، بچے، طلباء، فوجی اور غیر فوجی کوئی طبقہ بھی اس سے محفوظ نہ رہا۔ تاہم مذہب کی گرفت ذہنوں پر بڑی مضبوط تھی۔ اس ہم کو وسیع تر اور شدید تر کرنے کے لئے ۱۹۲۹ء میں ایک اور عظیم الشان کانفرنس منعقد ہوئی جس میں گذشتہ کارکردگی کا جائزہ لیا گیا اور آئندہ کے لئے پالیسی مرتب کی گئی۔ اس وقت میں جمعیت مجاہدین الحاد کا نام بدل کر جمعیت ملحد مبارزین

[illegible]sion of Militant Atheists)

رکھ دیا گیا کانفرنس کے اندازے کے مطابق گذشتہ سات برس میں ملک کے طول و عرض میں جمعیت ملحدین کی ۹ ہزار شاخیں قائم ہو چکی تھیں۔ اب مذہب دشمن پروپیگنڈہ کو شدید تر کر دینے کا فیصلہ ہوا۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء تک اس تحریک کی ستر ہزار شاخیں کام کر رہی تھیں۔ اور باقاعدہ چندہ دینے والے ارکان کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی تھی[1]

۱۹۳۶ء میں ہفت روزہ کیمونسٹ ازبکستان نے ایک طویل مقالہ افتتاحیہ لکھا۔ اور اسلام، اسلامی تہذیب ثقافت اور ملی اور قومی روایات کے خلاف وسیع پیمانے پر پروپیگنڈہ کرنے کی شدید ضرورت پر زور دیا۔ چنانچہ شہر شہر اور گاؤں گاؤں میں پروپیگنڈے کا ایک نیا طوفان برپا ہوا۔ جمعیت ملحد مبارزین کی شاخیں مسلمانوں کے دل و دماغ میں اسلامی تعلیمات کے خلاف فکری اور نظریاتی زہر بھرنے لگیں ان ملحد سوسائٹیوں کے ارکان گوناگون مواقع سے تو فائدے جاتے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان میں شریک ہوں ان کے اجلاسوں میں مقالے پڑھے جاتے اور مذاکرات ہوتے پھر ان مقالات اور مذاکرات کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی جاتی۔ اس ہم کی وسعت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے۔ کہ ۱۹۴۰ء میں پراودا نے لکھا دی کہ صرف ترکستان میں اس سوسائٹی کی بارہ سو شاخیں تھیں ۱۹۳۹ء میں ان شاخوں کے اجلاسوں کی ۱۵ ہزار رپورٹیں پڑھی گئیں۔ اور مذہب دشمن موضوعات پر ایک لاکھ سے زائد مذاکرات ہوئے[2]

دوسری جنگ عظیم کے بعد یہ مذہب دشمن پروپیگنڈہ اور شدت اختیار کر گیا۔ کیمونسٹ پارٹی کی خاص کمیٹی برائے عقائد نے ایک قرارداد منظور کی جس میں متوسط طبقے کے عقائد، سیاسی شعور اور اصولوں کے فقدان کے خلاف بڑی شدت سے جنگ چھیڑنے کی ہدایت کی گئی[3] چنانچہ یہ مہم کیمونسٹ پارٹی کی عملہ

---

[1] Soviet Communism, OP Cit. P 811 [2] پراودا ۱۹۴۰ء بحوالہ بالاسلام ص ۴۴

[3] Smirnow History of Islamic Stydies in U.S.S.R P 248

عہدیداروں اور کسومول کے سپرد کر دی گئی۔ ۱۹۴۷ء میں جمعیت برائے نشر و اشاعت سیاسی و علمی کے نام سے ایک اور تنظیم کی بنیاد رکھی گئی جس کا مقصد دعوت الحاد کو نئی زندگی بخشنا تھا۔ ترکستانی جمہوریتوں کے صدر مقام صوبوں اور اضلاع میں اس کی شاخیں قائم کر دی گئیں باقاعدہ، جدید اور جدید ترین تکنیک سے لیکچر دیئے گئے۔ اس سلسلے میں تمام وسائل تحریر، تقریر، ریڈیو اور سینما سے کام لیا گیا[1] ۱۹۴۹ء میں تاشقند میں مذہب دشمنوں کے لئے جدید عجائب گھر قائم کیا گیا[2] اسی سال کرغیزیا میں ۳۱ ہزار لیکچر اور چار ہزار اجلاس ہوئے[3] ۱۹۵۱ء میں ازبکستان میں ۱۰ ہزار اجتماعات ہوئے جس میں دین کے خلاف تقریریں کی گئیں۔ لیکن پروپیگنڈے کی یہ وسعت بھی کیمونسٹ حکمرانوں کے لئے اطمینان بخش نہ تھی، اخبارات نے اسے ناکافی قرار دیا۔ اور لکھا کہ عام لوگ بدستور دینی شعائر پر کاربند ہیں[4] ترکمانستان میں ۱۹۵۴ء کے دوران آٹھ ماہ میں تیرہ سو تقریریں ہوئیں جن میں سے سات سو تقریروں میں اسلام پر شدید حملے کئے گئے[5]

۱۹۵۴ء میں تاشقند میں ازبکی مصنفین کے مقالات کا مجموعہ شائع ہوا۔ اس کا عنوان تھا "خرافاتی معرفت کے خرافات سے معرفت تک" اس پر روسی اخبارات نے بڑے لمبے چوڑے تبصرے کئے اور تحسین و فرائے[6] برسائے[7] کیمونسٹ ازبکستان نے ۲۴ ستمبر ۱۹۵۶ء کی شمارت میں لکھا کہ گذشتہ چند سالوں کے دوران صرف ازبکستان میں مذہب کے خلاف ۴۰ ہزار کتابیں اور کتابچے شائع ہوئے ان میں اکثر کتابیں روسی کتابوں کے تراجم تھیں۔ جریدہ مذکور نے آخر میں یہ رائے ظاہر کی کہ یہ تعداد ناکافی ہے۔ اور ضرورت ہے کہ اس قسم کی کتابیں مزید شائع کی جائیں[8]

ازبکی اخبارات نے یہ مہم ۱۹۵۷ء میں بھی جاری رکھی۔ متعدد مقامات کی ازبکی درسگاہوں کے اساتذہ سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ جس مضمون کی تعلیم بھی دیں اس میں ملحدانہ فکر اور پروپیگنڈے کو بنیادی اہمیت دیں اور طلبہ کو اسلام کے غلط تصورات سے آگاہ کریں[9] جن اخبارات نے اس مہم میں کچھ زیادہ سرگرمی کا اظہار کیا

---

[1] بالاسلام ص ۵۴ [2] سوویت لٹریچر کبر کبر ۱۹۵۱ء فروری ۱۹۵۰ء بحوالہ بالاسلام ص ۵۴

[3] کیمونسٹ ازبکستان ۱۸ مارچ ۱۹۵۲ء، تاشقند بحوالہ بالاسلام ص ۵۴ [4] شرق لٹریچر (ستارہ مشرق) جلد ۳ ۱۹۵۲ء ص ۱۲۹ تا ۱۳۲ بحوالہ بالاسلام ص ۵۸ [5] شرق لٹریچر جلد ۷ ۱۹۵۸ء ص ۱۰۸ تا تاشقند بحوالہ بالاسلام ص ۵۸ [6] جریدہ اوکیومیشلا چاریتا سی (جریدہ اساتذہ) ۱۷ مارچ ۱۹۵۷ء تاشقند۔ (بحوالہ رحمان خان نومیں)

toobaa-elibrary.blogspot.com

ان پر سخت نکتہ چینی کی گئی۔ اور انہیں مسلمانوں میں دینی جذبات کی بقا کا ذمہ دار قرار دیا گیا۔ ترکمان کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے ترجمان (کمیونسٹ ترکمانستانیا) نے کونسوموولیٹس ترکمانستانیا" پر تنقید کرتے ہوئے لکھا:-

"اس نے سائنٹیفک، الحادی تعلیم کی تبلیغ و اشاعت میں غفلت برتی ہے یہی وجہ ہے کہ خزان اور بنیست ڈاغ کی درسگاہوں کے طلبہ پر بھی تک اہل ایمان کا اثر ہے۔ اور وہ دینی فرائض کی ادائیگی کے لئے عبادت گاہوں میں جاتے ہیں"[1]

ترکمان کمیونسٹ پارٹی کے اول سکریٹری بابائیف نے فروری ۱۹۵۰ء میں لکھا

"مذہب دشمن پروپیگنڈہ کرنے والوں کا فرض ہے کہ وہ پارٹی کی ذیلی تنظیموں کو اس کام پر ہمیشہ لگائے رہیں جمہوریہ کے کارکنوں میں دینی زندگی کے بقیہ آثار تک بہایت قوت دیں اور علماء مذہب کی افیون پھیلانے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے (حقیقت مذہب دشمن پروپیگنڈہ فروعت کے مطابق نہیں ہوا۔ اور یہ اس کوتاہی کا نتیجہ ہے کہ سوویٹ درسگاہوں میں تعلیم پانے والے بعض نوجوان اسلامی مدارس میں چلے گئے ہیں"[2]

جنوری ۱۹۵۰ء میں ترکمان کمیونسٹ پارٹی کی چودھویں کانفرنس نے باقاعدہ ایک قرارداد منظور کی جس میں ملک کے اندر محدود پروپیگنڈے کو مزید وسعت دینے کی ہدایت کی گئی[3] بریدہ پیادو فوستو کانے ۱۰ دسمبر ۱۹۵۷ء کی اشاعت میں سائنٹیفک الحاد کے داعیوں کو تلقین کی کہ وہ دینی تحریکوں پر ہمہ گیر اور بھرپور حملہ کریں۔ اس سلسلے میں اس نے تاشقند کی مثال دی جہاں صرف ایک مہینے (جولائی ۱۹۵۷ء) اسلام کے خلاف پندرہ سو تقریریں ہوئیں[4] جنوری ۱۹۵۵ء سے اگست ۱۹۵۸ء تک کے عرصے میں ۴۲ لاکھ کی تعداد میں روس کے مختلف مسلمان علاقوں میں شائع ہوئیں[5]

---

[1] بحوالہ بالا اسلام ص ۵۹ [2] ترکمانیا اسکرا، ۲۰ فروری ۱۹۵۰ء عشقاباد۔ بحوالہ بالا اسلام ص ۵۹

[3] " " " " " "

[4] " " " " " "

[5] Islam in the Soviet Union OP Cit P 177

۱۹۴۰ء کے بعد ملحدانہ پروپیگنڈے میں دوتیزی آگئی جنوری ۱۹۶۷ء سے دسمبر ۱۹۶۲ء تک ۲۱۰ مذہب دشمن کتابیں اور پمفلٹ شائع کئے گئے جن میں خاص طور پر مسلمانوں کو مخاطب کیا گیا تھا۔ ان میں سے ۴۷ ازبکستان کی مختلف زبانوں میں۔ ۲۶ ازبک زبان میں ۱۵ افغانی میں۔ ۱۴ آذری میں۔ ۱۲ تاجک میں۔ ۹ قازاق زبان میں۔ ۸ کرغیز میں۔ ۷ ترکمان میں۔ ۴ باشکیر میں۔ ۲ دو دو کبردا اور شیشان میں۔ اور ایک ایک جیز۔ کاراکل پاک۔ کرمشی اور نوگے میں۔ ۷۰۰ کتابیں روسی زبان میں شائع کی گئیں جن کے مخاطب غیر مسلم تھے۔ ان میں سے ۱۲۷ ازبکستان میں شائع ہوئیں[1]

اسلام کے خلاف یہ مہم ابھی تک جاری ہے۔ نے اپنی فروری (Nauka i Religiya)

۱۹۶۷ء کی اشاعت میں اطلاع دی کہ شمال مغربی قوقاز کے گاؤں خبز میں مذہبی عبادات اور قدیم رسوم کا قلع قمع کرنے کے لئے چودھریوں کی ایک مجلس قائم کی گئی ہے۔ یہ رسوم اس پرانے گاؤں کی نئی شاندار اور بامقصد زندگی کے مقابلے میں نمایاں طور پر الگ نظر آتی ہیں۔ یہ مجلس مقامی کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری کی ہدایت پر قائم کی گئی۔

ماسکو لٹریری گزٹ نے ۱۱ فروری ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں خبر دی کہ سوویٹ ترکمانستان کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے ترکمان آبادی میں مذہب دشمن کتابیں بکثرت پھیلانے پر زور دیا ہے۔ مرکزی کمیٹی نے الزام عائد کیا کہ پرانے دنوں کی میراث نہ صرف آبادی کے پسماندہ حلقوں میں گہری جڑیں رکھتی ہے بلکہ ان لوگوں میں بھی جو کام اپنے مناصب کے پیش نظر دوسرے لوگوں کو تعلیم دیتا ہے۔

مسلمانوں کو اسلام سے بیزار کرنے اور ان کے یقین و ایمان کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے ذہنوں میں کس نوعیت کی زہر نشانی کی گئی۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:-

ازبک اکاڈمی آف سائنسز کا ایک رکن اے زامدوف اپنے ایک مضمون (The Historical Past of the Uzbek People and Marksist Leninist Culture) میں لکھتا ہے

"اپنے معاشرتی اور تہذیبی پہلو میں اسلام دنیا کے انتہائی رجعت پسند مذاہب میں سے

toobaa-elibrary.blogspot.com

یک ہے اس نے یہ تبلیغ کی کہ مسلمان تقدیر پر اور اپنے پچھلے حالے کے آگے غیر مشروط طور پر سر جھکا دے ہر اصلاح کی راہ میں رکاوٹ ڈالی اور ترکستان کے ارتقاء کو روکا۔[1]

جعفر عباسوف باتوف نے ۱۷ جولائی ۱۹۵۰ء کو باکو میں آذربائیجان کمیونسٹ پارٹی کے زیر اہتمام تعلیم یافتہ طبقے کے ایک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"اسلام مجلد غیر مسلموں کے ساتھ انتہائی عصبیت کا جذبہ رکھتا ہے شروع ہی سے اس کے حکمرانوں نے مذہب کی آڑ میں اپنی سلطنت کو وسعت دینے اور دوسری اقوام کو محکوم بنانے کے لئے تلوار اٹھائی۔ ملک گیری کی یہ جنگ "جہاد فی سبیل اللہ" اور غیر مسلم اقوام میں دین حق کی تبلیغ کے نام پر لڑی گئی۔ دوسرے مذاہب کی طرح مسلمانوں نے بھی اپنے پیروؤں کو تقدیر پرستی اور ظالم حکمرانوں کے سامنے سر تسلیم خم کرنا سکھایا۔ لفظ اسلام کے معنی ہی تسلیم اور اطاعت کے ہیں۔ اور مسلم کے معنی ہیں تسلیم کرنے والا، اطاعت کرنے والا۔ ایسے حالات میں اسلام قبول کرنے والے طبقے بالخصوص رجعت پسند اور ملک گیر حکمرانوں کے ہتھ بہترین آلہ کار بن گئے۔"[2]

عشقاباد ریڈیو کے ۱۲ اگست ۱۹۵۴ء کے ایک نشریئے میں اسلامی تعلیمات و عبادات پر یوں کیچڑ اچھالی گئی:

"پسماندہ قوم ہی ان تعلیمات کی پیروی کرتی ہے جن کی دعوت اسلام دیتا ہے۔ ان رسوم کی پابندی سے کسانوں کے روزمرہ کاموں میں حرج واقع ہوتا ہے اور اجتماعی زراعت کے مفاد کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔"[3]

کمیونسٹ پارٹی کے اخبار پراودا نے ۲۱ اگست ۱۹۵۹ء کے شمارے میں لکھا۔

"اسلام استحصال پسندوں کی تخلیق ہے جو انہوں نے محنت کش عوام کو اپنا غلام اور جبر و تشدد کا شکار بنانے کے لئے وضع کیا تھا۔"[4]

---

[1] کمیونسٹ (ازبکستان) ۲۹ مارچ ۱۹۴۱ء بحوالہ

[2] بحوالہ چراغ راہ شمارہ نمبر ص ۲۹۰ [3] بحوالہ اسلام ص ۵۷ [4] ایضاً ص ۳۵ بحوالہ کمیونسٹ

ایک اور مصنف نے لکھا

"اسلام کا قرآن اور اس کی شریعت استحصال پسند گروہوں کی مدح و توصیف کرتی ہے مزدوروں پر ظلم و ستم اور سرمایہ دار طبقے کی فدمت گزاری کی دعوت دیتی ہے۔ اسلام نے ہمیشہ رجعت پسندانہ کردار ادا کیا ہے۔ وہ ترقی پسندی اور علم کا شدید دشمن ہے وہ اپنے متبعین پر جہالت اور غیراں کے صحیح انتقاد سے ناروا داری اور کفر کے مقابلے میں جہاد مقدس کو فرض قرار دیتا ہے۔"[1]

سوویٹ انسائیکلو پیڈیا کلاں جلد ۱۰ میں لفظ "اسلام" کے تحت مقالہ نگار لکھتا ہے۔

"دوسرے مذاہب کی طرح اسلام نے بھی مزدوروں کو روحانی طور پر کچلنے کے لئے استحصال پسند طبقات کے ہاتھ میں ایک رجعت پسندانہ ہتھیار کا کام دیا ہے۔ عیر ملکی سامراجی اسے مشرقی عوام کو غلام بنانے کے لئے استعمال کرتے رہے ہیں۔"[2]

پروفیسر کلیموش کی حیثیت سرکاری شارح اور ترجمان کی ہے۔ اُسے سوویٹ روس میں اسلام پر اتھارٹی سمجھا جاتا ہے۔ وہ اسلام کے متعلق لکھتا ہے:

"اسلام ایک غیر سائنسی رجعت پسند عالمی مذہب ہے جو لینن اور مارکس کے سائنسی نظریات سے کوئی مس نہیں رکھتا۔ اسلام رجعتی اور حیات انگیز نقطۂ نظر کا مخالف ہے سوویٹ عوام کے مفادات اس کے ذریعے کبھی حاصل نہیں ہو سکتے۔"[3]

۱۱ مارچ ۱۹۶۰ء کو آذربائیجان کی مذہب دشمن سوسائٹی کے ایک ممبر عبداللہ یف کا ایک مضمون [illegible] کے اخبار میں شائع ہوا جس میں اس نے لکھا ہے۔

"اسلام لوٹ مار اور ظلم و تشدد کو حق بجانب قرار دیتا ہے اور مسلمانوں میں ڈکیتی اور قزاقی کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔"[4]

---

[1] سوویٹ سسٹم کا ایجنٹ یا اور علمبر ۱۹۵۹ء بحوالہ اسلام ص ۳۵ [2] سوویٹ انسائیکلو پیڈیا کلاں جلد ۱۸

[3] (بحوالہ چراغ راہ شمارہ نمبر ص ۱۹۱)

[4] بحوالہ [illegible] کراچی ص ۱۲۴-۱۲۵

toobaa-elibrary.blogspot.com

اسلام اسلامی تہذیب و روایات کے خلاف یہ خونریز جنگ بڑی بے رحمی کے ساتھ جاری تھی کہ دوسری عالمگیر جنگ چھڑ گئی اور نازی جرمنی نے روس پر حملہ کر دیا۔ جرمن افواج طوفانی تیزی اور وحشت کے ساتھ روسی فوجوں کو شکست پر شکست دیتی چلی گئیں۔ کمیونسٹ روس کو جان کے لالے پڑ گئے۔ یورپی اور ایشیائی سپاہی مرغ فوج سے ٹوٹ ٹوٹ کر جرمن فوجوں سے جا ملے۔ بے شمار سپاہی لڑے بغیر ہی قیدی بن گئے۔ کمیونسٹ حکومت نے ایک بار پھر مکر و فریب سے کام لیا۔ بے چین محکوم اقوام کو مطمئن کرنے کے لئے متعدد اقدامات کئے۔ مذہبی آزادی کا اعلان کر دیا۔ علماء اور دوسرے مذہبی رہنما جو انسانی یادوں (...) میں قید تھے آزادیت اور قید و بند کی سختیوں کے باوجود زندہ بچ رہے تھے رہا کر دیئے گئے جو مسجدیں مسمار یا تعمیر کی اداروں میں تبدیل ہونے سے بچ گئی تھیں ان میں سے بعض دوبارہ کھول دیں بعض دینی شعائر اور عبادات سے پابندیاں اٹھا لیں۔ مسلمانوں کی دینی رہنمائی کے نام پر چار ادارے قائم کئے۔ اوران کے ذریعے مسلمان عوام کی تائید و حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لوگوں سے کہا گیا کہ وہ مسجدوں میں لیگ کی دعائیں مانگیں علماء کو مختلف جنگی محاذوں پر بھیجا گیا تاکہ وہ مسلمان سپاہیوں کو نازیوں سے لڑنے کے لئے ابھاریں۔

لیکن جونہی جنگ کا پانسہ پلٹا۔ کمیونسٹوں نے دوبارہ قبل از جنگ کے سب دروزکی طرح پلٹنا شروع کر دیا حتیٰ کہ جنگ ختم ہوتے ہوتے مذہب کے خلاف اہم اور سرفروشی قوت اختیار کر گئی۔

قرآن اور پیغمبر اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی

جمہوریہ کاز کے سابق ملا عباس عبداللہ نے اپنے مضمون "میں نے اسلام کیوں چھوڑا" میں قرآن اور پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلاف بایں الفاظ ہرزہ سرائی کی۔

"(نبی) محمد (علیہ السلام) ایک فریبی حکمراں تھے (معاذ اللہ نقل کفر کفر نہ باشد) اپنی شخصیت کو بلند کرنے، اور غلاموں کے آقاؤں کی خدمت کے لئے اس عہد کے تمام مذاہب خصوصاً مسیحی مذہب کی تعلیمات کو استعمال کیا۔ چنانچہ قرآن اور قوانین شریعت جن پر اسلام کا دارومدار ہے غلامی اور خواجگی کے قائل، معاشرتی نظام مساوات کے علیہ دار اور مسیحی ظلم و تعدی پر مبنی جنگوں کے حامی ہیں۔"[1]

---

[1] پیرو دانوستور کا ۳۱ جولائی ۱۹۵۹ء بحوالہ بالاسلام ص ۱۳۵

...یہ کلیہ وشم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں لکھتا ہے

"محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا وجود فی ایک مفروضہ ہے۔"[1]

...ہیل وہ یہودی کی کوڑی لایا ہے کہ وہ تمام مستشرقین جنہوں نے آپ کی سوانح حیات لکھی آپ کی وفات ...صدیوں بعد پیدا ہوئے۔ اور یہ ایک تاریخی مغالطہ ہے کہ ہر نبی کے لئے ایک بانی کا ہونا لازمی ہے۔

...ان کریم کے متعلق وہ اپنی کتاب (CONTENTS OF QURAN) میں لکھتا ہے

"قرآن خالصتاً استحصالی قوتوں (EXPLOITERS) کے مفاد میں منضبط ...تحریر میں لایا گیا تھا اور مظلوم (EXPLOITED) وہ تھے جو تابعداری اور ...تسلیم و رضا کی بنا پر تسکین قلب کے لئے مستقبل کی آسمانی زندگی پر یقین رکھتے تھے۔ ...وہ اس طرح قرآن کی مدد سے استحصال کرنے والوں کا آلہ کار بن کر رہ گیا۔"[2]

...سوویٹ انسائیکلو پیڈیا کا میں قرآن کریم کے متعلق لکھا ہے۔

"قرآن کو استحصال پسند طبقات اور رجعت پسند مسلمان علماء نے مظلوم و مجبور مزدوروں کو گمراہ کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔"

آذربائیجان کی مذہب دشمن سوسائٹی کے ممبر عبداللہ تریف نے اپنے مضمون میں مزید لکھا،

"قرآن پڑھنے والوں کو زندگی کا غلط نظریہ دیتا ہے اور انہیں سوسائٹی میں راحت و مسرت کی زندگی بسر کرنے کی کشمکش میں ناکام کر دیتا ہے۔"[3]

پاکستان کے کمیونسٹ اخبار نوائے وقت "بشمول ندائے ملت" نے اپنی ۱۹ اگست ۱۹۶۱ء کی اشاعت میں لکھا۔

"لندن ۱۵ اگست روس کے ضخیم انسائیکلو پیڈیا کے تازہ ایڈیشن میں قرآن مجید پر سوتیانہ حملے برقرار ہیں۔ اس مرتبہ صرف لب و لہجہ میں قدرے نرمی برتی گئی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ نادر الفطرت قانونی و مذہبی عقائد کا مجموعہ ہے اور اس میں

---

[1] بحوالہ چراغ راہ سوشلزم نمبر ص ۱۳۳

[2] ایضاً

[3] بحوالہ الفرقان کراچی اسلام دسمبر ۱۹۶۲ء ص ۱۳۴

toobaa-elibrary.blogspot.com

بہت کم حصّہ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے (مبارک) دور سے متعلق ہیں۔"

رڈس کے سرکاری ذریعے نے اسلام کے بارے میں لکھا ہے: "دوسرے مذاہب کی طرح اسلام نے بھی ہمیشہ رجعت پسندانہ کردار ادا کیا ہے۔" مثال کے طور پر عرب میں جو طبقاتی معاشرہ اسلام نے تشکیل دیا اس میں استیصال کو سماجی اور اقتصادی مساوات کی آڑ میں جائز ثابت کیا گیا۔ جدید اسلام کے بارے میں اس انسائیکلو پیڈیا میں ان الفاظ میں زہر افشانی کی گئی ہے:۔

"بعض مسلمان عذر خواہ اپنے نظریات کے ذریعے پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو غیر سماجی مصلح ثابت کرتے ہیں جس کا مقصد یہ ہے کہ اصل حقیقت پر پردہ ڈالا جائے۔"

شعائر اسلام کی بابت دریدہ دہنی

جریدہ ترکمنکایا اسکالر نے ترکمانی شعرا و ادب میں دین دشمنی کے افکار پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے ایک اداریئے میں لکھا:۔

"مشرق کے نام نہاد دانشوروں مثلاً شاعروں اور فلسفیوں نے اسلام کے تعصب اور کور مغزی پر سخت نکتہ چینی کی۔ شریعت انسان کو جن بھاری زنجیروں میں جکڑ دیتی ہے انہوں نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔"

اپنے اس قول کی شہادت میں اخبار مذکور نے ترکمانی شاعر مولا موں کی مندرجہ ذیل نظم شائع کی۔ جس میں اس نے رمضان کی مذمت کی تھی۔

"بیتے ہوئے زمانے میں قدیم اور پرانے زمانے میں۔ رمضان ملاؤں کے لئے بڑا مرغوب اور فیاض مہینہ تھا

اور اب دیکھتے ہو کسانوں پاس کے حقیقی معنی آشکارا ہو گئے ہیں وہ یہ کہ رمضان مسکاروں کی روٹی کا حیلہ تھا۔

اس مہینے میں ملا لوگوں کو نماز پڑھانے کے لئے پکارتا اور اللہ کے نام پر ان سے مال بٹورتا عوام کو لوٹنے کھسوٹنے والے لوگوں کے لئے رمضان گویان کے طعام کا مسالا تھا۔

اب اس میں ان کے لئے رغبت کا کوئی سامان نہیں رہا۔ ان کی جمعیت پراگندہ ہو گئی اور

لہ ترکمنکایا اسکالر۔ ستمبر ۱۹۵۶ء بحوالہ الاسلام ص ۵۶ تا ۵۸ مشرقی پاکستان (ستارہ مشرق) مورخہ ۷ ۱۹۵۸ء

ص ۲۷ تا ۲۸ بحوالہ الاسلام ص ۵۸ تا ۵۹ الاسلام ص ۱۳۵ حوالہ ماخوذ از "اسلام اور مسلمان قومیں"

رمضان ملاؤں اور سرمایہ داروں کے لئے آخری دست گدائی بن گیا۔"

اسی طرح ایک اور شاعر شائی کیکیلوف نے عید الاضحیٰ کی مذمت کی اس نے کہا:

"چند سال سے نہیں، قرن ہا قرن سے یہ عید ہمارے کندھوں پر بار عظیم بنی ہوئی تھی۔ اے بھائیو! میرے لئے اس پر صبر ممکن نہ تھا۔

اے عید قربان! تمہاری بات تو یہ ہے سن لی!!

سرمایہ دار اور ملاؤں نے غریبوں کو انہیں کھلانے کا سامان کیا تھا جس طرح مرغی کے بال و پر نوچے جاتے ہیں اسی طرح وہ غریبوں کے بال و پر نوچا کرتے۔ پھر اس عید منانے کا کیا فائدہ؟

آج ہمارا تجھ کو چاہنا ایسا ہی ہے جیسے ہم طاعون کی تمنا کرنے لگیں۔

اے عید قربان! چلی جا ہم سے دور ــــ دور ہو جا!"

۱۹۵۵ء میں سوویت کمیونسٹ پارٹی نے ہدایت جاری کی کہ مذہب کے خلاف پروپیگنڈے میں ذرا بھی غفلت نہ کی جائے۔ ازبکی شاعر جعفر جویلم نے اس ہدایت کی تعمیل میں ایک نظم کہی جو تاشقند کے اخبارت میں شائع ہوئی۔ شاعر نے کہا:۔

"روزے رکھنا چھوڑ دو۔

یہ فریضہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس لئے عائد کیا تھا کہ وہ عرب کے صحرا میں بھوک کا شکار تھے۔

محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا دین بھوکوں کا دین ہے۔

ترقی یافتہ ہاشم سیر اور جوان ازبکی عوام کا نہیں ہے۔"

عید بن کے متعلق معتقادوں کے ایک غیر نے مندرجہ ذیل گل افشانی کی۔

"یہ ماضی کی ناپسندیدہ باقیات اور مزدوروں کی صحت کے لئے مضر ہیں ان کا مقصد ہے کہ

toobaa-elibrary.blogspot.com

مردوں کو دجالوں (علماء) کے مکر و فریب میں پھانسا جائے۔ مزید برآں یہ تہوار انہیں اپنے کام سے غیر حاضر رکھتے اور ملک کی اقتصادیات کو نقصان پہنچاتے ہیں[1]۔"

ماسکو کے ایک اخبار نے روزہ کے مضر پہلوؤں پر درج ذیل تحقیق دیتے ہوئے لکھا۔

"دودھ پلانے والی عورتیں روزے رکھتی ہیں۔ تو دودھ کی کمی کی وجہ سے ان کے بچے مر جاتے ہیں۔ اسکول جانے والے بچوں کو ضعفِ جسمانی لاحق ہو جاتا ہے[2]۔"

چادر اور چار دیواری کی ہتک

ماں کی گود بچے کی دنیاوی زندگی کا اولین مرحلہ ہے۔ اس عمر میں اس کی روح فطرت بڑی صاف و شفاف اور بلا کی غیر شعوری انفعالی صلاحیت رکھتی ہے۔ آغوشِ مادر کے اس ابتدائی گہوارے میں اس کو حسن و خیر کی تعلیم و تربیت سے سابقہ پڑتا ہے اس کے اثرات اس کی ذہنیت پر پتھر کی لکیر کی طرح مرتسم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ انسانوں کی شخصیت اور سیرت و کردار کی تعمیر میں زیادہ تر حصہ اسی زمانے کے اندر پرورش کا ہوتا ہے روسی ماہرین نفسیات اور مزاج شناس بھی اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے چنانچہ انہوں نے اسلامی اذہان کو بدلنے کے لئے جہاں دوسرے بے شمار خارجی تدابیر اختیار کیں وہاں اس قریب داخلی تدبیر سے بھی غافل نہ رہے۔ کمرے سے مسلمانوں کے منشاء و مولد میں شترکی بے حیائی کی فضا پیدا کی جائے جس کی ہوا کھانے والا کوئی بھی مولود عفت نام کی کسی چیز سے آگاہ و شناسا نہ ہو

اس غرض کے لئے کمیونسٹوں نے چادر اور چار دیواری کے تقدس کو پامال کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے دنیا تو مسلمان عورتوں کو اسلام کی تعلیمات، اس کی تہذیبی اقدار اور معاشرتی روایات سے بیگانہ کرنے اور گھر کی چار دیواری سے باہر کھینچ لانے کے لئے بڑے محتاط اور بے ضرر طریقے اختیار کئے[3]۔ ہر شہر و قصبے میں کلب کھل گئے جن میں شرکت کے لئے عورتوں کو گوناگوں ترغیبات دی جانے لگیں[4]۔ پہلے

---

[1] ترکستان اسکارا ۲۵ جولائی ۱۹۵۹ء بحوالہ اسلام ص ۱۳۰ [2] سوویت کا یا روسیا ص ۱۳۰ ماسکو

[3] Dawn over Samarkand OP Cit. P. 288 بحوالہ اسلام ص ۱۳۸

[4] ص ۲۸۸ " " " "

یہاں عورتوں کے ذہین طبقے پر دام پھینکا لیکن مشکل چند تاتاری خواتین ہی ان کا شکار ہو سکیں۔ ان سے بالوس ہو
طبقے کی طرف رخ کیا[1] یہاں اخلاص بھی تھا اور جہالت بھی۔ کمیونسٹوں نے ان دونوں کمزوریوں سے
ھائی۔ ایک طرف انہیں اس دام تزویر میں پھنسا لیا کہ ہمیں ان کے مذہب، تہذیب اور روایات و رسوم سے
ہمدردی ہے۔ ہم تو صرف ان کی اقتصادی بہبود سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ دوسری طرف انہیں معاشی
میں مدد دینے کے لئے پارچہ بافی کی صنعت میں کام کرنے والی عورتوں کی اجرتوں میں اضافہ کروایا۔ انہیں اچھی روٹی
کی خوراک بچہ پیدا ہوتا تو سے کپڑے دیتے۔ عورتوں کی ایک بھاری تعداد اس دام فتن میں گرفتار ہو گئیں
کلب گھروں کی رونق بڑھنے لگی۔ ابتداء میں یہ کلب گھر نہایت بے ضرر اور معصومانہ تھے۔ پہلے انہیں موسیقی
اور ڈرامہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ بعض کلبوں میں عفت سوز مد و کا انتظام بھی تھا[2]۔ کلب گھر جانے کے لئے پردہ
وغیرہ کا بندوبست ضروری نہ تھا۔ مگر وہاں کی فضا اور ماحول ہی ایسا تھا کہ چند بار کی آمد و رفت کا نتیجہ لازماً بے
حجابی کی صورت میں نکلتا تھا۔

کمیونسٹوں کے یہ ہتھکنڈے آخر رنگ لائے عورتوں میں ان کی تحریک تیزی سے پھیلنے لگی اور پھر زیادہ
عرصہ نہ گزرا تھا کہ مسلمان گھروں میں بغاوت عام شروع ہو گئی۔ نوجوان عورتیں اور لڑکیاں گھروں سے بھاگ
کر کمیونسٹوں کی بنا کردہ اقامت گھروں میں پہنچنے لگیں۔ "سوویٹ ایشیا" کا مصنف E.S BAYES
مسلمان عورتوں کی بغاوت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"یہ ہولناک بیان ہے کہ ایک شخص کی بیوی ایک رات اچانک غائب ہو گئی۔ وہ اس کی تلاش
میں ادھر ادھر سرگرداں پھرتا رہا۔ آخر ایک ترکی قصبے میں، اسے آزاد عورتوں کے درمیان
ڈھونڈ نکالا۔ اس نے کام سے اپنی بیوی کو واپس گھر جانے کو کہا جواب مل گیا، چنانچہ اسے
بے نیل و مرام گھر جانا پڑا۔ راستے میں وہ ایک دوست کے ہاں شب بسری کے لئے
ٹھہرا۔ صبح ہوئی تو اس دوست کی بیوی بھی غائب تھی۔ دونوں نے عورت کا تعاقب کیا
اور قصبہ میں پہنچنے سے پہلے ہی اسے جا لیا اور وہیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیا[3]:
اس نوعیت کا شدید ردِ عمل اگرچہ کبھی کبھی رونما ہوتا، اکثریت بڑی بے بسی کے ساتھ اپنی

---

[1] حوالہ سابق ص ۱۲۹

toobaa-elibrary.blogspot.com

عورتوں اور بچیوں کو کمیونسٹوں کے دام فریب کا شکار ہوتے دیکھ رہی تھی۔ ان عورتوں کی تربیت کمیو
خطوط پر کی جاتی۔ تھوڑی ہی مدت میں ان کی کایا پلٹ جاتی حتیٰ کہ گھر والوں کے لئے ان کو پہچاننا مشکل ہو
جاتا۔ اور وہ سر پیٹ کر رہ جاتے۔ جوشوا کوشنز فوزیہ نامی ایک عورت کا ذکر کرتا ہے جو کمیونسٹوں
کے شکنجوں کا شکار ہو کر گھر سے بھاگ گئی تھی۔ ایک طویل مدت کے بعد اس کی عمر رسیدہ ماں کو جو
وہ کمیونسٹوں کے اقامت گھر میں پہنچی۔ اس کے ساتھ فوزیہ کا ایک بچہ بھی تھا۔ انہوں نے فوزیہ کو دیکھا تو

ابتدائی چند لمحے تو وہ دم بخود کھڑے اس کے فرنچ لباس اور زیبائش کو دیکھتے رہے۔ انہیں یقین
نہیں آ رہا تھا کہ وہ فوزیہ نہ تھی۔ واقعی فوزیہ اب عملاً ان کی سر رہی تھی۔ وہ تو اجنبی یا کافر عورت
نظر آ رہی تھی۔ وہ دونوں رو پڑے۔ فوزیہ لپک کر ان کے گلے لپٹ گئی۔ انہیں چوما
تسلی دی اور خوش خبری دی۔ تب جا کر وہ چپ ہوئے رفتہ رفتہ اس کی اجنبی وضع قطع
سے ان کی نگاہیں سنسنا سا جو گئیں اب انہیں یقین کہ وہ فوزیہ ہی ہے۔ ان کی اپنی فوزیہ
جو سارے گھرانے کے نزدیک مر کھپ چکی تھی۔[1]

پھر ماؤں کی ماں جذبات کی گہرائیوں سے ابھری اور چلائی آہ۔ فوزیہ یہ تم نے کیا کیا؟
مجھے ہر بچے مسلمان کی نظریں رسوا کر دیا۔ ہر شخص مجھ پر انگشت نمائی کرے گا۔ اب میں
کسی سے آنکھیں چار نہ کر سکوں گی۔ حشر کے وقت کوئی میری مدد کو نہ آئے گا
کاش میں اپنی زندگی کی تباہی سے پہلے ہی مر جاتی۔[2]

طلب گار اور عصمت گھروں کی رونق جیسے جیسے بڑھتی گئی۔ کمیونسٹوں کے مقاصد بے نقاب ہوتے
گئے۔ اب گاہے گاہے پرانے خلاف نعرے بھی سنائی دینے لگے۔ ملا تیس کی کچھ مدت پہلے تو صیف کی
جانے لگی تھی۔ ان آزاد بے پردہ عورتوں کی نفرت اور جذبات حقارت کا ہدف بن چکا تھا۔ "پردہ آباد باد"
اور "ملا مردہ باد" کے نعرے کلب گھروں ہی میں نہیں جلوسوں کی صورت میں گلی کوچوں میں بھی لگ رہے تھے۔
اب کلب گھروں کا ماحول اور مشاغل بھی بدل چکے تھے۔ مسلمان خواتین کو نظامت کی تربیت دی جا رہی تھی۔
اسور خانہ داری کی جگہ رقص رنگ کی مخلوط محفلوں اور کھیل تماشوں نے لی تھی۔ لباس بے حد کم کیے اور بہت

---

[1] [2] حوالہ سابق ص ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۰

سکو اور دوسرے جدید شہروں کا چپہ چپہ بھی کر دیا جاتا۔ مرد و زن کے اس آزادانہ اختلاط اور رنگ رلیوں
صد سے نگاہ و دل کی عفت، اخلاق و کردار کی پاکیزگی اور شرم و حیا کا جنازہ نکال دیا۔ کمیونسٹ آزادی
ر مسلمان عورتوں کی عصمت سے کھیل رہے تھے۔ وہ عورتیں جو کل تک پاکیزہ اور شریفانہ زندگی
گزار رہی تھیں اور جن کی طرف کوئی شخص میلی آنکھ سے دیکھ سکتا تھا۔ اب نہایت بے حسی کے ساتھ کمیونسٹو
ہوس کاریوں کا تختۂ مشق بنی جا رہی تھیں۔ ایک مسلمان کمیونسٹ عورت ہی کے الفاظ میں

"وہ روسی افسر جو ہماری عورتوں سے ملتے تو اپنے جذبات قابو میں نہ رکھ سکتے۔ گرچہ غیر شعوری
طور پر ہی سہی، فوراً مچل جاتے اور ایسی حرکتوں پر اتر آتے جو کسی بدکار عورت کے ساتھ
ہی کی جا سکتی ہیں۔"[1]

روسی کمیونسٹ افسر تو کسی تکلف کے قائل ہی نہ تھے۔ وہ رائفل کے سائے بنے پھرتے۔ کوئی بے پردہ
عصمت کے ان ڈاکوؤں سے محفوظ نہ رہی تھی۔ ای۔ ایس بیٹس (E. S. BATES) کے الفاظ میں۔

"روسی افسر جب کسی بے پردہ عورت کو دیکھتے تو اسے لقمۂ تر سمجھتے۔ گھیر گھار کر مکان
میں لے جاتے اور اس کی عصمت دری کر ڈالتے۔"[2]

کمیونسٹوں کی ان سرگرمیوں کا ردعمل شدید اضطراب کی صورت میں ظاہر ہوا۔ چنانچہ متعدد مقامات پر
ایں اپنے مردوں سے محروم ہونا پڑا۔ قتل کی ان وارداتوں سے متاثر ہو کر کمیونسٹ دوبارہ محتاط ہو گئے۔
دیا آئیں۔ یک پرجوش کمیونسٹ عورت کی سرگرمیاں ناقابل برداشت ہو گئیں تو مسلمانوں نے جنہیں
کمیونسٹ عصمت ملا کہتا ہے ۔۔۔ انقلابی مجلس سے احتجاج کیا اور دھمکی دی ۔۔۔ کہ اگر اس عورت کو
گرفتار نہ کیا گیا تو وہ قانون کو خود اپنے ہاتھ میں لے لیں گے۔ چنانچہ اعانت اور خونریزی سے بچنے کے لئے محض
دکھاوے کے طور پر گرفتار کر لیا گیا۔[3]

ملا ہور متدین مسلمانوں نے استیصال کے لئے کمیونسٹ جس مناسب وقت کا انتظار کر رہے تھے وہ ابھی
نہیں آیا تھا۔ انہیں ہدایت کی گئی کہ وہ اپنے صبر اور بردباری سے کام لیں۔[4]

---

[1] Soviet Asia P. 149 [2] حوالہ سابق ص ۲۸۰، ۲۸۱

[3] Dawn over Samarkand OP Cit. P. 181

[4] ایضاً ص ۲۸۰ ایضاً ص ۲۸۱

toobaa-elibrary.blogspot.com

بالآخر وہ وقت آ ہی گیا جب کمیونسٹوں نے کھلے عام اسلامی تہذیب و اقدار کے خلاف ہر جہتی جنگ شروع کر دی۔ ۱۸ مارچ ۱۹۲۰ء کو بخارا میں ایک بہت بڑی تقریب منعقد ہوئی اور برقعوں کا ڈھیر لگا کر سرِعام نذرِ آتش کر دیا گیا۔ آنے والے سالوں میں ۱۸ ۱۹ اپریل گویا قومی دن بن گیا۔ اور اس روز اس رسم کو باقاعدہ دہرایا جانے لگا۔[1]

وسط ایشیا کی تقریباً پانچ ہزار خواتین نے مزاحمت کی اور پردہ ترک کرنے سے انکار کر دیا۔ ان میں سے اکثر کے برقعے زبردستی چھین لیے گئے۔ اور بقیہ نے اپنے رشتہ داروں کی منت سماجت اور ترغیب و تحریص پر بے پردگی اختیار کر لی۔[2] جبراً پردہ اتارنے کی یہ مہم روسی عورتوں نے انجام دی۔[3]

سوویٹ ایشیا کے مصنف کے بقول یہ عورتیں ہر اس رکاوٹ کو دور کرنے کا تہیہ کر چکی تھیں جو ملاؤں اور مردوں نے کھڑی کر رکھی تھیں اور ایشیائی عورتوں کو تہذیبِ جدید کی راہ پر گامزن ہونے سے روک سکتی تھی۔[4]

ایک عام تو وہ تھا کہ کمیونسٹ پارٹی اپنی صفوں میں راسخ العقیدہ اور نماز روزہ کے پابند مسلمانوں کو نہ صرف گوارا کرتی بلکہ بڑے بڑے مقامی کمیونسٹ مسجدوں میں باقاعدہ باجماعت نماز پڑھتے تھے اور اب یہ کیفیت کہ اسلام سے وابستگی، اسلامی فرائض کی ادائیگی اور دینی شعائر کا احترام و اہتمام جرم قرار پایا۔ خوقند کے ایک گاؤں کے دس کسانوں کو ایک اجتماعی فارم کی رکنیت سے اس لئے محروم کر دیا گیا کہ وہ مسجد میں نماز ادا کر رہے تھے۔ خوجہ بخشب نامی گاؤں میں ایک اجتماعی فارم میں یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ اس کے ارکان نے مسجد میں جا کر نماز پڑھنے پر اصرار کیا تھا۔[5] اور اجتماعی فارم سے کسی کو نکال دینے یا اسے توڑ دینے کا مطلب یہ تھا کہ متاثر افراد پر رزق کے دروازے بند کر دیے گئے ہیں۔ ان کے سامنے دو ہی راستے ہیں یا تو اپنے بیوی بچوں سمیت مر جائیں یا دین کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیں۔ بخارا کے علاقے میں پارٹی کے ارکان نے اعلان کیا کہ اجتماعی فارموں میں مُردوں کو جلانا لازمی ہوگا۔[6] اب سوشلزم اور ملحدانہ تعلیمات سے نابلد اقلیت بھی جرم ٹھہری۔ کشکادریا میں چند کسانوں کو اجتماعی فارم سے اس لئے خارج کر دیا گیا

---

[1] سوویٹ ایشیا ص ۱۴۸ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً

[5] Dawn over Samarkand OP Cit. P 192

[6]

دور رہنے کے تھے کہ سوشلزم کے کیا معنی ہیں اور ڈاروِن کب پیدا ہوا تھا۔[1]

کمیونسٹوں نے اپنا ابلاغ فریب بالکل آشکار چھینکا تھا۔ وہ نشہ بند میں بدمست مسلمانوں کے دین اخلاق سے بے دھڑک کھیل رہے تھے جو شوا کونسٹر کی روایت کے مطابق ایک کمیونسٹ شراب کے نشے میں دھت کسانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے:

"ہم نے تمہارے مویشی تو چھین لیے۔ اب ہم تمہاری بیویوں اور بیٹیوں کو بھی اجتماعی ملکیت میں دینے والے ہیں ہم انہیں اپنے پہلو میں سلائیں گے۔ اور اس طرح ایک دوسرے سے خوب گھل مل کر مکمل کمیون دھوئیں لائیں گے۔"[2]

یہ ایک بدمست شرابی کی بڑ تھی مگر کمیونسٹوں نے عملاً مختلف مقامات پر کمیون قائم کیے تھے ان کمیونوں کے اجلاس سرخ پرچم کے تلے مسجد کے صحنوں میں منعقد ہوتے تھے۔[3] خاندانی زندگی تہس نہس کر دی گئی۔ پانچ سے ازدواجی زندگی کی جگہ آزاد سیکس رائج کی گئی اور محرم و نامحرم تک کی تمیز اٹھا دی گئی۔ تصدیق کے لئے لینن ہی کی ایک تقریر کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے:-

"دنیا کے تمام متمدن ممالک میں اگرچہ بہت زیادہ ترقی یافتہ بھی ہیں۔ عورتوں کا مقام گھر کے ایک غلام سے زیادہ نہیں ہے کسی بھی سرمایہ دار ملک یا زیادہ سے زیادہ آزاد ری پبلک میں عورت پوری طرح سے مساویانہ حقوق نہیں رکھتی۔ سوویٹ ری پبلک کے اہم ترین کاموں میں سے ایک کام یہ ہے کہ عورتوں کے حقوق پر جو پابندیاں عائد ہیں وہ سب کی سب ہٹا دی جائیں۔ اس وقت تک سوویٹ حکومت نے طلاق کی کارروائی کلیۃً منسوخ کر دی ہے جو ذلت و رسوائی اور ظلم و ستم کا منبع ہے۔ طلاق میں آسانی کے قانون کو پاس کیے ہوئے عنقریب ایک سال ہو جائے گا ہم نے ایک ڈگری صادر کر دی ہے جس کی رو سے حلالی اور حرامی بچوں میں فرق ختم کر دیا ہے اور سیاسی پابندیاں اٹھا لی ہیں۔ دنیا میں اور کسی جگہ بھی مرد و عورت کی آزادی اور مساوات اس طرح سے

---

toobaa-elibrary.blogspot.com

قائم نہیں کی گئی۔[1]

مساجد کا انہدام

اسلام عقیدہ، عبادات، معاملات اور اخلاق کے مجموعے کا نام ہے۔ بظاہر یہ تینوں چیزیں اپنی اپنی جگہ پر مستقل اور ایک دوسرے سے الگ دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن درحقیقت باہم مربوط اور ایک ہی وحدت کے مختلف اجزا ہیں۔ جو نظر رکھتے ہیں کہ اسلامی زندگی کی تشکیل میں یہ تینوں چیزیں برابر کی حصہ دار ہیں۔ اور ان میں سے کسی ایک کا فقدان اسلامی زندگی کے مطلوبہ آثار و نتائج کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔ تاہم عبادات کو اس لحاظ سے اہمیت اور اولیت حاصل ہے کہ یہ خالق کی عظمت اور کبریائی کے احساس و تصور کو بلاواسطہ تازہ اور تازہ تر رکھتے ہیں جس کی بدولت معاملات اور اخلاق میں بھی اسلامی تقاضوں کی رعایت آسان ہو جاتی ہے۔ عبادات میں بھی شریعت نے نماز کو جو مرتبہ اور مقام عطا کیا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی صحت مند معاشرت کی ضامن اور ان کی قومی شیرازہ بندی میں بنیادی کردار کی حامل ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کا حصول جماعت سے وابستہ ہے جس کی جائے اقامت مسجد ہے۔ نتیجۃً مسجد ہی اسلامی قوت کے تحفظ کا وہ مرکزی کن فیکون بنتی ہے جس پر حیات آفرین قوتوں اجتماعیت کا دارومدار ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اعداء اسلام کو اس کا وجود ایک آنکھ نہیں بھاتا۔

کمیونسٹوں نے مقبوضہ مسلمان علاقوں میں کتنی مساجد کو بند یا ان میں بوس کر دیا اس کا مکمل احاطہ تو مشکل ہے البتہ کچھ اعداد و شمار جو آسانی سے مہیا ہو سکیں وہ یہ ہیں۔ کمیونسٹوں سے پہلے مختلف علاقوں میں مسجدوں کی تعداد مندرجہ ذیل تھی۔

ہالنگا اور اوردل	۷۰۰۰
ترکستان	۱۴۰۰۰
قفقاز	۹۰۰
جنوبی ہائے قرم (کریمیا)	۱۰۰۰
	۳۱۰۰۰[2]

---

[1] اسلامی صلیبیوں کی کانفرنس مؤتمر شیراز کراچی اگست ۱۹۵۶ء بحوالہ بالاسلام ص ۱۸

سوویٹ وار یونین (۱۹ مئی ۱۹۴۲ء) کی اطلاع کے مطابق ۱۹۴۲ء میں سارے سوویٹ روس میں صرف ۴۰۰ مسجدیں باقی رہ گئی ہیں[1] باقی ساری مساجد یا تو منہدم کر دی گئیں یا انہیں بیاہ گاہوں، گوشت کے گودام، اصطبلوں اور چوپایوں، مرغ چوزے خانوں، عشرت کدوں، تماشہ گاہوں، اسٹوڈیوں، دارالمطالعوں، ڈسپنسری، ہسپتالوں، دواخانوں اور عجائب گھروں میں بدل دیا گیا[2] بے شمار مسجدیں گرا دی گئیں۔ ان کی اینٹیں اور پتھر دوسری عمارتوں کے لیے مسالہ کے لیے[3] کریمیا میں ۱۹۳۰ء تک ایک مسجد بھی باقی نہ رہنے دی[4] آذربائیجان کے صرف ایک شہر شماخی میں ۱۳ مسجدیں گرا دی گئیں اور ان کے بدلے سینما گھر تعمیر کر دیا گیا[5] مسجدیں گرانے وقت کہا گیا کہ لوگ اپنی مرضی سے گرا رہے ہیں۔ اس ضمن میں کمیونسٹ اخبار لکھتا ہے۔

"عوام نے مسجدوں اور عبادت گاہوں پر ہلہ بول دیا ہے۔" ان کی رائے پر یہ فقرہ ہے "ہمیں معلوم ہے کہ اس کے گھروں کی ضرورت نہیں انہیں مسمار کر دیا جائے۔ ان کی جگہ اسکول اور جلسہ گاہیں تعمیر کی جائیں[6] حالانکہ صورت حال اس کے بالکل برعکس تھی یہ انہدام و تخریب زبردستی ہو رہا تھا۔ آذربائیجان کی سنٹرل الیکشن کمیٹی کے صدر ڈاکٹر مجید آقا نی زادہ نے صاف الفاظ میں اعتراف کیا کہ سرکاری اخبارات کا دعویٰ صداقت سے عاری ہے۔ مسجدوں کو نہ تو برضا و رغبت گرایا گیا اور نہ بند کیا گیا بلکہ جو کچھ ہوا اس کے پیچھے جبر و تشدد کام کر رہا تھا[7]

ماسکو کی جامع مسجد دوسری جنگ سے پہلے تک پبلک ہال کے طور پر استعمال کی جاتی رہی جس میں اسلام کے علاوہ لیکچر دیئے جاتے اور رقص و سرود کی محفلیں جما کرتیں[8] جمہوریہ تاتاریہ کے شہر عنزلہ میں جامع مسجد اسکول میں تبدیل کر دی گئی۔ اور اس کے مینارے پر ہلال کی جگہ سرخ پرچم لہرا دیا گیا[9]

---

[1] رپورٹ آف اسلام کراچی دسمبر ۱۹۶۱ء ص ۱۲۹ [2] جمہوریہ کلیریل ازبکستان تاشقند ۱۹ اپریل ۱۹۳۰ء بحوالہ بالاسلام ص ۱۸۰

[3] عدد دینی عدد ۱ ص ۹۲۔ طبع میونخ ۱۹۵۵ء بحوالہ بالاسلام ص ۷۵

[4] کمیونسٹ، ۳۰ دسمبر ۱۹۲۸ء باکو۔ بحوالہ بالاسلام ص ۷۵ [5] ایضاً ۳ فروری ۱۹۲۹ء

[6] " ۲۲ اکتوبر ۱۹۲۹ء " " [7] بالاسلام ص ۱۰۷

[8] جریدہ آبشخی تاژان ۲۰ نومبر ۱۹۲۹ء بحوالہ بالاسلام ص ۹۳ (روس میں مسلمان قومیں)

toobaa-elibrary.blogspot.com

شعائرِ اسلام پر پابندی

مسجدیں بند کرنے اور گرانے کے ساتھ ساتھ کمیونسٹوں نے اسلامی شعائر اور مسلمانوں کی دینی زندگی ختم کرنے اور ان کی عملی زندگی کا رشتہ اسلام سے کاٹ دینے کے لیے متعدد اقدامات کیے۔ قانون فوجداری کی دفعہ ۱۲۴ کے تحت بچوں کو اسلامی تعلیم دینے پر سزا کا مستوجب گردانا گیا۔ دفعہ ۱۲۳ کے تحت نماز پڑھنے اور دفعہ ۱۲۶ کے تحت مسجدوں اور مدرسوں کے لیے چندہ جمع کرنے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ دفعہ ۱۲۶ کی رو سے نکاح کا خطبہ، بچے کی ولادت پر اس کے کان میں اذان و تکبیر کہنا، عقیقہ اور ختنہ کرنا اور نماز جمعہ کرنا ممنوع قرار دے دیا گیا[1]۔ عید بقر عید کے اجتماع میں شرکت سے روک دیا گیا اور دینی تہواروں کی جگہ نئے نئے ثقافتی جشن اور تحویلی میلے منائے جانے لگے۔ قرآن و حدیث اور دیگر دینی کتابوں کی طباعت و اشاعت پر پابندی لگا دی گئی۔ پہلے قازان اور اوفا میں اور پھر دوسرے شہروں میں تمام چھاپے خانے ضبط کر لیے گئے۔ ایک ایک گھر کی تلاشی لے کر دینی کتابیں جمع کی گئیں اور انہیں الاؤ میں جھونک دیا گیا[2]۔ دینی تعلیم کے حصول یا حج بیت اللہ کے لیے بیرونِ ملک کا سفر ممنوع قرار دے دیا گیا[3]۔ مسلمانوں کو ان کی روایات سے محروم اور حلال و حرام کے متعلق ان کے احساسات و جذبات کو ختم کرنے کے لیے وسطِ ایشیا کے تمام ملکوں میں سور پالنا لازمی قرار دے دیا گیا۔ اور اس مقصد کے لیے مسلمان کسان عورتوں کو آلہ کار بنایا گیا۔ کمیونسٹ جریدہ کیزیل تاتارستان مورخہ ۸ مارچ ۱۹۳۰ قازان نے لکھا۔

"قبل ازیں تاتاری عورتیں اسلام قرآنی کے مطابق سور نہیں پالتی تھیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اب وہ خدا سے بالکل نہیں ڈرتیں۔ وہ فرسودہ اور قدیم خرافات سے آزاد ہو چکی ہیں نہ انبیاء علیہم السلام، علماء اور جاگیرداران کے مقابلے میں مغلوب ہو گئے ہیں اور منشورِ قرآن پامال کیا ہے۔"[4]

شعائرِ اسلام کے متعلق کہا گیا کہ یہ متوسط طبقے کو تقویت پہنچاتے ہیں اور انقلاب کے منافی اعمال ہیں۔ ان کا

---

[1] بحوالہ اسلام ص ۳۱ [2] ایضاً ص ۳۱ [3] کمیونسٹ ۳۲/۱۹۲۵ بحوالہ بالا اسلام ص ۳۵ [4] کیزیل تاتارستان بحوالہ بالا اسلام ص ۶۷ [5] بحوالہ بالا اسلام ص ۳۵ [6] ملاحظہ ہو روس میں مسلمان قومیں

اوفا کے صوبے میں سوویٹ یونین کی دسویں سالگرہ پر چھ مسجدیں، اسکولوں اور جلسہ گاہوں میں بدل دی گئیں۔ اور منطقہ اوفا کی تحصیل بینا تاک میں پانچ مسجدیں مقفل کر دی گئیں[1]۔ انقلاب اکتوبر کی سالگرہ پر باشکیریا کے مختلف دیہات میں ۲۳ مسجدیں بند کی گئیں جنہیں بعد ازاں اسکولوں اور جلسہ گاہوں میں بدل دیا گیا[2]۔ یان ورلڈ (اوفا) ۱۹۳۹ء کی روائت کے مطابق باشکیریا کے دار الحکومت اوفا میں مئی ۱۹۲۰ء میں ۱۱ مسجدیں سربمہر کر دی گئیں۔ اس دہشتناک مہم میں کمیونسٹوں نے تاریخی مساجد کو بھی نہ بخشا جامع ابزیم کا مینار قازان میں فن تعمیر کا حسین اور دلکش شاہکار تھا۔ فاکیشوف کے کارخانے میں کام کرنے والے مزدوروں کی گواہی پیش کی گئی کہ اس مینار کو گرا کر مسجد کی عمارت میں کارخانہ نصب کر لیا گیا[3]۔ ۱۹۳۲ء تک سوفرلوفسک اور لاڈی واشک کے درمیانی علاقے میں ایک مسجد بھی باقی نہ رہی[4]۔ تاتاریہ اور باشکیریا میں کل ۸۰۰۰ مسجدیں منہدم کر دی گئیں۔

یہی کچھ کریمیا اور قفقاز میں ہوا۔ ایک سوویٹ مصنف بارتولد نے لکھا کہ پانچی سماری کے شہر میں جو کریمیا کے مسلمانوں کا دینی مرکز تھا اور جہاں تئیس مسجدیں تھیں ۱۹۳۵ء میں صرف تین مسجدیں رہ گئیں اور ان میں بھی مٹھی بھر بوڑھوں کے سوا کوئی نماز نہیں پڑھتا[5]۔ بے شمار مساجد سینما گھروں اور گوداموں میں تبدیل کر دی گئیں۔ اذان کے مینار گرا دیے گئے۔ منہدم کی جانے والی مسجدوں میں دو اہم تاریخی مسجدیں تھیں۔ ایک یوباتوریا کی جامع "الحمد"[6] اور دوسری سمفروپول کی "آق مسجد"[7]

قفقاز میں سوویٹ حکومت نے ۱۹۲۵ء میں ۶۲۸، ۱۹۲۷ء میں ۳۶، ۱۹۲۸ء میں ۱۱۶ اور ۱۹۲۹ء میں ۲۱۳ مسجدیں سربمہر کر دیں۔ ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۸ء کے درمیانی عرصے میں ویران غیر آباد ہونے اور مقفل کی جانے والی مسجدوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہو گیا۔ حتیٰ کہ ۱۹۴۱ء تک ان کی تعداد ۳۸۵۰ تک پہنچ گئی۔ ۱۹۴۱ء تک ۹۶ فیصد مسجدیں گرائے جا چکے تھے[8]

---

[1] جریدہ یاما اول ۱۵ نومبر ۱۹۲۶ء بحوالہ سابق [2] ایضاً ۱۸ نومبر ۱۹۲۶ء [3] کیزیل تاتارستان ۱۹۳۰ء بحوالہ بالا اسلام ص ۹۴ [4] مقالہ یوسفوف سمیر میں "تحریک مسلمانوں" کے انہدام کا ذکر ہے [5] بحوالہ بالا اسلام ص ۹۳ [6] پریس بلاٹون کا بیان جریدہ کریمیا ص [7] اسلام ۱۹۳۰ء بحوالہ بالا اسلام ص ۱۱۱ [8] ریلیجی سٹاف (صوبہ جامع خان جریدہ مفرقہ قم ۵۲۲ - ۲۱ جولائی ۱۹۲۲ء بحوالہ بالا اسلام ص ۱۲۹ [9] پریس بلاٹون کا بیان جریدہ کریمیا ص ۳ مارچ ۱۹۲۶ء بحوالہ بالا اسلام ص ۳۹ [10] مراسلہ قفقاز شمالی قفقاز کے باشندے۔ اگست ۱۹۳۰ء بحوالہ بالا اسلام ص ۱۰۸ (روس میں مسلمان قومیں)

toobaa-elibrary.blogspot.com

قلع قمع کرنے کے لئے حکومت، پارٹی، انقلابی انجمنوں، قانون اور خفیہ پولیس کی غرض تمام ممکن وسائل سے کام لیا گیا۔ یہ محض پروپیگنڈے اور ترہیب و تحریص ہی پر اکتفا نہ کیا گیا بلکہ جبر و تشدد اور ترہیب و تہدید کے حربے بھی استعمال کئے گئے۔[1] کریمیا کا ترکمان اسماعیل حسن آکین کریمیا میں اسلام اور اسلامی شعائر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"۱۹۲۳ء کے اواخر تک جزیرہ نمائے کریمیا میں کسی اسلامی و دینی ادارے کا نام و نشان نہ رہا۔ نہ دینی اجتماعات کا قیام ہی ممکن رہا۔ اگر یہ کہیں چوری چھپے منعقد کئے جاتے۔ ختنہ کی رسم سرکاری طور پر ممنوع قرار دے دی گئی جن لوگوں نے اس رسم کو جاری رکھنے پر اصرار کیا انہیں قید و بند کی سزا بھگتنی پڑی۔ یا انہیں جلاوطن کر کے روس کے دور دراز علاقوں میں بھیج دیا گیا۔ کسی شخص کے لئے کسی دینی فعل پر کاربند رہنا ممکن نہ رہا اس لئے کہ سب جانتے تھے کہ اس کی سزا کیا ہے۔ وہ علماء جو ایک عرصے تک تعذیب و اذیت کا تختہ مشق بننے کے بعد رہا ہوئے۔ انہوں نے اپنے فرائض انجام دینے سے انکار کر دیا۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ لوگوں نے اپنے مُردوں کی تجہیز و تدفین ناممکن ہو گئی۔ وہ اپنے گھروں میں بند دروازوں کے پیچھے نماز پڑھنے پر مجبور ہو گئے۔ مسجدیں بند کر دی گئیں۔ ۱۹۳۶ء میں جب چند بوڑھے مسلمانوں نے سمفروپول کے شہر میں شارع نقرنا پر واقع مسجد میں نماز پڑھنے کی جرأت کی تو انہیں خفیہ پولیس نے عین موقعہ پر گرفتار کر لیا۔ چنانچہ تمام اسلامی اجتماعات خفیہ طور پر منعقد ہونے لگے۔"[2]

خود سوویٹ اخبارات بھی اس عینی شاہد کے بیان کی تصدیق کرتے ہیں کہ کریمیا میں اسلامی احکام و شعائر کی پابندی اور اسلامی عبادت، فرائض کی ادائیگی اور سچا قدری قانون جرم تھی۔ ۱۹۳۶ء میں باقر مصطفےٰ نامی ایک شخص کو تین سال قید بامشقت کی سزا اس لئے دی گئی کہ اس نے اپنے ایک رشتہ دار کا نکاح

---

[1] بین الاقوامی ڈائجسٹ ۱۹۳۰ء ص ۹-۱۱ بحوالہ اسلام ص ۳۲ [2] اسمٰعیل حسن آکین کی مرسلہ کتاب "بالشویک سوسائٹی اور اہل قرم کی اس کے خلاف جدوجہد" حوالہ بالا اسلام ص ۱۳۱ [3] یزی دیا، ۱۲۳، ۹ اکتوبر ۱۹۲۹ء، ۶ اکتوبر ۱۹۳۵ء، یکم اگست ۲ ستمبر ۱۹۳۶ء، حوالہ بالا اسلام ص ۱۳۱ (بیسویں صدی قرآن)

اسلامی شریعت کے مطابق کیا تھا، اور ولیمہ کی دعوت دی تھی۔[1]

دینی مدارس اور علماء کا حشر

کوئی مذہب اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا، یعنی خصوصیات کو زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رکھ سکتا اور بدلتی ہوئی زندگی پر اثر نہیں ڈال سکتا جب تک اس میں وقتاً فوقتاً ایسے اشخاص نہ پیدا ہوتے رہیں جو اپنے غیر متزلزل یقین، بے غرضی، بے نفسی، ایثار، اپنی اعلیٰ دماغی اور قلبی صلاحیتوں سے اس کے قالب مردہ میں زندگی کی نئی روح پھونک دیں۔ اور اس کے ماننے والوں میں نیا اعتماد اور جوش اور قوت عمل پیدا کریں۔

چونکہ اسلام رب تعالیٰ کا آخری دین ہے اور قیام قیامت تک انسانیت کی رہنمائی کا کفیل اور ضامن اس لئے اس کی بقا و حفاظت کے لئے جہاں اور بے شمار انتظامات کئے گئے وہاں اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں اس کے اندر وہ اشخاص بھی پیدا کئے جو اس کی عملی صورت کو قائم و دائم رکھیں۔ اور خلقت کے اندر اسلام کے احیاء و تجدید کا ذریعہ بنیں۔

اشتراکی حکومت نے اپنے دائرۂ اقتدار میں روشنی کے ان میناروں کو ڈھانے اور اسلام کے ان عملی نمونوں کو مٹانے کے لئے ہر ممکن تدبیر سے کام لیا اور علماء و صلحاء امت کو ختم کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ پھر اس پر بھی اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ تمام مدارس اور تعلیمی و تربیتی مراکز بھی نیست و نابود کئے جہاں ایسے افراد کے نکل آنے کی توقع کی جا سکتی تھی تاکہ اس سلسلے کی جڑیں ہی منقطع ہوں۔ اور پھر کبھی اس کی کوئی کونپل پھوٹنے کا اندیشہ بھی باقی نہ رہے۔

ترکستان، داغستان، وولگا، ورال اور کریمیا کے علاقوں میں علماء کا صفایا کرنے کی مہم پہلے ان ہی سے شروع کر دی گئی تھی۔ ۱۹۲۳ء میں سمرقند کی جیل کھودنے کا کام جن قیدیوں سے لیا گیا ان کی ایک بڑی تعداد علماء پر مشتمل تھی۔ سوسیک نامی ایک یوکرینی قیدی جو اس زمانے میں انسانی آزمائش میں مبتلا تھا اپنی سرگذشت میں لکھتا ہے۔

"جو علماء ترکستان اور ازبک کے علاقوں سے آئے تھے وہ اپنے عوام کے مخلص

---

[1] یزی دیا، ۲۲ ستمبر ۱۹۳۶ء، حوالہ سابق

toobaa-elibrary.blogspot.com

خادم تھے۔ ان کی قوم کے لوگ ان کے ساتھ نہایت خلوص اور احترام قلب کے ساتھ پیش آتے تھے۔ میں نے کسی دوسری قوم کے قیدیوں کو اپنے دینی رہنماؤں کے لئے اس طرح دیدہ و دل فرش راہ کئے نہیں دیکھا۔"[1]

۱۹۲۹ء میں یہ ہم پوسے عروج پر تھی۔ تاشقند اور دوسرے شہروں میں خفیہ عدالتیں قائم ہوگئیں ان پر اور دشمن جرائم کے ارتکاب، عوام کو نظام اجتماعی کے خلاف بغاوت پر اکسانے یہ قومی مفادات کو ہو دیسے نے جرم میں مقدمے چلائے گئے۔ انہیں اپنی صفائی پیش کرنے کا حق بھی نہیں دیا گیا سوویٹ حکام کے بیان کے مطابق ان مقدمات میں پتہ چلا کہ ملک میں اتحاد اسلامی کے "تباہ کن" تصورات کی جڑیں نہایت گہری ہیں۔ بڑے بڑے جید علماء تختہ دار پر لٹکا دیئے گئے۔ ہزاروں بے سروپا الزامات کی پاداش میں بیل خانوں میں ٹھونس دیئے گئے۔ دور دراز کی جلاوطنی روزمرہ کا دستور بن گیا[2] جو لوگ پھانسی لگنے سے بچ گئے ان میں سے اکثر قید خانوں اور سائبیریا کے سرد جہنم میں تعذیب و اذیت سے جاں بحق ہو گئے۔ ان میں بڑی تعداد معمر رسیدہ اصحاب کی تھی۔ ۱۹۴۰ء تک پورے سوویٹ روس میں ۵۰ ہزار علماء کمیونسٹوں کی دہشت گردی کا شکار ہو گئے تھے[3]

سوویٹ فوجداری قانون کی دفعہ ۵۸ کے تحت علماء، مؤذنین، خطیبوں، واعظوں اور ائمہ مساجد کے شہری حقوق سلب کر لئے گئے۔ ان کے راشن کارڈ ضبط کر لئے گئے[4]۔ انہیں غیر عامل طبقہ دے کر ان پر بھاری ٹیکس عائد کر دیئے جن کی ادائیگی ان کی حد استطاعت سے باہر تھی[5]۔ انہیں مجبور کیا گیا کہ عام اسلام سے سوویٹ روس کی تائید و حمایت کی اپیل کریں[6]

یہی صورت حال قفقاز اور اورال وغیرہ میں پیش آئی۔ علماء پر ٹیکسوں کا بھاری بوجھ لاد دیا گیا۔ بڑے

---

[1] رول سوویٹ، اصطلاحات سیاسیہ لوقانیم تشرح بنان پوکرنی ص ۲۴۳ بحوالہ بالاسلام

[2] ؛

[3] ناسان جیری جاباجی، گرامیل اور اسلام محلہ آزاد قفقاز عدد ۱۰، ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۲ء ص ۶ میرنج بحوالہ بالاسلام ص ۳۲ [4] بالاسلام ص ۱۳۰ [5] بالاسلام ص ۹۱

[6] جریدہ زار یا خوستک، ۱۲ اگست ۱۹۲۳ء تفلس پر ۲۰ دسمبر ۱۹۲۴ء، بسکو بحوالہ بالاسلام ص ۲۸ - (روس میں مسلمان قومیں)

[illegible] علماء موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ بے شمار مفرور یا اور جاپان کی طرف بھاگ گئے[1] جنہیں بھاگنے یا [illegible] پوش ہونے کا موقعہ نہ ملا انہیں کسی قسم کی تحقیقات اور عدالت میں پیش کرنے کا تکلف کئے بغیر گولی مار دی گئی [illegible] ایدل (وولگا) اور اورال کے علاقے میں اٹھارہ ہزار ائمہ مساجد موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے[2]

[illegible] ری اور باشکیریہ علماء کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔ ۱۹۳۲ء تک بعض علاقوں میں ایک عالم دین بھی [illegible]

۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء تک کے دوران جب کہ ہر طرف تطہیر عام [illegible] اور دورہ تھا، قتل و خون ریزی انتہا کو پہنچ گئی جو شخص بھی خدا کا نام لیوا نظر آیا اسے عوام دشمن اور رجعت پسند قرار دے کر دھر لیا[3] جوان اور بوڑھے سب ایک ہی چکی میں پیسے گئے۔ کوئی بھی محفوظ و سلامت نہ رہا۔ [illegible] یہ کا تذکرہ کرتی صدرالدین عالی اسلام اور مسلمانوں کی داستان الم کا ذکر کرتے ہوئے اپنی سرگزشت میں [illegible] ہے۔

"دسمبر ۱۹۳۷ء میں صرف ایک رات میں ۶۰ افراد گرفتار کئے گئے میں خود بھی ان لوگوں میں شامل تھا۔ اس وقت ماسکو بازار کا قید خانہ علماء سے بھرا ہوا تھا۔ یہ وہ آخری گروہ تھا جو کہ یسا میں باقی رہ گیا تھا۔ اکثریت عمر رسیدہ اصحاب کی تھی جن میں شیخ محمد جواد احمد وہبی (۷۰ سال)، شیخ عبدالمجید (۷۰ سال)، الحاج کفاد (۸۰ سال)، سعید فضیل شلبی اور خواجہ فتح علی (۹۰ سال) ایسے نمایاں بزرگ تھے[4]

ان علماء میں بے شمار وہ سادہ لوح اور فریب خوردہ اصحاب بھی تھے جو سوشلزم کو محض ایک اقتصادی پروگرام سمجھتے تھے اور جن کا خیال تھا کہ اس اقتصادی پروگرام کے ساتھ ساتھ اسلامی عقائد، نماز روزہ، زہد و تقویٰ اور دینی زندگی کے رسمی مظاہر بھی چل سکتے ہیں، اور ان پر کوئی آنچ نہ آئے گی۔ وہ لوگ بھی تھے جو اسلام کو سوشلزم مذہب قرار دیتے اور سوشلزم کی حمایت میں قرآن و حدیث سے استشہاد کرتے تھے۔

کمیونسٹ انقلاب سے پہلے ۱۹۱۷ء میں سائبیریا، ایدل، اورال، ترکستان، قفقاز اور دوسرے مسلمان

---

[1] بحر بان علمی بول عدد (۴)، ۱۹۳۷ء ص ۱۱ برلن۔ بحوالہ بالاسلام ص ۸۵ [2] سفارت جرمن، ایدل اورال کے سمتی حری عدد ص ۱۰۳ میونخ ۱۹۵۱ء بحوالہ بالاسلام ص ۹۲ [3] بالاسلام ص ۱۳۰ [4] یفاص ۳۳

[5] مذکرات نامائی جس کا مسودہ ڈاکٹر اوسچ کریمال کے پاس موجود ہے۔ بحوالہ بالاسلام ص ۳۱ (روس میں مسلمان قومیں)

toobaa-elibrary.blogspot.com

علاقوں میں مسلمانوں کے اپنے بیان کے مطابق کل ۲۵ ہزار اور روس کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق دس ہزار ابتدائی مکاتب اور ۱۰۰۵ اعلیٰ دینی مدارس تھے ترکستان میں ۶۳۰۰ ابتدائی اور ۶ ثانوی اور اعلیٰ دینی مدارس تھے اور صرف ایک شہر بخارا میں چھوٹے بڑے ۲۸۰ مدارس کام کر رہے تھے جن میں ۱۰۴۰۰ طالب علم پڑھتے تھے[1] مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر ان مدارس کا بڑا گہرا اور دور رس اثر تھا۔ کاؤنٹ پالین اپنی یادداشت میں لکھتا ہے۔

"ان مدارس میں اسلام کی روحانی بنیادوں، اس کی اخلاقیات اور روحانی زندگی کے ساتھ اس کے تعلق کی تعلیم ایسے انداز میں دی جاتی ہے جو سارے عالم اسلام میں یکساں اور مشترک ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر ملک کا نوجوان مسلمان ایک واضح اور متعین سانچے میں ڈھل جاتا ہے اس طرح نسل انسانی کے ایک بہت بڑے نوجوان نسل کی تشکیل و تعمیر میں یہ مدارس جو موثر کردار ادا کرتے ہیں۔ اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ممکن نہیں۔ ایک مسلمان بچہ جب مدرسے میں داخل ہوتا ہے تو اس کا ذہن کوری تختی ہوتا ہے لیکن جب وہ مدرسے سے نکلتا ہے تو ایک ایسے انسانی معاشرے کا رکن بن کر نکلتا ہے جس کے نزدیک خاندانی روایات نسلی بنیادیں، جغرافیائی حد بندیاں الغرض وہ سارے نظریات کوئی حقیقت نہیں رکھتے جو ہماری نظر میں انسان کی تہذیبی نشوونما کے لئے ناگزیر ہیں۔ اس کی اپنی زندگی کا ملان نکتہ پات پر مبنی ہوتی ہے جنہیں مدرسے میں متواتر دہرایا جاتا ہے اور جنہیں آنے والے ماہ و سال میں نہایت عزیز رکھا جاتا ہے"[2]

یہ درس گاہیں نہ صرف روسی مسلمانوں کے فکر و نظر اور اخلاق و کردار کو ایک مخصوص ڈھانچے میں ڈھالتی اور دینی و علمی مراکز کا کام دیتی تھیں بلکہ انہیں سیاسی و فکری قیادت بھی فراہم کرتیں کاؤنٹ پالین کے الفاظ میں

"یہ مدارس اسلام کے انتہائی لائق، حوصلہ مند اور مضبوط اعصاب والے عناصر کو مقام

---

[1] میر اسلام (عالم اسلام) سلسلہ ہینٹ پیٹرزبرگ ۲

اجتماع بھی یہ لوگ زیادہ تر نوجوان ہیں جنہوں نے اپنی زندگیاں سنت و شریعت کی تعلیم میں کھپا دی ہیں۔ اور جن کے دل پیغمبر خدا کے مقصد بعثت کو پورا کرنے کے جوش و جذبے سے معمور ہیں"[1]

بولشویکوں نے یہ سب مدرسے بند کر دیئے۔ اساتذہ کو گرفتار کر لیا۔ خانقاہیں بعض علاقوں میں تو مسمار کر دی گئیں اور بعض مقامات پر ضبط کر کے انہیں چوپالوں، سرخ گوشوں، عجائب گھروں اور سوشیلوں کے ہیڈ کوارٹروں میں تبدیل کر دیا گیا۔ تاہم وسطی ایشیا کے تمام دوسرے علاقوں کی طرح بخارا میں بھی یہ سلسلہ تقریباً ۲۵ برس تک جاری رہا۔ ریلوے سٹیشن کے سامنے ایک مدرسہ بھی موجود تھا۔ ۱۹۵۲ء میں بخارا کا مدرسہ میر عرب[2] کھولا گیا۔ تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع ہوا۔ ۱۹۵۶ء میں تاشقند کا مدرسہ بارکن خان بھی کھول دیا گیا۔ بعد ازاں اسے دوبارہ بند کر دیا گیا۔ اس وقت سارے ایشیائی روس میں صرف بخارا کا مدرسہ کام کر رہا ہے اس مدرسے میں پانچ سال کا نصاب ہے۔ اس میں صرف وہ طلبہ داخل ہوتے ہیں جو پہلے سات سال تک عام ابتدائی سکولوں میں تعلیم حاصل کر چکتے ہیں۔ ۱۹۵۳ء-۱۹۵۴ء میں اس مدرسے کے جو اوقات کار تھے ان کے مطابق دینی علوم سے زیادہ غیر دینی علوم پر زیادہ وقت صرف ہوتا تھا۔ اور سب سے زیادہ زور زبانوں کی تحصیل پر۔ نتیجۃً اس مدرسے سے کسی بلند پایہ عالم کا نکلنا ناممکن ہے البتہ سطحی عالم بیشک تیار ہو سکتے ہیں۔ اس مدرسے کے دوبارہ اجرا پر تقریباً ایک ربع صدی کا عرصہ پورا ہو رہا ہے لیکن اس سے آج تک کوئی اسلامی مفکر، محدث یا فقیہ نہیں نکلا۔ یہ حقیقت علمی شہادت سے اس بات کی کہ مدرسے کا معیار نہایت پست ہے اور اس کا مقصد بس برائے نام قاری خطیب اور مؤذن تیار کرنا ہے۔ تاکہ بوقت ضرورت ان سے حسب غرض کے مطابق مسلمانوں کی نمائندگی کرائی جا سکے

---

[1] اسلام سوویت اور اسلامی مسئلہ" الفرقان لکھنؤ جلد ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۱ء میر سیخ، بحوالہ الاسلام ص ۱۱۹

[2]

[3] مدرسہ میر عرب کی عمارت سولہویں صدی (۱۵۳۵ء) میں مکمل ہوئی۔ اس مدرسے کا شمار بخارا اور ترکستان ہی نہیں بلکہ عالم اسلام کے مشہور مدارس میں ہوتا تھا (تاریخ سوویت جمہوریہ ازبکستان) (بخارا و سمرقند کی مسجدیں صفحہ ۴۵)

toobaa-elibrary.blogspot.com

اخلاق کا انکار و تمسخر

لینن کا قول ہے ۔

"ہم ایسے اخلاق کے منکر ہیں جس کی بنیاد سرمایہ داروں کے اخلاقی احکامات پر رکھی ہو ۔۔۔ ہم تمام ایسی اخلاق، قدر کے منکر ہیں جن کی بنیاد انسانی اور طبقاتی نظریت سے بالاتر ہو ۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ ایک فریب ہے اور کسانوں اور مزدوروں کو زمینداروں اور سرمایہ داروں کے مفاد کی خاطر بے وقوف بنایا جاتا ہے ۔ ہم یہ بتلاتے ہیں کہ ہماری اخلاقی قدار غریبوں کی طبقاتی جدوجہد کے تابع ہے ۔ ہماری اخلاقی قدار کا منبع غریبوں کی طبقاتی جدوجہد کا معاملہ ہے ۔۔۔۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ کوئی ایسی اخلاقی قدر موجود نہیں ہیں جو انسانی معاشرے سے باہر ہوں ۔۔۔۔ ہماری اخلاق قلاشوں کی جدوجہد کے تابع ہے ۔ دوران کی جدوجہد کی ہے ، یہ جدوجہد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ ماری حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے ۔۔۔۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ اخلاق وہی ہے جو پرانے طرز کے معاشرے کو برباد کر دے اور تمام مزدوروں کو محنت کشوں کے گرد متحد کر دے جو نئے کمیونسٹ معاشرے کی تعمیر کر رہے ہیں ۔۔۔۔ جب لوگ ہم سے اخلاقی قدار کی نسبت بات چیت کرتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ ایک کمیونسٹ کے نقطہ نگاہ سے اخلاقی قدار پر مبنی والوں کے سلسلہ عام جدوجہد اور متحدہ تسلیم پر مشتمل ہیں ہم لافانی اخلاقی اقدار کی نسبت جھوٹی کہانیوں کو بے نقاب کر دیں گے ۔"[1]

کارل مارکس اور اینگلز کے نظریۂ اخلاق کی توضیح ایک شتراکی مصنف مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتے ہے

"ہم پر اخلاقی عمل واضح کرتے وقت ہمیشہ مبنی احکامات کو نظر انداز کر دیتے ہیں ۔ اور پہلے سے موجود انسانی معاشرے میں مزدور کی عملی زندگی کو دیکھتے ہیں ۔ اس رویہ میں انفرادیت سے صرف نظر کر کے محض اصول اجتماعیت کو اپناتے ہیں اور انسان کی اجتماعی زندگی ، بحیثیت

---

[1] ۔

باہمی روابط اور پیدائش اشیاء کے دوران میں تمام واقعاتی عوامل کو بہتر نظر رکھتے ہیں ہمارے نزدیک کسی اخلاقی ضابطے کی صحت و عدم صحت کا امتحان انسانی معاشرے میں افراد کے روابط و تعلقات کے درمیان ہوتا ہے کہ آیا اس میں کوئی علمی افادیت ہے کہ نہیں ۔"[2]

کمیونسٹ پارٹی کے منشور کا ایک فقرہ یہ ہے :-

"کمیونزم، اخلاقی قدار کا خاتمہ کرتا ہے ۔ مذہب کا خاتمہ کرتا ہے ۔ بجائے اس کے کہ اس کو ایک نئی شکل میں پیش کرے اس لحاظ سے کمیونزم تمام تاریخی تجربات کے علی الرغم عمل پیرا ہے ۔"[3]

ایک مشہور کمیونسٹ کا فقرہ ہے :-

"میرے سامنے اگر ایک طرف اخلاق کو رکھ دیا جائے اور دوسری طرف ایک پاجامہ ۔ تو میں پاجامے کو اخلاق پر ترجیح دوں گا ۔"[4]

---

[2] ۔

[3] کمیونزم یا اسلام از ابو اسلام نعیم صدیقی ص ۱۲ ۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

باب ششم

سوشلزم کی مطلب آشنائی

روسی میں عبوری حکومت کے بعد برسر اقتدار آنے والی انقلاب انگیز مملکتوں کو کچلنے اور ان کی جداگانہ حیثیت کو ختم کرنے کے بعد سوویٹ لیڈروں نے روسی سلطنت کی مزید توسیع کا کام بڑے زور شور سے شروع کیا۔ روس دنیا کا پہلا ملک تھا جس میں کمیونسٹ پارٹی کو اقتدار نصیب ہوا۔ کمیونسٹوں کا نصب العین کمیونسٹ روس نہیں بلکہ کمیونسٹ دنیا تھا اور کسی سامراس کے مطابق دنیا کے باقی خوانین ہیں۔ کونسل انسانی بتدریج مرحلوں سے گزر کر سوشلزم اور سوشلزم کے بعد کمیونزم میں داخل ہوتی ہے لیکن کمیونسٹوں کو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ نہیں رہنا چاہیئے اور یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ ان کا کام تاریخ سرانجام دے گی۔ انہیں اپنی تمام تر مساعی اس عمل کو تیز کرنے کے لئے بروئے کار لانی چاہئیں۔

لینن کا بھی ہمیشہ یہی عقیدہ رہا۔ اس کے نزدیک کسی کمیونسٹ کا اس سے بدتر کوئی جرم یا گناہ نہیں ہو سکتا کہ وہ بھی قوتوں پر بھروسہ کرتے ہوئے بے عمل ہو کر بیٹھ جائے۔ اس کے خیال میں کسی کمیونسٹ حکومت کا یہ اولین فریضہ ہے کہ وہ عالمگیر انقلاب برپا کرنے کی جدوجہد کرے۔ لیکن اس حکومت سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہیں ہونی چاہیئے کہ اس عالمگیر انقلاب کا بنیادی مستقر (روس) معرض خطر میں پڑ جائے۔ روسی کمیونسٹوں کو صحیح طور پر روس میں اپنی قوت مجتمع کرنی چاہیئے۔ اور روس میں سوشلسٹ نظام قائم کرنا چاہیئے لیکن اس کے ساتھ ہی اس کو دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی انقلابی جدوجہد کی مدد کرنی چاہیئے۔

لینن اور اس کے جانشینوں نے اس نظریئے کو روبہ عمل لانے میں پوری کوشش کی۔ انہوں نے اپنے گرد و پیش اور دور دراز کے ممالک سے دوستی اور خیر سگالی کے، ہر پیمانہ اور گہرے تعلقات استوار کئے اور اس کی آڑ میں روسی انقلابی نظام لانے کا راستہ ہموار کرنے کے لئے ہر قسم کے سامراجی حربے بے دریغ استعمال کئے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

پانچ یورپی نوآبادیاں

کمیونسٹ یہ سمجھتے تھے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے لئے سب سے زیادہ سازگار فضا یورپ میں ہے۔ انہوں نے یورپ میں سوشلزم کی نشوونما سے بڑی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ لینن کی جانشینی کے ضمن میں سٹالن اور اس کے مخالفوں کے مابین جو امور اختلاف کا موجب بنے تھے ان میں سے ایک اہم مسئلہ یہ تھا کہ آیا سوشلزم کسی ایک ملک میں لایا جا سکتا ہے یا نہیں۔

اسٹالن کا نظریہ یہ تھا کہ اگرچہ سوشلزم صرف سوویٹ یونین میں قائم ہو سکتا ہے لیکن اس وقت تک کبھی محفوظ نہیں رہ سکتا جب تک کہ اسے اپنے گرد سرمایہ دارانہ حلقے سے حضرت لاحق ہوں۔ سوویٹ نظام اسی صورت میں محفوظ ہو سکتا ہے اور سوشلزم کی مکمل فتح کی ضمانت اسی صورت میں مل سکتی ہے جب دنیا کے صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ کئی ملکوں میں سوشلسٹ حکومتیں ہو جائیں۔[1]

اپنے گرد سرمایہ دارانہ حلقے میں سوویٹ نظام کے قیام کے لئے سوویٹ یونین کے ارباب حل و عقد نے کیا کیا؟ اس کی تفصیلات زیر نظر مختصر باب میں نہیں سما سکتیں۔ ہم سر دست نہ تو مکمل سوویٹ تسلط کے دو علاقوں (مشرقی جرمنی اور شمالی کوریا) کو زیر بحث لانا چاہتے ہیں اور نہ ہی دو ایسے ملکوں (یوگوسلاویہ اور البانیہ) کو بحث و تمحیص کا موضوع بنانا چاہتے ہیں۔ جہاں مقامی کمیونسٹوں کی حکومت قائم ہوئی۔ یہاں ہم صرف

ان پانچ یورپی نوآبادیوں کا تذکرہ کریں گے جہاں کمیونسٹ سوویٹ یونین کی کارروائیوں کی بدولت برسر اقتدار آئے یا کہیں جہاں آزاد ریاستوں کی کم از کم ظاہری شکل و صورت بحال رکھنے کی کوشش کی گئی۔ یہ پانچ نوآبادیاتی علاقے بالترتیب یہ ریاستیں ہوئے۔ چیکوسلواکیہ۔ ہنگری۔ رومانیہ اور بلغاریہ۔[2]

کمیونسٹ تسلط کا شکار ہونے سے پہلے ان پانچ ملکوں کے عوام باہمی مخاصمتوں کی بجائے باہمی یگانگت کے اعتبار سے زیادہ نمایاں تھے۔ پولینڈ، چیکوسلواکیہ اور بلغاریہ کے لوگ سلاوی گروپ کی زبانیں بولتے ہیں۔ رومانیہ کی زبان سلاوی زبان سے بہت قریب ہے۔ رومانیہ والوں کی زبان پر لاطینی اثرات غالب ہیں اور ہنگری والوں کی زبان یورپ کے کسی بھی ملک کی زبان سے مختلف ہے۔ پولینڈ، چیکوسلواکیہ اور ہنگری کے لوگ زیادہ تر کیتھولک مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ رومانیہ اور بلغاریہ کے آرتھوڈکس ہیں۔ جبکہ چیکوسلواکیہ اور ہنگری میں معقول پروٹسٹنٹ اقلیت اور بلغاریہ میں خاصی بڑی مسلم اقلیت ہے۔ ۱۹۴۵ء میں چیک علاقے نسبتاً معمول معیشت کے حامل تھے۔ پولینڈ اور ہنگری میں صنعت اور زراعت کو متوازی حیثیت حاصل تھی۔ چیکوسلواکیہ، رومانیہ اور بلغاریہ زرعی معیشت کے حامل تھے۔

۱۹۴۵ء سے پہلے مضبوط ترین کمیونسٹ پارٹی چیکوسلواکیہ میں قائم تھی۔ جیسے چیکوسلواکیہ کے قریباً ۳۰ فیصد محنت کش طبقے کی حمایت حاصل تھی۔ بلغاریہ کی کمیونسٹ پارٹی اگرچہ مختصر اور نشانہ ستم بنی ہوئی تھی لیکن روہری منظم اور اس کی قیادت جرأت دلیر اور جرأت مند تھی۔ باقی تین ممالک میں کمیونزم کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہ تھی۔[3]

کمیونسٹوں کا تسلط ——— تین مرحلے

ان پانچ ملکوں میں مختصر سے عرصہ یعنی ۱۹۴۵ء تا ۱۹۴۸ء کے درمیانی عرصے میں اقتدار پر قابض ہونے کے لئے کمیونسٹ تسلط تین مرحلوں میں ہوا۔ پہلے مرحلے میں وہ واقعی مخلوط حکومتیں قائم تھیں۔ جن میں غیر کمیونسٹ پارٹیوں کو حکومت کی آزادی، بڑی حد تک اظہار رائے کی آزادی اور اپنی پالیسیاں پیش کرنے کی آزادی تھی۔ دوسرے مرحلے میں واقعی مخلوط حکومتوں کی جگہ بوگس مخلوط حکومتیں قائم ہوئیں۔ جن میں غیر کمیونسٹ پارٹیوں کی پالیسیاں

---

[1] پیٹر کٹین، لینن، مترجمہ حبیب جالبی، ص ۹۲

toobaa-elibrary.blogspot.com

اور ایسے ان پارٹیوں کے اپنے افراد کی رضامندی کے بجائے کمیونسٹوں کی صوابدید کے تابع تھے۔ اور ان پارٹیوں کے کسی ترجمان کو کمیونسٹ پالیسی پر تنقید کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس مرحلے میں سوشلسٹ یا کسان پارٹیوں کے ایسے لیڈروں کو اعتقاد رائے کا اظہار کرنے یا حکومت کو باہر سے بلند تنقید کرنے کی عادت تھی جنہیں کمیونسٹوں کی تعلیم ہی ہم کے باعث خود اپنی پارٹیوں سے باہر نکال دیا گیا تھا۔ دوسرے مرحلے میں غیر کمیونسٹ پارٹیوں کے آثار و باقیات کو یا تو مکمل ختم کر دیا گیا یا کمیونسٹ پارٹی کی ذیلی تنظیم کی شکل دے دی گئی۔ اور حکومت سے باہر ہر قسم کی اپوزیشن کو کچل دیا گیا۔ پریس میں پہلے مرحلے کی نوعیت ہی ہیں تھی۔ ۱۹۴۵ء میں یہاں کمیونسٹوں اور معدودے چند واپس آنے والے یا روسی گماشتہ جلاوطنوں پر مشتمل جو کٹھ پتلی حکومت قائم کی گئی تھی وہ دوسرے مرحلے کی حکومت تھی۔ رومانیہ اور بلغاریہ میں پہلا مرحلہ ۱۹۴۵ء کے موسم بہار تک اور چیکوسلواکیہ میں فروری ۱۹۴۸ء تک جاری رہا۔ ۱۹۴۸ء کے آخر تک یہ پانچوں ملک تیسرے مرحلے میں داخل ہو چکے تھے۔[1]

کمیونسٹوں کی کامیابی کا راز اس کے علاوہ اور بہت سے عوامل پر بھی غور کیا جائے تو دو وجوہ بڑے نمایاں نظر آتے ہیں۔ اوّل یہ کہ انہوں نے سول اور ملٹری سیورٹی کے محکموں پر بڑے طریقے اور سلیقے سے اپنے آدمی بھرتی کرائے۔ ثانیاً انہوں نے پہلی حکومت کے افسروں اور اہل کاروں کو رشوت اور بلیک میل کے ذریعے اپنے مجبور بنا لیا۔ ان حربوں کے علاوہ جو مجبور بنانے والے انہوں نے بوسیس (بالخصوص سیکورٹی اور سراغ رسانی کے شعبوں) مسلح فوج (بالخصوص جنرل سٹاف میں جاسوسی کے شعبوں) اور (بالخصوص ریڈیو) پر حاصل توجہ دی۔ انہوں نے ایسی ایجنسیوں کے ذریعے بھی اپنے آدمی داخل کئے جو مخلوط حکومتوں کی متعلقہ پالیسی کے تحت قومی ملکیت میں لے لی گئی تھیں۔ مزدور تنظیمیں بھی انہیں تیزی سے دستیاب ہو گئیں۔ کمیونسٹوں کے کنٹرول میں تھیں مجموعی طور پر کمیونسٹ اپنے مخالفوں کی بہ نسبت اقتدار و اختیار کے حقائق اور حرکیات کو بہتر سمجھتے تھے۔ ان سب باتوں کے ماورا کمیونسٹ کو اگر قابض سوویٹ فوجوں کی امداد و اعانت حاصل نہ ہوتی تو انہیں اتنی جلدی کامیابی نصیب نہ ہوتی۔ کمیونسٹ صدر مائیکے ملکوں میں سے چار ممالک میں انہیں کوئی خاص عوامی حمایت حاصل نہ تھی۔

---

[1] حوالہ سابق ص ۹۶-۹۷

پانچ ملکوں میں جو جرمن تسلط سے آزادی کے بعد کسی حد تک مشترکہ افراتفری کی کیفیت رہی۔ اس عرصے میں سوویٹ فوج کے جوانوں اور ان کے سیاسی مشیروں نے کمیونسٹوں اور ان کے ہم مشربوں کو کلیدی عہدوں پر فائز کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ اور کمیونسٹوں کی پوزیشن مستحکم کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ غیر کمیونسٹ پارٹیوں کی مالی مدد کی گئی اور انہیں ایسے وسائل و ذرائع مہیا کئے گئے جن کی مدد سے وہ بعد ازاں جنگ بے یقینی کی کیفیت سے دوچار لوگوں کو ظہور پذیر کر سکیں۔ یا اپنا حامی و ہمدرد بنا سکیں۔ جمہوریت کے علمبرداروں کو دھونس اور دھاندلی سے ہموار کرنے کی کوشش کی گئی اور جو مخالف کسی طرح سے بھی قابو میں نہ آ سکا اسے جرموں کے سراسر من گھڑت الزامات اور فرضی مقدمات چلا کر نیست و نابود کر دیا گیا۔ پولینڈ میں انہوں نے قومی تحریک کے قائدین اور متوسط طبقہ کے رہنما کو بری طرح کچل دیا۔ رومانیہ میں فروری ۱۹۴۵ء میں سوویٹ وزیر خارجہ اے وائی وشنسکی نے شاہ مائیکل کو دھمکی دی کہ اگر انہوں نے سوویٹ حکومت کی رضامندی کے مطابق اپنی حکومت میں تبدیلیاں نہ کیں تو سوویٹ فوجیں ملک پر روائی کریں گی۔ چنانچہ رومانیہ میں ایک ایسی نمائندہ حکومت معرض وجود میں آ گئی۔ جو مکمل طور پر سوویٹوں کے کنٹرول میں تھی۔ اسی زمانہ میں بلغاریہ میں سوویٹ فوج کے حربیل نے کسان پارٹی (ایگریرین یونین) کو پے بقوں تر پس و دیہ قائد ڈاکٹر دمی۔ امیر و متروف کو پارٹی سے خارج کرنے پر مجبور کر دیا۔ ہنگری میں فروری ۱۹۴۵ء سوویٹ سیکوٹی فورس نے کسان پارٹی (سال خارجہ پارٹی) کے ممتاز لیڈر بیلا کوواکس کو گرفتار کر لیا اور جلاوطن کر دیا۔ یہی کچھ دیگر رومانیہ بلغاریہ۔ پولینڈ اور ہنگری میں یہ اقدامات کمیونسٹوں کی حیثیت مستحکم کرنے میں بڑے مدد و معاون ثابت ہوئے۔

چیکوسلواکیہ کا معاملہ کچھ زیادہ پیچیدہ رہا۔ وہاں سوویٹ فوج نے کمیونسٹوں کو نہ تو اور ۱۹۴۵ء میں آزاد کیا تھا۔ لیکن اس کے بعد سوویٹ فوج وہاں سے چلی گئی تھی۔ ۱۹۴۶ء میں آزاد اور پرامن الیکشن جو ممکن کمیونسٹ سے بہت زیادہ طاقت ور ثابت ہوئے۔ انہوں نے جائز طریقے سے جمہوری اسٹیٹ حاصل کر لی تھی۔ ۱۹۴۸ء میں اس کا طرز عمل حالی حذب آئیں رہا۔ چیکوسلواکیہ تیزی سے جمہوری اسٹیٹ سے کمیونسٹ اسٹیٹ بن گیا۔ فروری ۱۹۴۸ء میں وہ حالات جنہوں نے بحران پیدا کر کے حکومت پر قبضہ کا راستہ کیا اس کے لئے

---

[1] حوالہ سابق ص ۹۰-۹۸

toobaa-elibrary.blogspot.com

ایک مسلح [illegible] جلاس ہوئے [illegible] میں [illegible] ہونے [illegible] امید تھی [illegible] وجہ عام [illegible] اقتدار کی صورت حال [illegible] اس [illegible] میں کمیونسٹوں کے [illegible] سے [illegible] تبدیلی [illegible] جن سے کمیونسٹوں کو سوشل ڈیموکریٹک پارٹی پر تسلط [illegible] حاصل [illegible] اس کے بعد انہوں نے [illegible] طاقت [illegible] کھڑا کر کے صدر مملکت ایڈورڈ بنیش کو مجبور کیا کہ وہ [illegible] سے [illegible] حکومت قائم کرے۔ [illegible] کمرن کے دوران سوویٹ نائب وزراء جو [illegible] رہے [illegible] ہوتے [illegible] سکو کے ستارے [illegible] تھا [illegible] بڑے بڑے شہروں میں کمیونسٹوں نے [illegible] مسلح [illegible] سیکورٹی پولیس پر ان کی گرفت پہلے ہی سے مضبوط تھی اس سے انہوں نے [illegible] اٹھایا اس [illegible] کو نیم انقلابی اور نیم [illegible] کہا جا سکتا ہے اس کی کامیابی کی ایک وجہ تو خود کمیونسٹوں کی کوششیں تھیں [illegible] دوسری وجہ روس کی امداد اور رہنمائی تھی۔ جو ۱۹۴۵ء اور اس کے بعد بھی جاری رہی۔[1]

سوویٹ طرز کا سیاسی نظام

ان پانچ ملکوں میں جو سیاسی نظام قائم ہوا وہ سوویٹ یونین کی ہو بہو نقل تھا۔ نئی حکومتوں کو سوشلسٹ [illegible] پبلک کی جگہ "عوامی جمہوریت" کا نام دیا گیا۔ کمیونسٹ ابھی حکومت اور اقتدار پر قابض ہوئے [illegible] تعمیر کا کام ابھی باقی تھا۔ لیکن نام کے اس فرق کے باوجود ان ملکوں میں کمیونسٹ پارٹیاں اختیارات [illegible] بالکل اسی انداز سے برتتی تھیں جس طرح سوویٹ یونین میں اشتراکی ڈھانچہ بھی اسی ڈھنگ پر بنایا گیا تھا [illegible] کی مجلسیں، قانون ساز اسمبلیاں، عام ہیورو [illegible] سب [illegible] پارٹی کی تابع تھیں اس بھرپور کنٹرول کا ذریعہ وہ پارٹی ممبر تھے جو [illegible] اداروں میں اہم عہدوں پر [illegible] ہوئے تھے۔ فوج اور پولیس کی [illegible] کمیونسٹوں کے ہاتھوں میں تھی۔ پریس، کتابیں اور ریڈیو پارٹی کے لیے پروپیگنڈے کا [illegible] بنے ہوئے تھے۔ ان کی وساطت سے پوری آبادی کو کمیونزم گھول کر پلایا جاتا تھا۔ بچوں کو اپنے والدین سے برگشتہ کرنے اور ان کے ذہن اشتراکی نظریات کے مطابق ڈھالنے کے لیے سکول بہترین سیاسی ہتھیار ثابت ہوئے۔ عیسائی فرقوں اور اسلام کے بانیوں کو تمسخر بنا دیا گیا۔ مذہبی رسم اور [illegible] دینے کی اگرچہ اجازت تھی لیکن تعلیمی، اداروں سے مذہبی اثرات کو یکسر خارج کر دیا گیا۔ بالغ شہریوں کو [illegible]

---

[1] حوالہ سابق ۹۸-۹۹

[illegible] پیدا کرنے کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے گئے۔ اور ایسے حالات پیدا کر دئے گئے۔ [illegible] لوگوں کے لئے اپنے [illegible] کی بڑی مشکل ہو گئی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر [illegible] پر یہ الزام لگائے جاتے تھے۔ کہ وہ کمیونسٹ نظام کے خلاف [illegible] سی سرگرمیوں میں مصروف ہیں بلکہ برسر اقتدار طبقے [illegible] انہیں مزدور کیمپوں میں کی مشقت کی گئی۔ پھر ایسے بھی تھے [illegible] ان کے مذہبی عہدوں سے ہٹایا گیا۔ پھر یا تو نظر بند ہوئے یا گرفتاری کے مستحق ٹھہرے۔[1]

کمیونسٹوں نے مرکزی معاشی منصوبہ بندی کی طرح ڈالی جس کی [illegible] انہوں نے سوویٹ تجربے پر کھول [illegible] صنعتوں کو تقدم کا شرف ملا۔ ان کا بوجھ اٹھانے کے لئے مزدوروں اور کسانوں کو مجبور کیا گیا۔ کہ وہ [illegible] معمولی اجرتوں پر کام کریں۔ مزدور تنظیمیں صنعتوں کے لئے افرادی قوت حاصل کرنے اور [illegible] میں نظم و ضبط پیدا کرنے کی ذمہ دار تھیں۔ ان کی تنظیم و تشکیل اس طرح عمل میں لائی گئی [illegible] وہ حکومت کے [illegible] کے حقوق و مفادات کا تحفظ کرنے کے بجائے آجروں کے مفادات کی [illegible] [illegible] مزدوروں کی فلاح و بہبود کے لئے بڑا جامع انقشہ سنایا گیا لیکن اس کی عملی قدر و قیمت کمیونسٹ پارٹی کے فیصلے پر منحصر تھی وہاں پٹے کرتی تھی کس وقت مزدوروں کو کتنی [illegible] پائی جاتی ہیں کبھی یہ ہوتا کہ پارٹی فیاضی کے [illegible] کر لیتی اور کئی مادی سہولتیں مزدوروں کو [illegible] کبھی یہ ہوتا کہ وہ مزدوروں پر زور دیتی کہ کس [illegible] اور سنگین حالات میں بھی جان توڑ کر کام کریں۔ [illegible] سوا ہی نہیں اٹھتا تھا کہ ٹریڈ یونینوں یا پارٹی کے لیڈروں پر [illegible] کسی قسم کا تحفظ حاصل ہو۔ کسان [illegible] صنعتوں کے فروغ کے لئے اپنا حصہ اس طرح ادا کرتے تھے کہ [illegible] کی پیداوار کی [illegible] [illegible] حکومت کے حوالے کرنے پر مجبور تھے اس کی قیمت انہیں ملتی تھی وہ [illegible] ہوتی تھی بعد میں حکومت ان چیزوں کو [illegible] کے ہاتھوں بہت زیادہ نفع لے کر فروخت کرتی تھی۔ ۱۹۴۹ء اور اس کے بعد کسان [illegible] پر دباؤ اور بھی بڑھا کر وہ اجتماعی کھیتوں میں شریک ہو جائیں اس مقصد کے حصول کے لئے طرح طرح کے [illegible] آزمائے گئے۔ ان میں قیمتی ٹیکسوں سے لے کر جسمانی طاقت کا استعمال اور [illegible] کسانوں کی گرفتاری تک شامل تھے۔ اجتماعیت کے میدان میں ترقی کی رفتار بلغاریہ میں سب سے تیز اور رومانیہ میں سب سے سست رہی۔[2]

---

[1] حوالہ سابق ص ۹۹-۹۹

[2] " " " ۱۰۰-۱۰۱

toobaa-elibrary.blogspot.com

قوم پرستوں کی تطہیر اور نوآبادیاتی استحصال

پانچ ملکوں کے عوام زبردست پر کمیونسٹ حکومتوں کی رعیت بن گئے تھے

سوویٹ نظام حکومت کی نقل تھیں بلکہ ان کے ملکوں پر سوویٹ یونین کا تسلط بھی قائم ہو گیا۔ وہ سوویٹ یونین کی سب سامراجی غرض و مقصد سے کھوٹ کھسوٹ کا شکار ہو گئے۔ ان کے ملکوں کی مالی و اقتصادی پالیسیاں ان کے حکمرانوں کے بجائے سوویٹ یونین کے ریزیڈنٹ آگئے تھے۔ ان میں سوویٹ ایجنٹ مقرر ہوتے تھے جنہیں وسیع اختیارات حاصل تھے جہاں وہ ضرورت سمجھتے بلا روک ٹوک مداخلت کر سکتے تھے۔ ان مشیروں میں سے بعض روسی تھے باقی وہ سوویٹ شہری تھے جو متعلقہ ملکوں میں پیدا ہوئے تھے۔ مثال کے طور پر ایسے مشیروں میں شامل تھے جو پولینڈ کی جلاوطنی کی زندگی کے تیس برس سوویٹ یونین میں گزار چکے تھے۔ سب سے نمایاں مثال کانسٹنٹن زدانوسوسکی کی ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں وہ سرخ فوج کا اعلیٰ دست فوجی افسر تھا۔ اس کے ماں باپ پولش تھے۔ ۱۹۴۹ء میں اسے پولینڈ کی وزارت دفاع سونپی گئی۔ اور وہ پولش کمیونسٹ پارٹی کے پولٹ بیورو کا ممبر بن گیا۔ خود کمیونسٹ پارٹیاں ان ملکوں میں سی آئی ایس یا سوویٹ یونین کی کمیونسٹ پارٹی کے نمونے پر تھی تھیں۔ ان کی تنظیم وہی تھی۔ کارکنوں کی تربیت کا انداز بھی وہی تھا۔ ان کے ضابطے بھی سی۔ پی۔ ایس۔ یو کے ضابطے کا غلط ربط تھے۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی کے آغاز میں شخصیت پرستی کا مسلک پی تھا پر ہر کمیونسٹ پارٹی کا اپنا علیحدہ چھوٹا سا ستالن تھا۔ چیکوسلوواکیہ میں کلیمنٹ گوٹوالڈ سکریٹری جنرل پولٹ بیورو کا ممبر تھا۔ ہنگری میں ماتیاس راکوسی کا یہی رتبہ تھا۔ رومانیہ میں جارج جیوجیو ڈیج سب کا بھی رتبہ تھا۔ ماسکو کی ہدایت پر پارٹیوں کو "صفائی" بھی کرنی پڑتی تھی۔ ۱۹۴۸ء میں سوویٹ ڈریکٹو سلاف میسونوں نے یوگوسلاویہ کو کمیونسٹ فارم سے مارشل ٹیٹو کو مسترد کر دیا۔ اس کے بعد ہر کمیونسٹ پارٹی میں بھی قوم پرستانہ رجحانات کی سرکوبی کے لئے صفائی شروع ہوئی۔ ایسے آدمیوں کا انتخاب کیا گیا جن کے سر پر اس انحراف کا الزام رکھا جا سکے۔ ہنگری میں راجک، بلغاریہ میں کوسٹوف، چیکوسلواکیہ میں کلیمنٹس روزانسکی اور پولینڈ میں گومولکا قربانی کے بکرے بنے۔ پہلے چار قتل کر دیئے گئے۔ گومولکا خوش قسمت تھا کہ اسے اپنے عہدے سے برطرف کیا گیا اور کچھ مدت تک نسبتاً گوارا حالات میں گزارنا پڑا۔ اول الذکر چاروں شخصیات کے خلاف جھوٹے مقدمات، کذب و افترا اور نیم حقائق کا جو عبرت انگیز تار و پود بنا گیا اس سے یہ انصاف ظاہر ہوتا تھا کہ ان بیگناہ صرف یہ تھا کہ انہوں نے اپنے ملکوں میں سوویٹ تسلط و غلبہ

کی مخالفت کی تھی یا اسے بدرجہ تنقید برتا تھا۔ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۰ء میں قوم پرستوں کی صفائیاں ہوئیں۔ ۱۹۵۰ء میں صفائی کا سلسلہ البانیہ، چیکوسلواکیہ اور ہنگری میں بڑی سختیاں ہوئیں۔ صفائی کی آفت میں لوگوں کے سر پر آئی ان میں یہودی بڑی تعداد میں شامل تھے۔ ان پر قیامت خاص طور پر اس لئے ٹوٹی تھی کہ یہودی دشمن تحریک کی زد میں آ گئے تھے جو سٹالن کی زندگی کے آخری سال میں سوویٹ یونین میں چلی تھی۔ اس دور کا سب سے نمایاں ستم رسیدہ چیکوسلواکیہ کا کمیونسٹ پارٹی کے سیکریٹری جنرل رودلف سلانسکی تھا۔ ۱۹۴۹ء اور ۱۹۵۳ء کے درمیانی عرصے میں چیکوسلواکیہ اور ہنگری کی کمیونسٹ پارٹیوں کی سنٹرل کمیٹیوں کے نصف سے زیادہ ارکان غائب کر دیئے گئے تھے۔

مشرقی یورپ میں سوویٹ یونین کی متذکرہ پانچ نوآبادیات میں جو اقتصادی منصوبے بروئے کار لائے گئے ان کا مقصد یہ تھا کہ ہر ملک صنعت کے ہر شعبے میں زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہر ملک سوویٹ یونین کا زیادہ تر انحصار عملی طور پر سوویٹ یونین پر ہو۔ بعض صنعتوں کی منصوبہ خیز حد تک حوصلہ شکنی کی گئی۔ کئی ایسی صنعتیں قائم کی گئیں جن کے لئے حالات اور فضا سازگار نہیں تھے۔ مثال کے طور پر کئی صنعتوں کے لئے روس کی کل قیمت مشینری یا عام مال پر انحصار کرنا پڑتا اور اس طرح سے ان صنعتوں سے جو پیداوار حاصل ہوتی وہ اس قسم کی بیرونی یا تاقی پیداواری صلاحیت کی ممالک کی بنی ہوئی چیزوں سے کئی گنا مہنگی پڑتی۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ان ملکوں میں ایسی صنعتیں قائم کی جاتیں جن کے لئے مقامی خام مال یا مقامی محنت کشوں کی صلاحیتوں یا مقامی وسائل سے فائدہ اٹھایا جا سکتا لیکن کسی نوآبادی میں محنت کشوں کی تخصیص یا مقامی انداز میں سوچنے کا رجحان ستالن کے لئے کسی صورت میں قابل قبول نہیں تھا۔ وہ اپنے ان نوآبادیاتی ملکوں کو ایک دوسرے سے محنت کشوں خام مال یا ذرائع مواصلات سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دینے پر بھی آمادہ نہیں تھا کیونکہ اسے خدشہ تھا کہ اس طرح رابطہ بڑھے گا یہ ملک ایک دوسرے کے بہت قریب آ جائیں گے اگر وہ اپنی اقتصادی ضروریات باہمی تشارک و تعاون سے پوری کرنے لگے تو ان پر سوویٹ یونین کی گرفت کمزور پڑ سکتی ہے اگر ان کا روس پر انحصار نہیں ہو گا تو وہ کسی وقت بھی سوویٹ حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے

ص ۱۰۲ تا ۱۳۷

toobaa-elibrary.blogspot.com

مستقل وطنیت یہ تھا کہ ۱۹۴۰ء کے عشرے میں وسطی ایشیا کی ریاستوں کی طرح مشرقی یورپ کی نوآبادیات کو بھی ایک دوسرے سے الگ رکھا جائے اور ان کا تعلق صرف ماسکو سے قائم ہو۔ سوویٹ یونین کے ساتھ ان نوآبادیات سے سوویٹ یونین کو جو مال بھیجا جاتا اس کے انتہائی کم دام دیے جاتے۔ اس کے برعکس روسی مال کی بہت زیادہ قیمت وصول کی جاتی۔ اس سلسلہ میں پولینڈ کے کوئلہ کی تجارت خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ ۱۹۴۵ء میں ڈنمارک سے پولینڈ کا کوئلہ جس بھاؤ خریدے کی جاتی تھی اس سے دگنی قیمت پر کوئلہ خریدنے پر بھی ڈنمارک کی مشکل سے ہی کوئلہ فراہم کرنے کے لئے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ بلغاریہ کا خاص عطر۔ گلاب۔ سوویٹ یونین نے انتہائی کم قیمت پر خرید۔ اور پھر سوویٹ حکومت نے یہی عطر دنیا کی منڈیوں میں فروخت کر کے بے حساب نفع کمایا۔ ان ملکوں کی صنعتی ترقی میں سوویٹ یونین کا حصہ صرف وہ کارخانے تھے جو سوویٹ حکومت نے جرمنوں کی ملکیت قرار دے کر ضبط کر لئے تھے ہنگری اور رومانیہ کی حکومتوں نے بھی کچھ کارخانے لگائے۔ کارخانوں کے مطالعہ سے جو پیچیدگیاں قائم ہوئیں ان کے اغراض و مقاصد یہ تھے کہ وہ دونوں ملکوں کے مفاد کو محفوظ رکھیں گی۔ لیکن درحقیقت اس کا کنٹرول سوویٹ ہاتھوں میں تھا۔ اور سوویٹ حکومت نے جو منظم کیا تھا کہ اسے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچایا جائے۔ ان نوآبادیات میں دو ملکوں کی ایئر لائنز رومانیہ میں تعمیراتی لکڑی اور تیل اور ہنگری میں بکسائٹ ایلومینیم کے وسائل بھی تھے اور سوویٹ یونین نے ان سے خوب استفادہ کیا۔ سٹالن کی زندگی کے آخری برسوں میں مشرقی یورپ کے ملکوں پر سوویٹ یونین کے اقتصادی تسلط کو معروضاً مارکسی اصطلاح میں — نوآبادیاتی استحصال — ہی کہا جا سکتا ہے۔

○

چیکوسلواکیہ کی گوشمالی

لندن کی دوستی و آشنائی خصوصاً چیکوسلواکیہ اور خبر اطمینانی کے لحاظ سے اس کے قریب معاملے کے ساتھ اس کے تعلقات کی نوعیت کا چیکوسلواکیہ کے حالات کے آئینے میں بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایک طویل عرصے تک روس کی کشف برداری کرنے کے بعد جب یہاں کے لوگوں نے اس دوست کا بھیڑیئے کی خون آشامی سے کھیلا

کر اس کے خلاف آواز بلند کی تو روس نے اسے خاموش کرنے کے لئے نہ صرف یہ کہ دوستانہ روابط منقطع کر دیئے بلکہ اپنی جارحانہ خونخواری اور درندگی کا ایسا مظاہرہ کیا کہ کوئی بدترین دشمن بھی اس پر قدم کرنے سے پہلے ہچکچاتا۔

گزشتہ عشرہ کے آخری برسوں میں چیکوسلواکیہ میں اصلاحات کے لئے دباؤ محسوس ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس کے واضح آثار اس وقت ظاہر ہوئے جب سلاوی کمیونسٹوں نے برنو کی حکومت کی غیر معمولی مرکزیت کی شدید مخالفت کا اظہار کرنا شروع کیا۔ اس سلسلے میں راہنما زیومین ہی نفرت کا مرکز بن گئی۔ اسی اثنا میں اقتصادی صورت حال بھی ابتری کا شکار ہو گئی۔ نوکر شاہی کی استبدادی مسلط ہو جانے سے زیادہ مرکزیت کی حامل تھی کے مضر نتائج بھی ظاہر ہونے لگے۔ اقتصادی اصلاحات کی ضرورت کو اگرچہ اصولی طور پر تسلیم کر لیا گیا لیکن انہیں برسرِ کار لانے کی جانب کوئی توجہ نہ دی گئی۔

اصلاحات کے علمبردار اس سلسلہ میں یہ دلیل دیتے تھے کہ سیاسی اصلاحات کے بغیر اقتصادی اصلاحات نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوں گی۔ یہ تمام دباؤ ۱۹۶۶ء کے موسم سرما میں کمیونسٹ پارٹی کے اندر اس اصلاحی صورت اختیار کر گیا۔ پارٹی کے سربراہ اشوٹن نووٹنی کو الگ کر دیا جائے۔ جنوری ۱۹۶۸ء میں اس کی جگہ نسبتاً معروف سلاوی کمیونسٹ الیگزینڈر دوبچیک نے لے لی۔ آئندہ چند ماہ کے دوران جمہوری آزادی کو کافی تقویت پہنچی۔ اس تحریک میں دانشور پیش پیش تھے لیکن صنعت کاروں نے بھی سرگرمی سے حصہ لیا۔ سنسر شپ کا خاتمہ ہو گیا۔ گزشتہ دور کے چند متعلق منظرِ عام پر آ گئے۔ اور ماضی میں چیک اور سلاوی اقوام کی تاریخ کا جو حلیہ بگاڑا گیا تھا اس کا ازالہ کیا گیا۔ کمیونسٹ پارٹی کی سی کانگریس کی تیاریاں کی گئیں اور یہ صاف نظر آنے لگا کہ اس کانگریس میں ماضی کے لیڈر نظر انداز کر دیئے جائیں گے۔ دن کی جگہ جمہوری نقطہ نظر لے لیں گے۔ اس سے پہلے سنسر شپ کی تجویز کس نے پیش کی اور اس کی کس کو معلوم نہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ کہا گیا۔ اس سے اگرچہ تنقید پر کوئی اختراض نہیں کیا مگر یہ یقین دلانے میں بھی کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا کہ کمیونسٹ پارٹی سیاسی اقتدار کی اجارہ داری برقرار رکھے گی اور چیکوسلواکیہ سوویٹ یونین کے ساتھ اپنے اتحاد کا وفادار رہے گا۔[1]

---

[1] نیا سلاوی ص ۱۵۶-۱۵۷، مصنفہ ہاپوں اوسبرن

toobaa-elibrary.blogspot.com

اگر سوویٹ لیڈروں کو بنیادی طور پر سوشلزم کے مفادات سے دلچسپی ہوتی تو یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ وہ حالات کو اپنا رخ اختیار کرنے کی اجازت دیتے اور چیکو سلاوی باشندوں کے اس روایتی امتیاز پر اعتماد کر لیتے کہ روس ان کا بہترین دوست ہے۔ چیکو سلواکیہ، اور باقی یورپ کے مغربی ذہن کے کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کا بھی یہی خیال تھا۔ کہ سوویٹ لیڈر چیکو سلواکیہ پر اعتماد کریں گے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ سوویٹ لیڈروں کی اولین ترجیح کچھ اور تھی اور وہ تھی سوویٹ ایمپائر اور مطلق العنان حکمرانی۔ انہیں یہ خطرہ تھا کہ چیکو سلاوی کمیونسٹ پارٹی ان کے قابو میں نہیں رہے گی۔ انہوں نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ چیکو سلواکیہ میں حکومت کی اجازت سے غیر کمیونسٹ سیاسی تنظیمیں قائم ہو رہی ہیں۔ انہیں یہ خطرہ تھا کہ اگر کمیونسٹوں کے ہاتھوں سے اس اقتدار نکل گیا تو حکومت خواہ اس کی قیادت رسمی طور پر کمیونسٹوں کے ہاتھ میں کیوں نہ ہو۔ سوویٹ یونین کے ساتھ اتحاد و اشتراک قائم نہیں رکھے گی۔ غیر جانب داری کے نعرے پہلے ہی لگنے شروع ہو گئے تھے۔ اگرچہ یہ نعرے ایسے افراد کی طرف سے لگائے جا رہے تھے جن کی پشت پر کوئی منظم جماعت نہیں تھی۔ انہیں یہ بھی خطرہ تھا کہ چیکو سلواکیہ میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے اثرات دوسرے ہمسایہ ملکوں پر بھی پڑیں گے۔ اس سلسلہ میں پولینڈ اور مشرقی جرمنی کے خوفزدہ حکمران سوویٹ لیڈروں کے ہمسائے تھے۔ اسی سال موسم بہار اور اوائل گرمی میں پولینڈ اور مشرقی جرمنی کے سفارتی نمائندوں اور اخبارات نے چیکو سلواکیہ کے خلاف خاصی خفگی اور برہمی کا اظہار کیا۔ سب سے زیادہ اشتعال انگیز حملے ماسکو کی طرف سے ہوئے۔ چیکو سلواکیہ کے لوگ جتنے قوم پرست بنتے جاتے تھے۔ دوبچک اور اس کے رفقاء کے لئے لوگوں کے ضبط و تحمل کی تلقین کرنے میں اتنی ہی زیادہ الجھن ہوتی تھی۔ جولائی ۱۹۶۸ء میں سوویٹ اور چیکو سلاوی کمیونسٹ پارٹیوں کے پولٹ بیورو کے ارکان کا ایک اجلاس مشرقی سلواکیہ میں ہوا۔ اس کے چند روز بعد پولینڈ، مشرقی جرمنی، ہنگری، بلغاریہ اور سوویٹ یونین کی کمیونسٹ پارٹیوں کے لیڈر برتسلاوا میں جمع ہوئے۔ یہ ملاقات اگرچہ خاصے ناخوشگوار رہے لیکن یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی سمجھوتہ ہو گیا ہے۔ بہرکیف شاید سوویٹ لیڈروں کو یقین ہو گیا کہ دوبچک نے اپنے وعدے کا پاس نہیں کیا یا شاید وہ خود ہی اپنے وعدوں پر قائم نہیں رہنا چاہتے تھے۔ بہرحال بدقسمتی سے انہوں نے چیکو سلواکیہ پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ فوجی تیاریاں پہلے ہی مکمل ہو چکی تھیں اور ۲۱ اگست ۱۹۶۸ء کو ایک کثیر فوج نے (جس میں پولینڈ، مشرقی جرمنی، بلغاریہ اور ہنگری کے فوجی دستے بھی شامل تھے) چند گھنٹوں میں پورے ملک پر قبضہ کر لیا۔ دوبچک کی حکومت نے مسلح مزاحمت نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہر کیف اس کے بعد ہر کیف وسیع پیمانے پر ہوائی مزاحمت ہوئی جس میں چیکو سلاوی فوج نے عوامی طاقت کی امداد سے عوامی تحریک مزاحمت کو نشو و نما بخشی۔ سوویٹ لیڈر اس صورت حال سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ وسیع پیمانے پر خون ریزی کا خطرہ مول لینے کے لئے بھی تیار نہ تھے۔ چنانچہ دوبچک اور اس کے رفقاء کو (جنہیں حملہ کے ابتدائی مرحلہ میں ہی گرفتار کر لیا گیا تھا اور بڑے وحشیانہ سلوک سے دوچار کیا گیا تھا) رہا کر کے دوبارہ زمام اقتدار سنبھالنے کا موقعہ دینے میں ہی عافیت سمجھی۔ اس کے بعد سوویٹ حکومت نے دو سال کی تخریب و سازش اور دباؤ کے ذریعے چیکو سلواکیہ کی کمیونسٹ پارٹی میں پھوٹ ڈالی۔ اس کے انتہائی سرگرم ارکان کو بیدخل کر دیا گیا ہزاروں چیک باشندوں کو جلاوطن کر دیا گیا۔ سینکڑوں افسروں اور اعلیٰ کارکنوں کو ملازمتوں سے الگ کر دیا گیا اور پورے ملک پر ہر اس اور وحشت طاری کر دی گئی۔ ۱۹۷۰ء کے آخر تک سنسر کی پابندیاں پوری سختی سے عائد کر دی گئیں۔ تاریخ پھر مسخ ہونے لگی۔ افتادات پھر پرانے دور کے جھوٹ گھڑنے پر مجبور ہو گئے۔ [illegible] کی خوشامد پھر روزمرہ کا معمول بن گئی۔[1]

چیکو سلواکیہ پر حملہ ایک پرانے نظریہ کی تجدید کا موجب بنا۔ سٹالن نے کہا تھا کہ تمام کمیونسٹوں کا اولین فریضہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سوویٹ یونین کی حفاظت کو مقدم سمجھیں۔ برزنیف نے یہ اعلان کیا کہ سوشلزم کو جب کبھی خطرہ لاحق ہو تو تمام سوشلسٹ ملکوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اس سوشلسٹ حکومت کی امداد کریں جسے خطرہ لاحق ہوا ہے اور کسی امداد نے کسی سنہ حایل کا انتظار نہیں کرنا چاہیے بلکہ سوشلسٹ ملکوں کو از خود حرکت میں آ جانا چاہئے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ سوویٹ حکومت کسی وقت بھی اپنی فوج یا مشرقی یورپ کے ملکوں کی فوجیں کو کسی ایسے کمیونسٹ ملک پر حملہ کرنے کا حکم دے سکتی ہے جس کی پالیسیاں سوویٹ یونین کو پسند نہ ہوں کیونکہ یہ ملک تو بہرحال سوویٹ یونین ہی رہے گی۔ اس طرح سوشلزم کو خطرہ لاحق ہوا ہے۔[2]

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ وسطی یورپ میں ۱۹۷۰ء تک ایک سوویٹ ایمپائر معرض وجود میں آ چکی تھی۔ اس ایمپائر کے خلاف شدید نفرت پائی جاتی ہے۔ اور نفرت کرنے والوں میں تمام محکوم اقوام کی کمیونسٹ

---

[1] [illegible] [2] ایضاً ص ۱۵۸، ۱۵۹

toobaa-elibrary.blogspot.com

پارٹیوں کے کئی ارکان بھی شامل ہیں جبکہ قوم کو روسیوں سے واقعی محبت تھی لیکن ۱۹۶۸ء کے سانحے نے اس محبت کو نفرت میں بدل دیا۔ سوویٹ لیڈر ۱۹۴۵ء کے بعد اگر مشرقی یورپ میں کسی وقت بھی محض بالادست پوزیشن حاصل کرنا چاہتے تو وہ صرف مغربی ثقافتوں جیسے علاوہ عملی یورپی اقوام کی رضامندی سے بھی ایسا کر سکتے تھے۔ لیکن سوویٹ لیڈروں کو یہ روایتی سامراجی پوزیشن مطلوب نہیں تھی وہ پیش قدم آگے جانا چاہتے تھے وہ ان علاقوں کی قوم کا استحصال کرنا چاہتے تھے ان کی قومی تذلیل کے درپے تھے اور ان کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنانا چاہتے تھے ان کی تاریخ کو مسخ کرنے ان کی تہذیب و ثقافت اور ان کی قومیت تباہ کرنے پر تسکین و مسرت محسوس کرتے تھے سوویٹ پالیسی قدیم سامراجیت سے بھی بدتر ہے۔ انگریز اور فرانسیسیوں کے سامراج سے بھی بدتر ہے۔ انگریز اور فرانسیسی اپنے محکوموں کو دوسرے درجہ کے شہری متصور کرتے تھے لیکن انہوں نے اپنے محکوموں کا کوئی تخصص ختم کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی اس کے برخلاف روس کا نیا سامراج مفتوح اقوام میں ان کی قومی خودی کی روح کو بھی برداشت نہیں کرتا ہے۔

ایران میں اثر و نفوذ

حکوم قوموں کے استحصال زیردستوں پر ظلم و ستم، محکموں کے بنیادی انسانی حقوق کی پامالی، شہری آزادیوں پر پہروں، جبر و استبداد الغرض کسی بھی اعتبار سے پرکھا جائے۔ سوویٹ یونین ایک استعماری و سامراجی طاقت نظر آتی ہے۔ یہ سوویٹ امپیریلزم "سرخ سامراج" یا "سوشل سامراج" ہر لحاظ سے سامراج کی ایک جدید ارتقائی شکل ہے کہ ایک سفید فام روسی قوم انقلابیت اور اشتراکیت (سوشلزم اور کمیونزم) کے نام پر دوسری اقوام کی جمہوری امنگوں اور قومی آرزوؤں سے بےنیاز اور بسا اوقات ان کی دشمنی اور دوستی کے ذریعے اپنے تسلط و تغلب کو فروغ دیتی ہے۔ اس کی ترکش کا تازہ کارگر تیر سوشلزم اور کمیونزم ہے اور کسی مؤثر تر ہتھیار کے ذریعے وہ ساری دنیا پر چھا جانے کے دیرینہ خواب کی تکمیل کرتی رہی ہے۔ اسے اگر اپنے وسیع تر مفادات اور مستقبل کی اغراض کے لئے دنیا کے بعض علاقوں میں قومی آزادی کی خواہشوں کو ختم کرنے کے لئے اپنے نظریات اور اصولوں میں ترمیم بھی کرنی پڑے تو وہ سے بھی گریز نہیں کرتی اور اسلامی سوشلزم یا عرب سوشلزم یا کسی اور قومی سوشلزم کا نعرہ بھی قبول کر لیتی ہے۔ اور اسے مارکسزم اور لینن کے اصولوں کے منافی قرار نہیں دیتی۔ ایران میں مارکسی اسلام یا اسلامی مارکسزم بھی اسی توسیع پسندی کی ایک کڑی تھی۔

مغرب نواز خود مختار ملکوں میں روس ایک زوردار پروپیگنڈے سے وہاں کے حکمرانوں کو بدنام کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان ملکوں کے ایسے تاجر جن کے امریکہ یا مغربی ملکوں کے ساتھ کاروباری روابط ہوتے ہیں۔ انہیں رجعت پسند اور امریکی اور مغربی سامراج کے کارندے قرار دیا جاتا ہے۔ جو لوگ مغربی کاروباری مفادات کا مقابلہ کرتے ہیں انہیں "مقامی بورژوا" کے لقب سے نوازا جاتا ہے۔ سوویٹ لیڈروں کے نزدیک معیار محض ان ملکوں کی خارجہ پالیسی ہے وہ ان ملکوں کے مقامی حکمرانوں، تاجروں اور صنعت کاروں کے ماضی اور دوسرے تمام امتیازات (اشخاص میں عزت و وقار کا فرق و امتیاز نیز اس امر کا لحاظ کہ ان میں سے اپنی رعایا اور محصنہ کشوں یا تماشوں کے ساتھ اچھا سلوک کون کرتا ہے یا برا سلوک کس کا ہے) یکسر نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں اور یہ کہا جاتا ہے کہ ان ملکوں میں امریکی پالیسی کی وجہ سے آمریت قائم ہو گئی ہے۔ بہرکیف اگر کسی ملک میں واقعی آمریت کا دور ہو اور امریکہ اس کی مخالفت کا اظہار کرے تو اسے سامراجی مداخلت کا نام دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ڈیسز و یلا میں جنرل پیریز جیمنز کے نظام کو امریکہ سے منسوب کیا گیا لیکن جب ۱۹۴۶ء میں امریکی سفیر متعینہ بولیویا آنریبل آسر مطلق جان پیرون پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی تو اسے، ارجنٹائن کے معاملات میں امریکی مداخلت کا نام دیا گیا۔ جب جنرل پیریز کا تختہ الٹ دیا گیا تو ابتداً کمیونسٹ بڑے خوش ہوئے لیکن جب جمہوری پارٹی کے قائد رمولو بٹیان کورت صدر بنا اور امریکہ کے ساتھ دوستی کی پالیسی اختیار کی نیز کمیونسٹوں کی سرگرمیوں میں جمہوریت کی سرحدبندی کا اہتمام کیا تو اسکو لے سامراجی ٹھوکر قرار دیتے ہوئے اس کی مذمت کی۔[1]

دوسری عالمگیر جنگ کے خاتمے پر سوویٹ یونین وہ واحد بڑی طاقت تھی جس کی حدود میں توسیع ہوئی مغربی یورپی سامراجی سلطنتوں اور امریکہ نے (طیبائن میں) اربیا کی ساتھ کروڑ آبادی کو آزادی سے ہمکنار کیا لیکن سوویٹ یونین نے اپنی فتوحات کے علاوہ مشرقی یورپ کے دس کروڑ باشندوں پر تسلط و تغلب حاصل کر لیا۔ ۱۹۴۵ء میں سوویٹ حکومت نے ایران کے شمال مغربی سرحدی صوبہ آذربائیجان (جس کی سرحدیں روسی آذربائیجان سے ملتی ہیں) میں کمیونسٹ حکومت قائم کر دی۔ اور کردوں کی خودمختاری کی بھی حمایت کی اس وقت سوویٹ دوسیں امریکی و برطانوی اتحادیوں کے ساتھ ایک معاہدے کے تحت ایران میں گزشتہ چار

---

[1] نیا سامراج، ص ۱۷۸

toobaa-elibrary.blogspot.com

سال سے موجود تھیں۔ ایک سال بعد جب روسی فوجوں کی واپسی ہوئی تو کمیونسٹ حکومت بھی ختم ہو گئی۔ البتہ لاکھوں ایرانیوں کے دلوں میں ان کمیونسٹ حکمرانوں کی تلخ یادیں محفوظ رہیں۔ روسی فوجوں کا یہ اخلاء (جو امریکی دباؤ کی وجہ سے عمل آیا) ۱۹۴۵ء کے بعد کمیونسٹ تاریخ کا واحد واقعہ ہے جس میں اسکو حکومت کسی ایسے علاقے سے دستبردار ہوئی جہاں کمیونسٹ حکومت قائم ہو چکی ہو۔ چھ سال بعد کمیونسٹوں کے لئے ایک اور موقعہ پیدا ہوا، جب ڈاکٹر مصدق کی انتہا پسند قوم پرست حکومت نے اقتدار سنبھالا۔ ڈاکٹر مصدق تیل کی صنعت کو قومی ملکیت میں لینے کے مسئلے پر مغربی ملکوں سے بالعموم اور برطانیہ سے بالخصوص بُری طرح اُلجھ گئے۔ اور آویزش و تصادم کی صورت پیدا ہو گئی۔ لیکن ڈاکٹر مصدق اور ایرانی کمیونسٹوں (تودہ پارٹی) کو ایک دوسرے پر اعتماد نہیں تھا۔ لہٰذا ان میں کوئی اشتراک واتحاد نہ ہو سکا۔ اگست ۱۹۵۳ء میں ڈاکٹر مصدق معزول ہوئے تو کمیونسٹ رشہ ہنشاہ ایران کو قتل کرنے کی ناکام کوشش کے بعد ۱۹۴۹ء میں کمیونسٹوں پر پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں لیکن ۱۹۵۲ء کے خاتمے میں وہ دوبارہ اُبھر آئے تھے) ایک بار پھر زیرِ زمین جانے پر مجبور ہو گئے۔ اس طرح ۱۹۴۰ء کے چھٹے عشرے کے آخری برسوں میں معاندانہ سوویت پروپیگنڈا اور زیرِ زمین کمیونسٹوں کی سرگرمیوں میں ایک بار پھر شدت آ گئی۔ اور نہ صرف مغربی ملکوں کے خلاف قوم پرستانہ جذبات تیز آمرانہ حکومت اور معاشرتی ناانصافیوں کے خلاف مایوسی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی۔ بلکہ پرانی دشمنیوں اور دیرینہ عقیدے کو یقین دلانے کی بھی سعی کی گئی۔ کہ ان کے تمام مصائب و آلام کی وجہ امریکہ ہے۔ اور اگر ایران غیر جانب دار ہو جائے تو حالات سدھر سکتے ہیں۔ ایران کے بارے میں سوویٹ پالیسی کا مقصد چنداں ناقابلِ فہم نہیں بظاہر مقصد فقط یہ تھا کہ پہلے ایران کو مغرب سے الگ کیا جائے اس کے بعد غیر جانب دار ایران کو سوویٹ یونین کی نوآبادی بنا دیا جائے تاکہ سوویٹ یونین کو خشکی کا راستہ صرف خلیج فارس بلکہ دنیائے عرب اور افریقہ تک بے لیے طریقہ رسائی حاصل ہو جائے۔ بہرکیف ۱۹۲۰ء کے بعد کے برسوں میں جب مصر اور دوسرے عرب ملکوں میں سوویٹ اثر و نفوذ غیر معمولی طور پر بڑھ گیا تو اسکو حکومت کے نزدیک ایران کی زیادہ اہمیت نہ رہی۔ سوویٹ یونین نے ایران پر اپنا دباؤ کم کر دیا۔ اور دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات درست ہو گئے۔ بلکہ وہ دونوں ملک وقتاً فوقتاً سرکاری طور پر خیر سگالی کا اظہار بھی کرنے لگے۔ اس وقت سوویٹ یونین کا خیال تھا کہ عرب ملکوں پر زیادہ توجہ دی جائے کیونکہ اگر عرب ملکوں کو سوویٹ یونین کی نوآبادی بنا لیا گیا تو پھر ایران کو زیر کیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۷۱ء میں سوویٹ یونین کے بھارت اور عراق کے ساتھ جنگی معاہدہ اور پھر سوویٹ یونین کی

زیرِ سرپرستی مشرقی پاکستان پر بھارتی قبضے کے بعد کائناتِ ارضی کے اس خطے میں کمیونسٹوں کی سرگرمیاں پھر تیز ہو گئیں۔ اور انہوں نے بلوچستان جس میں ایرانی بلوچستان بھی شامل ہے کا شوشہ چھوڑنے کے ساتھ ساتھ خشکی کے راستے بحرِ ہند تک پہنچنے کے لئے ایک بار پھر ایران پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔[1]

بعد کے برسوں میں کمیونسٹ پروپیگنڈے کے زیرِ اثر امریکہ کے خلاف نفرت و عداوت انتہا پر پہنچ گئی۔ شاہ کو امریکی مفادات کا نقیب اور اس کا ایجنٹ قرار دے دیا گیا پورے ملک میں اس کے خلاف ایک وسیع اور منظم تحریک چلی جس نے بالآخر شاہ کو سبکدوش اور جلاوطن ہونے پر مجبور کیا۔

بلاشبہ امریکہ ایک سامراجی قوت ہے۔ اور ہر دوسرے سامراج کی طرح استحصال اس کی فطرت میں بھی داخل ہے۔ لیکن امریکہ اور ایران کے باہمی تعلقات میں امریکہ نے ایران کا کتنا استحصال کیا اور ایران کو امریکہ دوستی میں کیا کچھ ملا، یہ ایک تفصیل طلب موضوع ہے جس میں کسی ایک جانب کو ترجیح دینے کے لئے کافی شواہد کی ضرورت ہے۔ تاہم ایک سرسری جائزے میں سب سے اول اور اہم حقیقت، جو ایرانیات پر معروضی سے غور کرنے والے کو بہت بڑی حد تک متاثر کرتی ہے وہ مغربی ثقافت کا ایران کا فی الوقت خطرناک حد تک وقوع ہے۔ وہ ایک ایسے انڈے کی زد میں پڑا ہے جو بڑا اپنی گندگی کا دائرہ پھیلاتا جا رہا ہے۔ درآنحالیکہ کوئی ضابطے یا قانون کا پابند نہیں ہے۔ مشرقی دنیا کو اپنا جزو بدن بنانے کے لئے اپنے فرہبی مشرقی پڑوسیوں کو ہڑپ لینا صرف اس کی چھیڑی آرزو ہے بلکہ استعماری عزائم کی تکمیل کے لئے اس کی بہت ناگزیر ضرورت بھی ہے۔ ایران، افغانستان اور پاکستان اس کے مشرقی سرحدوں واقع وہ سلطنتیں ہیں جو ہمیشہ سے اس کی آنکھوں میں کھٹکتی رہی ہیں۔ یہ علاقے نہ صرف اپنے قدرتی خزانوں کی بدولت اسپ ہی مطلوب ہیں بلکہ تیل کے بے پناہ ذخائر سے مالا مال شرقِ اوسط میں داخل ہونے کے دروازے کی حیثیت سے بھی روس کے لئے بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔ ان علاقوں کو کم از کم اپنے اثر میں رکھنے کے لئے مختلف منصوبوں پر مختلف شکلوں میں مدت سے کام ہو رہا ہے۔ ایران کے سابق حکمرانوں نے انہی سازشوں کے سدِ باب کی خاطر امریکہ سے گٹھ جوڑ کا راستہ اختیار کیا تھا انہوں نے ایران کے حق میں امریکہ کی ہمدردی استحصال کو روس کے کلی استحصال پر ترجیح دی تھی اور آثار و قرائن سے معلوم ہو رہا ہے کہ یہ

---

[1] ماہنامہ ترجمان ص ۱۸۸-۱۸۰

toobaa-elibrary.blogspot.com

تشریح صحیح نہیں تھی۔ شاہ کے بعد ایران میں امریکی اثرات مٹانے کے لئے مذہبی انقلابی حکومت جو کچھ کر رہی ہے یہ اس کا اپنا داخلی مسئلہ ہے جس میں کچھ کہنے کی گنجائش نہیں۔ لیکن امریکہ اور سامراد دشمنی میں اس قدر غلو اور تجاوز کو اسلامی آداب تک کا پاس و لحاظ نہ کیا جائے۔ نہ صرف یہ اسلامی انقلاب کے علمبرداروں کو زیب نہیں دیتا بلکہ کسی اچھے انجام کی نشان دہی بھی نہیں کرتا۔ امریکہ نے ایران کو سو فوجی قوت بنانے میں خاصا کام کیا وہ جنوبی ایشیا میں روس کے پھیلتے ہوئے اثر و نفوذ کو روکنے کی غرض سے ایران کو زیادہ سے زیادہ مضبوط دیکھنا چاہتا تھا۔ امریکہ سے قطع تعلق کرنے کے بعد روس کو ایران میں در آنے کے کافی مواقع ہاتھ آئے ہیں نہ جانے انقلابی حکومت نے اس شکل کا کونسا مادی یا روحانی حل تلاش کر رہا ہے۔ خدا کرے ایران حقیقی معنوں میں اسلام کا گہوارہ بنے اور دوسرے ایشیائی ممالک کے استحکام و تقویت کا ذریعہ ثابت ہو۔

روس اور افغانستان

۱۹۱۹ء میں سٹالن نے کہا تھا کہ

"ہمیں یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ ترکستان کی جغرافیائی حیثیت نے ترکستان کو ایک ایسے پُل کی شکل دے رکھی ہے جو سوشلسٹ روس کو مشرق کے غلام ممالک سے ملاتا ہے لہٰذا ترکستان میں سوویٹ نظام کا قیام اور استقرار مشرق کے اندر انقلابات کو وسعت پذیر رکھنے کے سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مشرق کے اندر سوویٹ نظام کا قلعہ تعمیر کیا جائے اور تازان، اوفا، سمرقند اور تاشقند کے اندر سوشلزم کا لائٹ ہاؤس نصب کیا جائے۔ تاکہ مشرق کی تھکی ماندی اقوام کے سامنے آزادی کی راہیں روشن کرے"[1]

ترکستان کی اس حیثیت اور اہمیت کے پیش نظر روس نے اس کو حاصل کرنے کے لئے بے شمار خون ریز جنگیں لڑیں۔ ترکستان کو مسخر کرنے کے بعد تقریباً یہی حیثیت افغانستان کی طرف منتقل ہو گئی۔ چنانچہ یہ پسماندہ علاقہ کئی سالوں سے روس کی ہوسناک نگاہوں کا مرکز بنا رہا۔ امان اللہ خان کی وساطت سے افغانستان

---

[1] کلیات سٹالن جلد ۵، اسکو ۱۹۴۷ء، جلد ۵ ص ۲۳۸ - ۲۳۹

میں داخل ہونے کا راستہ بہت جلد ہی مسدود ہو گیا۔ نام نہاد ترقی کے شیدائی اس روس نواز حکمران کو بہت جلد ہی ملک بدر ہونا پڑا۔ اس کے بعد حبیب اللہ خان بچہ سقہ کابل کے تخت پر قابض ہوا۔ نادر خان نے اس کے خلاف افغانستان کی مشرقی سرحدوں سے علم آزادی و حریت قبائل کی حمایت و مدد حاصل کی اور بچہ سقہ سے حکومت لینے میں کامیاب ہو گیا۔ امان اللہ خان کے بعد روس کو کسی مسلمان ملک، افغانستان کے سلسلے میں بڑے بے تابانہ منصوبہ بندی کرنے کی ضرورت نہ پڑی تاآنکہ داؤد خان برسر اقتدار آیا اور اس کے بعد اس کا چچا محمد ظاہر شاہ تخت حکومت کا مالک بن گیا۔ بلاشبہ وہ ایک مذہبی اور متدین شخصیت کا حامل تھا لیکن روس کی دور رس سیاست کے دائرہ سے باہر نکلنے کی صلاحیت سے عاری تھا۔ وہ خود تو بہت کم لیکن اس کے ارمان پسند دولت روسی ڈپلومسی کا بری طرح شکار ہوئے۔ کئی علاقائی معاہدات اور اس کے ضمن میں ثقافتی کارندوں کی افغانستان میں آمد شروع ہو گئی۔ اقتصادیات اور ٹیکنالوجی کے لئے روسی معلمین درآمد کی گئیں۔ اور افغان نوجوانوں کو روس کے بڑے بڑے شہروں میں بھیجا جانے لگا جلد ہی اس کا نتیجہ اولاً خلق بغاوت اور پھر سیاسی انقلاب کی صورت میں رونما ہوا۔ تعلیمی اداروں اور مراکز تربیت میں پڑھنے والے طلبہ روسی ایجنٹوں سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے اور یہی متاثرین دوسرے نوجوانوں میں بھی سوشلزم کے داعی افکار کو منتقل کرنے کا ذریعہ بنے۔ عوامی جمہوریت اور ملکی ترقی کے نام پر کئی سیاسی جماعتیں وجود میں آئیں۔ اور ملک کے طول و عرض میں ایک ہنگامہ برپا ہونے والا دینی اور سیاسی اضطراب پیدا ہوا۔

خلق، پرچم، شعلۂ جاوید، اخوان ملت، مساوات، اور شہباب اسلامی اس دور کی سرگرم عمل سیاسی جماعتیں تھیں۔ اول الذکر دونوں پارٹیوں کا تعلق روس سے تھا۔ خلق اولاً عبدالرؤف بینوا کے نام سے موسوم تھی اور انگاروں کا ایک ماہنامہ شائع ہوا کرتا تھا۔ سردار داؤد کے ظاہر شاہ کے دور میں وزیر اعظم بن جانے کے بعد اس نے پہلا نام تبدیل کر کے خلق کا نیا نام اختیار کیا۔

۱۹۶۷ء میں افغانستان کے چند سینئر ممبران مثلاً غلام محمد غبار و دستگیری پنجشیری ببرک کارمل۔ عبدالعزیز شرعی جوزجانی۔ ڈاکٹر نجیب اللہ۔ سلیمان لائق ڈاکٹر ظفر اللہ آفتاب، اکبر بے اور محمود ترکی کے زیر قیادت خلق میں کام کر رہے تھے۔ ازاں بعد ببرک کارمل نے میر اکبر خیبر۔ شرعی جوزجانی و دستگیر پنجشیری اور کئی دوسرے رفقا کے ساتھ خلق سے علیحدگی اختیار کی۔ اور پرچم کے نام سے ایک الگ جماعت اور اسی نام سے ایک ہفت روزہ کا اجراء کیا۔ ڈاکٹر فیضان، انا ہتیا۔ نور احمد نور بارق شفیعی اور سلیمان لائق بھی اس

toobaa-elibrary.blogspot.com

جماعت کے مرکزی ارکان میں منسوب ہوتے تھے۔ کچھ مدت کے بعد بارق شفیعی اور سلیمان لائق دوبارہ خلق میں چلے گئے۔ خلق میں اندرونی طور پر بھی کافی اختلافات موجود تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مختلف لیڈروں کے حامی مختلف گروپوں سے یاد کیے جاتے تھے۔ مثلاً زرغون گروپ، ترکئی گروپ۔ ان گروپ وغیرہ کچھ عرصے کے بعد خلق اور پرچم میں دوبارہ اتحاد ہو گیا اور دونوں نے وزارت مطبع سے سبکدوش ہونے کے بعد سردار داؤد کی بھرپور مدد کی۔ چنانچہ انہی کی حمایت و معاونت سے وہ افغانستان کا تخت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔[1]

شعلہ جاوید بھی نظریاتی اعتبار سے کمیونزم کی علمبردار تھی اس کا تعلق چین سے بتایا جاتا ہے۔ ظاہر شاہ کے دور حکومت میں یہ گروہ اکرم یاری اور صادق علی کی سرپرستی میں کام کر رہا تھا۔ رحیم محمودی کی ادارت میں شعلہ جاوید ہی کے نام سے ان کا ایک رسالہ نکلا کرتا تھا۔ اس پارٹی کا ایک نہایت سرگرم رکن عثمان لنڈے تھا۔ یہ جماعت بھی مالآخر کئی دھڑوں میں بٹ گئی اور سردار داؤد کی آمد کے بعد تو تقریباً تقریباً ختم ہو گئی۔

افغان ملت۔ قندن قوم پرستوں کی جماعت تھی۔ اس کا قائد علامہ محمد فرہاد تھا جو سدوزئی افغانی تھا۔ یہ لوگ جرمنی میں تعلیم کر رہے تھے۔ یہ لوگ پختونستان سے زیادہ عملی ملک سے طلب گار تھے۔ پاکستان نیشنل عوامی پارٹی اور افغانستان کی اس جماعت کے نظریات و مقاصد میں کافی حد تک مماثلت پائی جاتی تھی۔ رفیع اللہ رفیع۔ یوسف میرزا آنی اور قدرت اللہ قندی اس گروہ کے اہم ارکان تھے۔ یوسف میرزا نے "شعلہ سیکھو" کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی جس میں اسلام کے مقابلے میں قومیت کی برتری اور اولیت ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کا فرمان ہے کہ اسلام نہیں بلکہ فلسفہ اور علم ہی تحاد کی بنیاد بن سکتے ہیں اگر اسلام نے عوام کو لوگوں کو کٹھا اور مجتمع کر بھی لیا تو ایران، افغانستان اور پاکستان ایک ہو جاتے۔[2]

مساوات۔ محمد ہاشم میوندوال کی سیاسی جماعت تھی۔ یہ شخص ظاہر شاہی دور میں ایک دفعہ وزیر اعظم بھی رہ چکا تھا۔ ظاہر شاہ کے آخری وزیر اعظم محمد موسیٰ شفیق ان کو گرفتار کرنا چاہتا تھا۔ اسی لئے میں تھا کہ داؤدی انقلاب آ گیا۔ ان دنوں شان اور رحیم الہام کی ادارت میں اس جماعت کا ہفت روزہ اخبار بھی مساوات ہی کے نام سے شائع ہوتا تھا۔ پارٹی کا رجحان امریکی کیمپ کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے

---

[1] یعقوب شرافت مقیم مدرسہ نجم الہدایہ سے گفتگو کی طبع مطبوعہ یادداشتیں [2] ایضاً

داؤد نے اپنے دور حکومت کے ابتدائی زمانے میں ہاشم کو گرفتار کیا اور کچھ عرصہ بعد اعلان کیا کہ اس نے جیل ہی میں خودکشی کر لی ہے۔ اس جماعت کے باقی ارکان و کارکن بھی دیگر اہم جماعتوں کے مقابلے میں ۱۹۷۳ء اور اس طرح سے یہ جماعت بھی ختم ہو گئی۔ خالص اسلامی افکار و روایات کی علمبردار تحریک اسلامی کسی تنظیم کے تحت کام نہیں کر رہا تھا ملک کے علماء اور دیندار طبقہ لادینی اثرات کا مقابلہ کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً جمع ہوتے اور غیر منظم انداز سے عوام الناس کی رہنمائی کرتے "گہیہ" منہاج الدین کی ادارت میں نکلنے والا واحد ہفت روزہ تھا جو خالص اسلامی افکار کی اشاعت میں کوشاں رہتا۔ یہ رسالہ تحریک اسلامی کا قریبی ترجمان اور پشتی بان کی حیثیت رکھتا تھا۔ مولوی عبدالرب احدی درگئے، خاتون مولوی محمد یونس خاتص اس جریدے کے جز وقتی معاون اور قلمکار تھے۔ مقامی میونسپل کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے کافی عرصہ تک نالاں و پریشان رہے چنانچہ انہی کی سفارش سے مدیر منہاج الدین کو ۱۹۷۱ء کی ایک رات میں شہید کر دیا گیا۔ چونکہ قاتلوں کی تلاش اور قرار واقعی سزا دینے کے سلسلے میں ظاہر شاہ حکومت نے کوئی دلچسپی ظاہر نہ کی یہی وجہ ہے کہ تحریک اسلامی کے متعلقین ظاہر شاہ کو اس قتل میں ملوث سمجھتے ہیں۔ منہاج الدین کی شہادت کے بعد گہیہ مولوی عبدالرب اور مولوی محمد الیاس خیل کی کوششوں سے بدستور جاری رہا۔ تاآں کہ سردار داؤد نے اس پر پابندی لگا دی۔[1]

اس کے علاوہ کاروان اور ترجمان بھی افغانستان کے جانے پہچانے جریدے تھے۔ اول الذکر عبدالحق دانش کی ادارت میں نکلا کرتا تھا۔ عبدالحق ظاہر شاہی دور میں جاسوسی کے الزام میں کچھ عرصہ تک محبوس بھی رہا۔ یہ شخص روس کے مقابلے میں امریکہ کی طرف مائل بتایا جاتا ہے۔ ثانی الذکر عبدالرحیم ثوین کی سرپرستی اور بشیر ہروی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ عبدالرحیم نوین داؤدی دور حکومت میں وزیر اطلاعات مقرر ہوئے اور کمیونسٹ انقلاب کے بعد جیل میں گئے۔ چونکہ داؤدی انقلاب خلق اور پرچم کی شہ پر کامیاب ہو سکا تھا اس لئے اس حق ملک ادا کرنے کے لئے داؤد نے اپنے دور حکومت میں اول الذکر کو اچھے اچھے عہدے تفویض کئے۔ افغانی کی۔ بالخصوص پرچم کے کئی زعماء مثلاً اختری، فیض محمد وغیرہ کو اچھے اچھے عہدے تفویض کئے۔ خلق افغانستان کا ہفت روزہ ستم کی علمبردار تھی۔ جریدہ خلق کے شمارہ ۱۰۱ مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۹۷۵ء مطابق ۱۳۴۵ھ

---

[1] حوالہ سابق

toobaa-elibrary.blogspot.com

"۱۷ اپریل ۱۹۶۶ء کے بموجب، وہ اشتراکی نظام کا قیام اور سرمایہ داری اور جاگیرداری کا خاتمہ چاہتی ہے۔ ملکیات حکومت کو بلا معاوضہ ہی کی بنیاد پر عوام کی طرف منتقل کرنے کی خواہاں ہے۔ تحریر و تقریر اور ہر قسم کے جلسوں سے پابندی اٹھوانا اس کے ابتدائی مقاصد میں داخل ہے۔ افغانستان کے تمام باشندوں کو مساوی حقوق دلانا بالخصوص عورتوں کی آزادی اور اس سلسلے میں حائد تمام دینی اور معاشرتی پابندیوں کو ختم کرانا بھی خلق مشہور کے اساسات میں سے ہے۔ چنانچہ افغانستان کی مارکسی اور ڈیموکریٹک لوگ آج تک افغانستان کی توسیع خلق کا سب سے اہم اور بڑا سیاسی نصب العین ہے۔ اس پارٹی ان تمام دلفریب مطالبات کا ذمہ موجود ہے جو اشتراکیت طاقت ہو رکھنے میں محمد و معاون ہیں۔ خلق اور پرچم کے ترجمان جریدے الترقی دستیتہ اسلام کے خلاف اور سوشلزم کے حق میں بڑے زور آور قسم کے مضامین بھی شائع کرتے تھے۔ ایک دفعہ تو جریدہ پرچم نے لینن کو خدا کا ہم مرتبہ اور قابل درود و سلام خدا کہا۔ بارق شفیق نے لینن کی توصیف میں یہ شعر کہا ہے:

خلاق باشکوہ و جہاں ساز بیمثال ۔۔۔ ناصر ہزار درود بر آں لینن کبیر

اس گستاخی پر مسلمانوں میں کافی ہل چل مچی۔ اور حکومت کو نظم و نسق برقرار رکھنے کے لئے سخت قسم کے اقدامات کرنے پڑے۔[1]

روسی حکومت ظاہر شاہ کو پختونستان کے مسئلے پر پاکستان سے الجھانے کی ہر ریشہ دوانیاں کرتی رہی لیکن وہ جانور اسلامی ملک سے کسی طور پر بھی الجھنے کے لئے آمادہ نہ ہوا۔ اس سے مایوس ہو کر روس نے سردار داؤد کو آگے لانے کی کامیاب کوشش کی۔ چنانچہ جولائی ۱۹۷۳ء میں ظاہر شاہ کا تختہ الٹ دیا گیا اور سردار داؤد نئے حکمران کی حیثیت سے افغانستان کے تخت پر متمکن ہوئے۔ اس نے اپنی پہلی نشری تقریر میں پاکستان کو دنیا کا وہ واحد ملک قرار دیا جس سے افغانستان کا تنازعہ ہے۔ جس طرح سردار داؤد کی وزارت عظمیٰ کے دور میں پاکستان کے خلاف کابل پروپیگنڈہ تیز ہو گیا تھا۔ ان کے صدر بن جانے کے بعد پاکستان کے مخالف عناصر اور طبقہ پسند پختون ٹولہ کے ارکان پھر سے کابل میں جمع ہونا شروع ہو گئے۔

---

[1] حوالہ سابق

سردار داؤد اور خلق و پرچم کے درمیان تو زیادہ دیر تک نباہ نہ ہو سکا جلد ہی ان کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے۔ تاہم علماء کے پیہم پیہم کی آمادہ عمل اسلامی قوتوں کو ان کے خلاف کھل کر سامنے آنے کا موقعہ نہیں دیا یا۔ جلد سردار داؤد نے آخری دم تک خلق و پرچم کو ہر قسم کا تحفظ حاصل رہا۔ نہ جانے سردار داؤد کو کیا سوجھی روس چند مشرقی ممالک کا دورہ کرنے کے بعد اچانک ہی بدل گئے۔ اور روسی پالیسیوں کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا۔ غالباً اس کی جرأت زیادہ دیر تک کفر کا کار بار برداشت نہ کر سکی۔[1]

۱۸ اپریل ۱۹۷۸ء کی رات کو پرچم کا رہنما میر اکبر خیبر قتل ہوا۔ حفیظ اللہ امین نے پہلے ہی سے افغان فوج میں کام شروع کیا ہوا تھا۔ اور اب تک فوج کے کئی بڑے بڑے افسروں مثلاً ڈگروال عبدالقادر اور جلگرن عبدالعلیم وطن پرست کو اپنا ہم نوا بنا چکا تھا۔ خلق و پرچم کے تمام ارکان اور متاثرین نے شیر کے جنازے میں شرکت کی اور داؤد کو اس قتل کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ ۲۶ اپریل ۱۹۷۸ء کو خلق و پرچم کے اشتہار نے داؤد کو داؤدی حکومت کی جانب سے ان کی گرفتاری کا اعلان ہوا۔ ۲۷ اپریل کو فوج بالخصوص فضائیہ نے داؤدی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔ اور دارالحکومت کابل کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ کہا جاتا ہے کہ بغاوت کی کارروائی میں روسی فضائیہ نے براہ راست حصہ لیا۔ اور اس طرح اپنی روایات کے عین مطابق سوشلزم نے ایک انتہائی خون ریز انقلاب کے ذریعے افغانستان کا تختہ حاصل کیا۔ خلق کے قائد نور محمد ملک کے نئے حکمران بنے اور پورے ملک میں علماء اور دیندار طبقے کو عام دشمنی کے الزام میں گرفتار اور قتل کیا جانے لگا۔[2]

اب افغانستان میں سوشلزم کے عملی نفاذ اور اس کے مخالفین کی سرکوبی کا وقت آ پہنچا تھا۔ چنانچہ سوشلسٹ حکومت نے اس مقصد کے حصول میں بڑی گرمجوشی اور پھرتی دکھانی شروع کی۔ افغانستان کی ۱۹ فیصد مسلمان آبادی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی۔ انہوں نے ایک طرف پاکستان اور ایران کے اسلامی ممالک کی طرف ہجرت کرنی شروع کر دی اور دوسری طرف اسلام کے دفاع میں جہاد فی سبیل اللہ کا آغاز کر دیا۔ ملک کا قریہ قریہ حکومت کے خلاف گوریلا کارروائیوں کا اڈہ اور مجاہدین کا مرکز بن گیا۔ حالات پر قابو پانے کے لئے حکمرانوں نے بھرے اسلام اور مسلمانوں کے حق میں بیانات دینے اور ذرائع ابلاغ کو اسلام کی مدح سرائی اور حکومت کے خلاف سب سے ہتھیار اٹھانے والوں کو سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا ایجنٹ ثابت کرنے کے

---

[1] حوالہ سابق [2] ایضاً

toobaa-elibrary.blogspot.com

سلنے وقف کیا۔ اس پروپیگنڈے کے ساتھ ساتھ لوگوں کے ضمیر و ایمان خریدنے کا سلسلہ جاری رہا۔ دین کے پکے اور غیور افغانوں میں اگرچہ ان کی یہ فریب کاریاں خاطر خواہ نتائج نہ پیدا کر سکیں تاہم مطلقاً بے اثر بھی نہ رہیں۔ ترکئی حکومت افغانیوں کا اعتماد حاصل کرنے میں بُری طرح ناکام ہو رہی تھی اور مجاہدین کا جوش جہاد روز افزوں بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ خود برسرِ اقتدار گروہ کے اندر بھی ناقابلِ مفاہمت پھوٹ پڑ چکی تھی اور اس کے ارکان ایک دوسرے سے بدظن ہو چکے تھے۔ انہیں حالات کا بہانہ کے ایک وزیر حفیظ اللہ امین نے ایک خون ریز جھڑپ میں نور محمد ترکئی کو قتل کر دیا اور ملک کے تمام تر اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ ترکئی کیوں قتل ہوا؟ اس کی اصل وجہ تا ہنوز معلوم نہیں ہو سکی۔ اب حکومت نے مجاہدین کے خلاف کارروائیاں تیز تر کر دی ہیں۔ باوجود ہر قسم کی امداد کے مقامی حکومت اس ہمہ گیر بغاوت پر قابو پانے سے عاجز و درماندہ دکھائی دے رہی ہے۔ لہٰذا روس نے براہِ راست مداخلت شروع کر دی ہے۔ بغاوت کچلنے کے سلسلے میں افغان فوج بے بس اور کمزور ہونے کے ساتھ ساتھ روس کی نگاہوں میں مشکوک بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر اہم مقام پر روسی اہل کار تعینات ہیں۔ اور تمام حاکمانہ اختیارات روسی مشیروں کے ہاتھ میں ہیں۔

افغانستان کے مسلمان بڑی بے سروسامانی سے اس عظیم سامراج کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ انسانیت کی بہی خواہ اور امن و آشتی کا مدعی روس موسیٰ کو جبر کی طرح ان کے گلے کاٹ رہا ہے۔ اور پانی کی طرح ان کا خون بہا رہا ہے۔ لیکن دنیا کی کوئی طاقت ان مظلوموں کی آہ و بقا سننے کے لئے تیار نہیں جس کو بھی اس طرف متوجہ کیا ان کی جائز امداد کرنے سے ہچکچاتا نظر آیا۔ نہ جانے کب تک ظلم و ستم کا یہ سلسلہ جاری رہے گا اور انجام کار اس دھرتی کے مسلمانوں کا کیا بنے گا؟

پاکستان ـــــ سوشلزم کا راہ گزر!

پاکستان دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت اور یہ دنیا کا واحد ملک تھا جو اسلام کے نام پر معرضِ وجود میں آیا۔ سوویٹ لیڈر پاکستان کی تشکیل ہی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اور انہیں یہ خدشہ تھا کہ یہ نئی اسلامی مملکت وسطی ایشیا کی محکوم اقوام میں بیداری و آزادی کی کسی تحریک کے لئے تقویت کا موجب بن سکتی ہے۔ علاوہ ازیں پاکستان روس کے توسیع پسندانہ عزائم کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ اس لئے اس کا مستقل وجود روس کو بڑا شاق اور ناگوار گذر رہا ہے۔

مشرقِ وسطیٰ میں روس کی دلچسپی کا آغاز پیٹر دی گریٹ کے زمانے میں ہی ہو گیا تھا۔ زار پیٹر نے اپنا خاص ایلچی ایران بھیجا تھا۔ اس ایلچی کا مشن تھا کہ ایران اور خلیج فارس کے علاقے میں روس کے لئے خاص مراعات حاصل کی جائیں۔ یہ مشن کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکا۔ اور اس کے بعد روسی حکمران داخلی مسائل میں الجھنے کی وجہ سے اس طرف توجہ نہ دے سکے۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران بحرِ ہند اور خلیج فارس کے علاقوں میں روس کی دلچسپی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ چنانچہ روس پر جرمنوں کے حملے سے ایک سال پیشتر برلن میں ہٹلر اور مالوٹوف کے مابین ایک کانفرنس ہوئی جس میں جرمن آمر نے مستقبل کے سوویٹ حلقہ اثر و نفوذ کے تعین کے ضمن میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ ماسکو اپنی توجہ کا مرکز و محور بحرِ ہند کے علاقوں کو بنائے۔ ماسکو کے حکمرانوں نے اس تجویز کو "دور کے ڈھول" اور "ہوائی قلعہ" سے تعبیر کرتے ہوئے یہ جوابی تجویز پیش کی۔ کہ وہ آبنائے باسفورس میں فوجی اور بحری اڈہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اور اپنا حلقہ اثر باکو سے جنوب کی جانب خلیج فارس کی طرف بڑھانا چاہتا ہے۔ جرمنوں نے یہ تجویز مسترد کر دی لیکن ان "نازی سوویٹ مذاکرات" سے ایران، ترکیہ اور آبنائے باسفورس میں روس کی روایتی دلچسپی کا بخوبی پتہ چل جاتا ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے جو عزائم پیٹر دی گریٹ کے بعد سوئے ہوئے تھے وہ موقع ملنے پر کس طرح بیدار ہو گئے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد سٹالن نے مشرقِ وسطیٰ کی جانب توسیع کا خیال وقتی طور پر ذہن سے نکال دیا کیونکہ انگلستان امریکی حمایت کے ہوتے ہوئے یہ جسارت نہیں کر سکتا تھا۔[1]

اس کے بعد سوویٹ یونین کے سامنے صرف بحیرہ روم کے مشرقی کی جانب اثر و نفوذ کی توسیع کا راستہ رہ گیا چنانچہ اس نے تین سابق اطالوی نوآبادیات ـــ سمال انا طولیہ کے قریب تین جزائر۔ لیبیا کا کچھ حصہ اور اریٹیریا میں تو لتی طاقت بننے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ حکومت نے دوسری جنگِ عظیم کے بعد مالِ غنیمت کے طور پر اطالوی بحیرہ کا ایک انتہائی حصہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بحیرہ روم میں اپنا بحری بیڑہ رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ سب کوششیں رائیگاں گئیں۔ جنگ نے برطانیہ کو اتنا کمزور اور مفلوج کر دیا تھا چنانچہ برطانوی حکومت کی یہ کوشش تھی کہ امریکہ بحیرہ روم کے علاقے میں آ جائے

---

[1] پاکستان اور عالمی امن، ص ۲۲۳

toobaa-elibrary.blogspot.com

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امریکہ بحیرہ روم کی ایک طاقت بن کر ابھرا۔ اور یونان و ترکیہ مغربی دفاعی تقاضوں میں شریک ہو کر امریکہ کے تحفظ میں آ گئے۔ سٹالن بحیرہ اسود میں سمٹنے پر مجبور ہو گیا۔ اور اس کے جانشینوں نے ترکیہ کے بعض علاقوں پر اپنا سابقہ دعویٰ اور فوجی اڈوں کے لئے جگہ کا مطالبہ بھی واپس لے لیا۔[1]

سٹالن کے جانشینوں کو اپنے پیش رو کے مقابلے میں زیادہ مشکل صورت حال کا سامنا تھا ان کے مغرب میں "نیٹو" (معاہدہ شمالی اوقیانوس) کی دیوار ابھر آئی تھی جو یورپ کی جانب ان کی توسیع میں حزام تھی۔ جنوب میں معاہدہ بغداد کی جگہ "سنٹو" کی تنظیم معرض وجود میں آ چکی تھی۔ نیٹو کو ایٹمی تحفظ بھی حاصل تھا۔ لہٰذا سوویٹ حکمرانوں نے اگرچہ اس کے مقابلے میں اپنی یورپی نوآبادیات کو اسلحہ کے تحفظ سے سرشار کرنے کے لئے "وارسا پیکٹ" کا اہتمام کر لیا تھا۔ لیکن وہ نیٹو کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ بہرکیف وہ "سنٹو" کی زنجیریں توڑنے کے لئے سیاسی اقدامات کرنے کی پوزیشن میں تھے۔ پاکستان سنٹو کا واحد رکن تھا۔ جس کے دو ہمسایوں — بھارت اور افغانستان — کے پیدا کردہ مسائل نے کشمیر رکھا تھا۔ خروشچیف اور بلگانن نے پاکستان کو سنٹو سے نکلنے پر مجبور کرنے کے لئے ان مسائل کو استعمال کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ ان دونوں لیڈروں نے ۱۹۶۰ء میں اپنے دورہ بھارت کے دوران اپنی تقاریر میں نہ صرف کشمیر کے تنازعہ پر پاکستان کی مخالفت کی بلکہ برصغیر کی تقسیم کو بھی "عوامی مفاد" کے منافی اور "سامراج" کی سازش قرار دیا۔ خروشچیف نے تو اپنی سرینگر کی تقریر میں صاف کہہ دیا۔ کہ بلگانن اور وہ پاکستان کی اس لئے مخالفت کر رہے ہیں کہ پاکستان معاہدہ بغداد میں شامل ہے۔ پاکستان نے ان تقاریر کے خلاف احتجاج کیا لیکن اس کے باوجود یہ دونوں سوویٹ لیڈر دہلی سے کابل پہنچے تو انہوں نے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے "پختونستان" کی حمایت کی۔[2] اس جلسہ عام میں افغان وزیراعظم سردار داؤد خان بھی موجود تھے جو بعد میں اقتدار پر قابض ہو گئے تھے۔

پاکستان کو توڑنے اور کمزور کرنے کے لئے روس نے کیا کیا حربے اختیار کئے ہیں اس کا ایک ہلکا سا اندازہ پاکستان کے مشہور شاعر حفیظ جالندھری کے اس انکشاف سے ہوتا ہے جو اگست ۱۹۵۸ء میں لیفٹ ونگ رائٹرز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے روس کا دورہ کرنے کے بعد اس نے کیا۔ سیارہ ڈائجسٹ کے شمارہ اپریل

---

[1] ہوا۔ سابق ص ۲۲۴، ۲۲۵ [2] ایضاً

۱۹۶۲ء میں اس کے دورۂ روس کا وہ حصہ شائع ہوا ہے جس میں اس نے خروشچیف سے ملاقات کی۔ حفیظ کا بیان ہے کہ

"کامریڈ خروشچیف مجھ سے کہنے لگے — میں جانتا ہوں کہ آپ پاکستان کے بہت بڑے شاعر ہیں اور آپ کو شاعر اسلام کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ یہ نہ سمجھئے کہ حکومت پاکستان نے آپ کو منتخب کر کے بھیجا ہے۔ میں حیران تھا کہ اب مجھ سے کیا توقع کی جا رہی ہے۔ فرمانے لگے۔ پاکستان کا تعلق سارے اسلامی ملکوں سے ہے۔ امریکہ اور برطانیہ ان کے درمیان تفرقہ ڈالنے کی سازشوں میں مصروف ہیں۔ آپ شاعر ہیں اس لئے آپ کو چاہئے کہ زیادہ تر افغانستان کے ساتھ دوستی قائم کرنے کی سعی کریں۔ اس سے افغانستان مضبوط ہوگا۔ اور ساتھ ہی اس کا اثر ایران اور ترکی پر بھی پڑے گا اور ان سب کا اثر آپ پر (پاکستان) اور ایران پر بھی پڑے گا۔ آپ لوگوں کو ہندوستان سے اپنے جھگڑے ختم کر دینے چاہئیں۔

میں نے کہا — جناب جھگڑا پاکستان نہیں، ہندوستان کر رہا ہے۔ ہم تو پہلے ہی سے فرینڈلی سیٹلمنٹ قرارداد پر چل رہے ہیں۔ کہنے لگے — ٹھیک ہے لیکن روس چاہتا ہے کہ آپ کی مدد کی جائے اور وہ اس طرح کہ دریائے چناب جہاں سے نکلتا ہے اور جن پہاڑوں سے گزرتا ہوا مغربی پاکستان میں داخل ہوتا ہے اور پھر پنجاب اور سندھ سے ہوتا ہوا سمندر میں جا گرتا ہے یہاں تک کا سارا علاقہ پاکستان کو افغانستان کے حوالے کر دینا چاہئے خواہ اس کا نام پختونستان رکھا جائے یا افغانستان یا کچھ اور — اس طرح آپ لوگ قوی ہو جائیں گے۔

میں نے پوچھا — اور باقی

جواب ملا — بھارت کے سپرد کر دینا چاہئے۔ وہاں سوویٹ بنائے جائیں گے۔ راجپوتانے کے بھی تین سوویٹ زبانوں کے اختلاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے بنائے جائیں۔ سندھ کو بمبئی سے ملا دیا جائے۔

باقی رہا کشمیر — وہ تو بھارت کو مل ہی چکا ہے۔

میں نے پوچھا —

کامریڈ اس سلسلے میں مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔

کہنے لگے۔

آپ ادب کے لیڈر ہیں آپ کو ایک دنیا سنتی ہے آپ ثقافتی سربراہی قبول کریں اور پاکستان

toobaa-elibrary.blogspot.com

جسے انگریزوں نے روس کے خلاف لکیر کھینچ کر بنایا ہے۔ انگریزوں اور امریکیوں کو شکست دینے میں ہماری مدد کرے۔ اور خود افغانستان سے مل کر اپنی طاقت میں اضافہ کرے۔

آپ کی ڈسپوزل پر تیس لاکھ روپیہ رکھ دیا جائے گا۔ نیفن صاحب اور دوسرے جو وہاں کام کرنے کے لئے متعین کئے جائیں گے ان کی نگرانی آپ کریں گے۔ ہمیں معلوم ہے کہ آپ دوسری جنگ عظیم میں ڈائرکٹر سائنٹیفک سیکشن کی حیثیت سے پورے ہندوستان پر حاوی رہے ہیں لیکن وہ مدد انگریزوں کے لئے تھی جو آپ کو کھا جانا چاہتے تھے۔ ہم تو آپ کی عزت بڑھانا چاہتے ہیں

میں ہکا بکا ان کا منہ تک رہا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹہ گذر گیا۔ لیمرڈ کوئی اور کام تھا اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا — کل آپ کریملن کی سیر کریں اور ہمارے اس منصوبے پر بھی غور فرمالیں[1]

سباہو کے اس لمبے اقتباس سے صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ پاکستان کے اندرونی انتشار و خلفشار اور نظریاتی عدم استقرار پیدا کرنے کے لئے روسی حکمران جب حفیظ جیسے پاکستانی کو بھی استعمال کرنے کی فکر میں ہیں تو ان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ان لاتعداد ایجنٹوں کو کس کس انداز سے استعمال کیا جا چکا اور کیا جا رہا ہوگا جو ملک و ملت فروشی کو ننگ و عار نہیں بلکہ سیاست کا کمال سمجھتے ہیں۔

۱۹۶۰ء کی پاک چین دوستی کے بعد سوویٹ لیڈر یہ بھی سر پیٹنے لگے کہ اس دوستی کا دسلی ایشیا کی مسلم اقوام پر ناگوار اثر پڑ سکتا ہے۔ اور ان کی توجہ کا مرکز سوویٹ یونین کی بجائے چین بن سکتا ہے۔ اس سے پہلے سوویٹ لیڈروں نے بھارت کے ساتھ تو گہرے دوستانہ روابط استوار کئے تھے لیکن پاکستان کو وہ ہمیشہ حقارت کی نظروں سے دیکھتے رہے۔ ان کے نزدیک پاکستان برطانوی استعماریت کی اختراع اور امریکہ کی نوآبادی تھا چین اور بھارت کے مابین جب اختلافات رونما ہوتے اور باہمی کشیدگی ۱۹۶۲ء میں زبردست سرحدی جنگ کی صورت اختیار کر گئی اور اس سرحدی جنگ میں پاکستان غیر جانب دار رہا تو سوویٹ لیڈروں کا رویہ بھی قدرے بدل ہو گیا اور ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں سوویٹ حکومت نے مصالحت کنندہ کا کردار سرانجام دیا[2]

بھارتی حکمرانوں کے نزدیک اب روسی پالیسی پہلے کی طرح بھارت کے زیادہ موافق نہیں تھی۔ پہلے سوویٹ زعماء بھارت کے بہت قریب تھے وہ سلامتی کونسل میں مسئلہ کشمیر پر اپنا حق تنسیخ (ویٹو) استعمال کر کے بھارت

---

[1] سباہو ڈائجسٹ شمارہ اپریل ۱۹۷۲ء [2] نیا سامراج ص ۱۹۴ ۱۹۵

کے موقف کو تقویت پہنچاتے تھے۔ اب ان کی نظروں میں پاکستان اور بھارت یکساں تھے۔ لیکن یہ صورت حال زیادہ دیر جاری نہ رہ سکی۔ مسز اندرا گاندھی وزیر اعظم بننے کے کچھ عرصہ بعد بھارتی حکمران اپنے بیانات میں سوویٹ یونین کی بڑی فراخدلی سے تعریف، تشکر اور ممنونیت کا اظہار کرنے لگے تھے اس کے ساتھ ہی ساتھ امریکہ اور اس کے یورپی حلیفوں پر نقد و جرح میں اضافہ ہونے لگا۔ بھارت کو سوویٹ یونین سے جو اقتصادی امداد ملتی تھی وہ امریکہ سے ملنے والی امداد کا عشر عشیر بھی نہیں تھی۔ لیکن جدید ترین اسلحہ کی بہم رسانی میں روس سرفہرست تھا۔ مسز اندرا گاندھی نے روس نواز کمیونسٹ پارٹی کی داخلی حمایت حاصل کرنے کی غرض سے نیز اپنی فوجی طاقت بڑھانے کے لئے روس سے زیادہ اسلحہ ملنے کی امید پر سوویٹ لیڈروں سے محبت کی پینگیں بڑھانی شروع کیں۔ اور ان سب کی توہین کو شعار بنایا جنہیں ماسکو والے پسند نہیں کرتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوویٹ لیڈر بھارت پر پھر مہربان ہو گئے۔ صدر پوڈگورنی اور دوسرے روسی زعماء نے پاکستان کے داخلی و سیاسی مسائل کے بارے میں ایسے بیانات دیئے جو کھلم کھلا مداخلت کی ذیل میں آتے ہیں۔ یہ بیانات بھارت کو مطمئن کرنے کے لئے تھے۔ انہوں نے بھارت کو ہر قسم کی فوجی امداد دی اگست ۱۹۷۱ء میں بھارت اور روس کے درمیان ایک فوجی معاہدہ بھی ہوا اور روس کی ان مہربانیوں اور نوازشوں کی وجہ سے بھارت کو پاکستان کے ایک حصے میں تخریب و سازش کا جال پھیلانے اور پھر عریاں جارحیت کے ذریعے مشرقی پاکستان پر قبضہ کرنے کی شہ ملی۔ پاکستان نے اپنی سرحدوں پر حملے کے ردعمل کے طور پر مغربی سرحدوں پر پیش قدمی شروع کی تو روس نے افغانستان کے راستے اور ہیلی کاپٹروں کے ذریعے چند گھنٹوں میں پشاور تک پہنچ جانے کی دھمکی دی اور رہے سہے پاکستان کی تباہی کا بھی خطرہ پیدا ہو گیا[1]

سوویٹ یونین کے تسبیحی منصوبوں میں پاکستان کو نہاں حیثیت کیوں حاصل ہے؟ اس کی ایک وجہ تو ازیں پیشتر بیان کی جا چکی ہے کہ اسلام کی بنیاد پر معرض وجود میں آنے والا پاکستان کسی وقت بھی دسلی ایشیا کے مسلمانوں کی کسی تحریک آزادی کے لئے باعث تقویت بن سکتا ہے۔ اس کی بعض اور اہم وجوہ حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سوویٹ یونین کے حکمران آبنائے باسفورس اور بحیرہ روم کے ساحل کے ساتھ اپنے بحری اڈے قائم کرنا چاہتے تھے۔ ان کی یہ خواہش اتحادیوں نے پوری نہ کی لیکن عربوں اور اسرائیل کی آویزش کے طفیل وہ اسکندریہ میں اپنا بحری اڈہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب بحیرہ روم میں امریکہ

[1] نیا سامراج

کے مقابلے میں سوویٹ یونین کے جہازوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں سوویٹ یونین مشرق قریب (بالواسطہ مشرق وسطیٰ) میں داخل ہوگیا ہے۔ اور بحیرہ روم کی طاقت کی حیثیت حاصل کرلی ہے اب وہ مشرقی بحیرہ روم کی بجائے مشرق وسطیٰ پر اپنی توجہ دینا چاہتا ہے۔ پاکستان اس راستے میں حائل ملکوں میں سے کمزور ترین ملک ہے۔ چنانچہ وہ اسی کو رام کرکے مقصود تک پہنچنا چاہتا ہے۔

۲۔ سوویٹ یونین نے افغانستان کو حلیف بنانے کے بعد خشکی کے راستے بحر ہند تک رسائی حاصل کرلی ہے پاکستان کے مشرق وسطیٰ سے ملحق شمال مغربی علاقوں (جو کئی سڑکوں کے ذریعے خلیج فارس اور بحر ہند سے منسلک ہیں) میں بالادستی حاصل کرنے کی ساری تیاری کرلی ہے۔ پختونستان کا ڈھونگ جو افغانستان نے ۱۹۴۷ء سے رچایا ہوا ہے اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

۳۔ پاکستان نے چین کے ساتھ قدیم شاہراہ ریشم دوبارہ کھولنے کی غرض سے درہ قراقرم میں ہر موسم میں قابل استعمال سڑک کی تعمیر کی جو شمالی پاکستان کو جنوبی چین سے ملاتی ہے اس طرح چین کو بحر ہند، خلیج فارس، بحیرہ عرب اور مشرق وسطیٰ کے ملکوں تک رسائی کی سہولت حاصل ہوگئی۔ اس پر سوویٹ یونین خفا و برہم ہوگیا۔ اور اپنے لئے اسی نوعیت کی سہولت پر اصرار کرنے لگا۔ چنانچہ سابق صدر ایوب خان کے آخری ایام میں سوویٹ یونین نے پاکستان کو یہ تجویز پیش کی کہ تاشقند و سمرقند (سوویٹ یونین) سے قندھار (افغانستان) تک موجودہ سڑک کو چین کے راستے بحیرہ عرب کی کسی بندرگاہ تک توسیع دینے کی اجازت دی جائے (پاکستان کے مکران کے ساحل پر گوادر، پسنی، جیونی، ارمارہ اور سونمیانی پانچ ایسی بندرگاہیں ہیں جنہیں ترقی دی جاسکتی ہے ان میں سے گوادر سب سے بڑی ہے۔ سوویٹ حکمران گوادر یا پسنی تک سڑک تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ یہ دونوں بندرگاہیں خلیج فارس کے قریب ترین ہونے کی وجہ سے فوجی اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں اور بڑی طاقتوں کی کسی آویزش کی صورت میں بڑی کارآمد ثابت ہوسکتی ہیں۔ پاکستان نے یہ تجویز مسترد کردی۔ اس سے سوویٹ یونین مزید خفا ہوگیا۔ اور پاکستان کے دیرینہ دشمنوں (بھارت اور افغانستان) کی پہلے سے بھی زیادہ سرپرستی کرنے لگا۔ یہ اسی سرپرستی کا نتیجہ تھا کہ بھارت تخریب و سازش اور عریاں جارحیت کے ذریعے مشرقی پاکستان پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

مشرقی پاکستان پر بھارتی قبضہ کے بعد سوویٹ، افغان بھارتی تثلیث نے بلوچستان اور سرحد میں علیحدگی پسند عناصر کو ابھارنا شروع کیا ہے اور مظلم تر بلوچستان اور پختونستان کی تشکیل کی مساعی

تیز تر کردی گئی ہیں۔ بلوچی اور پشتو کی اساس پر ان دو آزاد اور خود مختار مملکتوں کا قیام دراصل اس سوویٹ منصوبے کا حصہ ہے جس میں سوویٹ حکمرانوں نے برصغیر کی پانچ لسانی خطوں میں تقسیم کی تھی۔ لیکن بھارت سے گٹھ جوڑ کے بعد وہ صرف پختونستان اور مظلم تر بلوچستان بپا کرنے کی فکر کرنے لگے ہیں۔

روس، افغانستان اور بھارت دونوں کو پاکستان کی بندر بانٹ پر اکسا رہا ہے اور کوشش کر رہا ہے کہ دونوں مملکتوں میں وہ لوگ اقتدار یا اختیار پر قابض ہو جائیں جو پاکستان دشمنی میں انتہا پسندانہ عزم و روش رکھتے ہوں۔ افغانستان میں داؤد کو اس لئے نیست و نابود کیا گیا کہ وہ روس کے اس مقصد کے روادار اور وفادار نہیں رہے تھے۔ نیز بھارت میں مرارجی ڈیسائی کی قبل از وقت معزولی کی اصل وجہ بھی یہی خیال کی جارہی ہے کہ وہ پاکستان کے بارے میں روسی منصوبوں کی تائید و حمایت سے کتنی کترا رہے تھے افغانستان کی نئی حکومت روس کے اشارے سے اپنی تمام داخلی مشکلات کے لئے پاکستان کو ذمہ دار ٹھہرا رہی ہے۔ اور مختلف حیلوں بہانوں سے تاک میں بیٹھے ہوئے روسی سامراج کے لئے کوئی نہ کوئی جواز جارحیت پیدا کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں اس نے متعدد بار پاکستان کی فضائی حدود کی خلاف ورزی کی ہے اور نہ صرف یہ بلکہ پاکستانی علاقوں کو بمباری کا نشانہ بھی بنایا ہوا ہے۔ گذشتہ دنوں تو اس نے پاکستان کے ایک سفارتی اہل کار متعینہ کابل کو کئی دن تک حبس میں رکھا اور اس سے پاکستان کے خلاف افغانستان میں سیاسی پناہ لینے کا اعلان کرانے کی ناکام کوشش کی گئی۔ تاہم پاکستان غیر معمولی تحمل اور حزم و احتیاط کو اپنائے ہوئے ہے۔ خدا معلوم کب وہ سلگتی ہوئی ایرانی چنگاری بھڑک اٹھے گی جو خرمن کفر کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دے۔

خدایا! ہمیں اپنی مرضیات کی توفیق دے کر اپنی
بے پناہ رحمتوں کا مستحق بنا دے!!!

(کتبہ: محمد عبدالواحد اختر عفی اللہ عنہ)